

Darr Digest April 2018

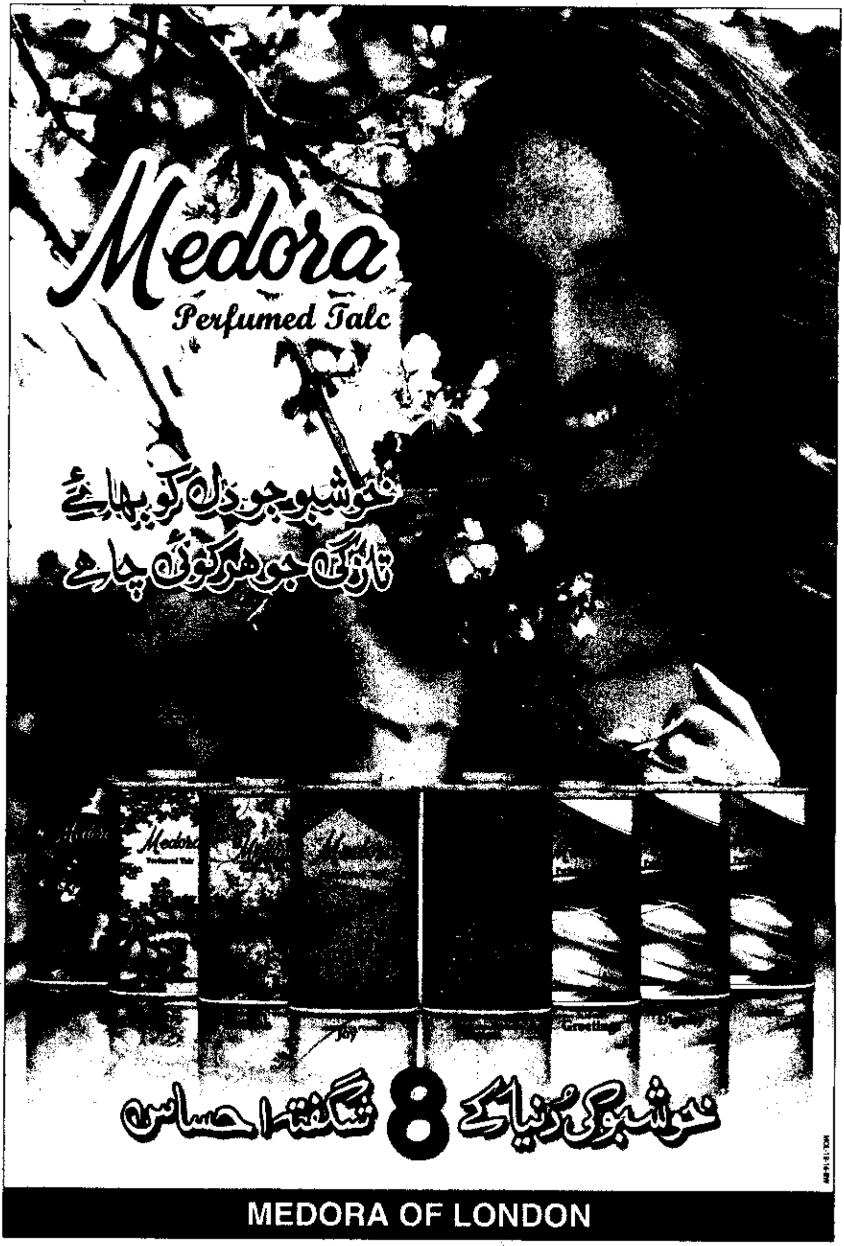
نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تا کہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تا کہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تا کہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تا کہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براؤزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تا کہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مدد گار ثابت ہوگا۔ شُکریہ


Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر

ڈائجسٹ

کراچی

جلد نمبر 19 شمارہ نمبر 7 اپریل 2018ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

قیمت -/70 روپے

سالانہ قیمت -/1200 روپے



ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

قرآن کی باتیں

☆ اور ہاں تم جو خرچ کرو گے تو ان حاجت مندوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔ اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے اور مانگنے سے عار رکھتے ہیں، یہاں تک کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے اور تم قیافے سے ان کو صاف پہچان لو کہ حاجت مند ہیں اور شرم کے سبب لوگوں سے منہ پھوڑ کر اور لپیٹ کر نہیں مانگ سکتے اور تم جو مال خرچ کرو گے کچھ شک نہیں کہ اللہ اس کو جانتا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 273)

☆ اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔ (سورۃ ضحیٰ 93 آیت 10)

☆ اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر اور قائم رہنے والا ہے یعنی ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 36 سے 37)

☆ کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ ہی گواہ کافی ہے وہی اپنے بندوں سے خبردار اور ان کو دیکھنے والا ہے۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 96)

☆ پہلا گھر جو لوگوں کے عبادت کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکے میں ہے بابرکت اور جہان کے لئے موجب ہدایت۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 96)

☆ اور جو لوگ اللہ سے عہد واثق کر کے اس کو توڑ ڈالتے اور جن رشتوں کے جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے ان کو قطع کر دیتے اور ملک میں فساد کرتے ہیں ایسوں پر لعنت ہے اور ان کے لئے گھر بھی برا ہے۔ (سورۃ رعد 13 آیت 25)

☆ اور جو کچھ انہوں نے کیا ان کے اعمال ناموں میں مندرج ہے یعنی ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے۔ (سورۃ قمر 54 آیت 52 سے 53)

☆ جو لوگ تم میں سے اپنی عورتوں کو ماں کہہ دیتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں ان کی مائیں تو وہی ہیں جن کے بطن سے وہ پیدا ہوئے بے شک وہ نامعقول اور جھوٹی بات کہتے ہیں اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ (سورۃ مجادلہ 58 آیت 2)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

مسز سندس اقبال راولپنڈی سے، مارچ ۲۰۱۸ء کا ڈر ڈائجسٹ سامنے ہے اور مکمل پڑھنے کے بعد کچھ الفاظ لکھ رہی ہوں۔ زندگی کی مصروفیات ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں، بچوں کا خیال رکھنا اور شوہر کے ساتھ ساتھ زندگی کے دیگر امور، پھر فرصت کے چند لمحات کے بعد ایک واحد ڈر ڈائجسٹ کا ساتھ۔ یہ سب میری زندگی کا حصہ ہیں۔ سرورق نہایت خوبصورت اور ڈر کے معیار کے عین مطابق تھا لیکن جو کہانیاں ڈر کے رسالے کو ترقی یافتہ ملکی ڈائجسٹ بنانے میں معاون ہوسکتی ہیں وہ جان لیوا، ڈاک بنگلہ، پشمک، بہادر کون، دیوتا نگری تھیں۔ ان رائٹرز نے الفاظ کا جادو بکھیرتے ہوئے کہانی میں جھول نہیں دیا۔ بہت زبردست لکھا ہے۔ ایک مختلف طرز کی کہانی دولو صاحب نے پیش کی اور ہر کہانی میں ان کا انداز بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ حقیقت پر مبنی اپنی تحریر لکھتے ہیں۔ کوان کا منفرد اور زبردست انداز ہے اور دیکھا جائے تو کہانی میں ڈرنے اور ڈرانے والی تمام باتیں یکمشت لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ایس حبیب خان صاحب کی کمی خطوط اور کہانیوں کی فہرست میں محسوس کرتی رہی ورنہ خطوط میں وہ نہ ہوں تو بزم کی رونق ماند سی لگتی ہے۔ اب اجازت دیجئے والسلام۔

☆☆ سندس صاحبہ: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا نوازش نامہ پڑھ کر اچھا لگا، بہرحال یہی زندگی ہے کہ کام اور کام میں مصروف رہنا اور احکام خداوندی کو بجالانا، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے، اور آپ سمیت تمام اہل خانہ کو اور خوشیوں سے نوازے۔ کہانیوں کی پسندیدگی اور آئندہ بھی خط لکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ۔

فلک زاہد لاہور سے، السلام علیکم، بہت دیر بعد حاضری دے رہی ہوں، امید ہے سب خیریت سے ہوں گے، سب سے پہلے تو میں اپنی غیر حاضری کی وجہ بتاتی ہوں کہ اپنے پیارے ڈر سے میری غیر حاضری کی وجہ کوئی مصروفیت نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ میرا آپریشن تھا جو 22 نومبر کو ہوا۔ میرے سینے میں دو گلٹیاں تھیں جن کا اللہ کے فضل سے کامیاب آپریشن ہو چکا ہے اور اب اللہ کے کرم سے میں بہتر ہوں۔ آپریشن کے نام سے تو بڑے بڑے لوگ گھبرا جاتے ہیں، میری عمر تو پھر انیس سال ہے۔ آپ سب بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں میری کیا حالت ہوگئی ہوگی۔ سچ کہوں گی خود پر گزری تو صحیح معنوں میں پتہ چلا کہ "خوف" کسے کہتے ہیں۔ ورنہ اب تک تو میں دوسروں کو ہی ڈراتی تھی۔ وقت کی یہی عادت بہت اچھی ہے اچھا ہوا یا برا گزر ہی جاتا ہے۔ مجھ پر بھی آئی بلا ٹل چکی ہے اور اب انشاء اللہ ڈر میں باقاعدگی سے حاضری دیتی رہوں گی۔ آپریشن کے دنوں میں سارا سارا دن میں بستر پر لیٹی رہتی تھی کیونکہ چلنے پھرنے سے معذور تھی۔ ایسے میں ڈر میرا بہترین ساتھی تھا۔ جس کا باقاعدگی سے مطالعہ کرتی رہی ہوں اور اپنے پیارے پیارے بہن بھائیوں کے محبت نامے بہت حوصلے دیتے تھے۔ ارسال کردہ کہانی میں نے شدید بیماری کی حالت میں بستر پر ہی لکھی ہے۔ لہٰذا کوئی کمی رہ گئی ہو تو درگزر کر دیجئے گا آئندہ اس سے بھی بہترین کہانی لانے کی کوشش کروں گی۔ آخر میں سب بہن بھائیوں کا شکریہ کہنا چاہوں گی جنہوں نے مجھے برابر ہر ماہ اچھے لفظوں میں یاد رکھا۔

☆☆ فلک صاحبہ: ارسال کردہ کہانی مل گئی ہے اس کے لئے شکریہ، آپ کا آپریشن ہوا اس کے لئے ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کلی صحت عطا کرے اور ہمیشہ کے لئے آپ کی زندگی سے دکھ بیماریاں ختم کردے، کہانی آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔ Thanks۔

رابعہ آفرین لاہور سے، ڈر کے تمام اسٹاف بشمول قارئین! السلام علیکم! سب سے پہلے تو میں ڈر ڈائجسٹ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ہر ماہ میری شاعری شائع کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا کہنا تھا کہ ڈر صرف پرانے لوگوں کو جگہ دیتا ہے مگر مجھے یہ پتہ چل گیا ہے کہ یہ رائے غلط ہے۔ آپ سب لوگ جنہیں لگتا ہے کہ ڈر صرف جاننے والوں کو جگہ دیتا ہے، ان سے میری گزارش ہے کہ Look at me میرے خیال میں ڈر ایک وسیع پلیٹ فارم ہے جو معیار کو ترجیح دیتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ڈر پڑھنے والے تمام قارئین خود پر نظر ڈالیں تو ڈر ان کو بہت فرینڈلی لگے گا جو کہ سب کا خیال رکھتا ہے، کیوں کہ میں ایک زندہ مثال ہوں۔ جن لوگوں نے میری شاعری کو پسند کیا، میں ایک بار پھر ان کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ کہتی ہوں۔ ڈائجسٹ ہر ماہ لیتی ہوں مگر فی الحال تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ امتحانات قریب ہیں۔ اس لئے ابھی پڑھا نہیں، بعد میں پڑھ کر تبصرہ ضرور کروں گی، پکا پرامس! اپنا خیال رکھئے گا۔ اللہ حافظ۔

☆☆رابعہ صاحبہ: چلئے حقیقت کا پتا تو آپ کو چل گیا کہ کچھ لوگ خواہ مخواہ ڈر کے متعلق باتیں بناتے ہیں خیر اب آئندہ ماہ ضرور تبصرہ ارسال کیجئے گا۔ شکریہ۔

مسز زینت خان رووات سے۔ السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، امید ہے کہ بخیر ہوں گے۔ اللہ پاک ہم سب کی حفاظت فرمائے اور وطن عزیز پر بری نگاہیں جو کب سے دشمن لگائے بیٹھے ہیں، انہیں منہ کی کھانی پڑے۔ خیر، مارچ کے 'ڈر' نے گو اتنا تاثر نہیں دیا کہ زیادہ کہانیوں پر تبصرے کی نوبت آتی۔ لیکن سرورق نے بہت خوش کیا کہ یہ ادارے کی نیک نیتی سے کی گئی کوشش ہوتی ہے اور محنت بھی۔ سرورق بہت خوبصورت رنگوں کے ساتھ ڈر کی حقیقی عکاسی کررہا ہے۔ بہت خوب۔ اب آتے ہیں کچھ ایسے لکھنے والوں کی جانب جو روز بروز اپنی محنت کے بل پر اپنی تحریر کے گراف میں بہتری پیدا کررہے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ایس امتیاز احمد صاحب ہیں اور پھر اس مرتبہ ناصر محمود فرہاد صاحب ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ دونوں تو رائٹرز ہیں اور دونوں ہی اپنے وسیع مطالعہ کے سبب کہانی لکھتے ہوئے محنت سے کام لیتے ہیں۔ شکیل نیازی صاحب! میرے خیال میں Marvel Studios سے وابستہ Stan Lee کی فلموں سے لی گئی کہانی 'دیوتا نگری' ایک دلچسپ اور اچھی کوشش ہے، ایسی کہانیوں کو لکھنا بھی ایک فن ہے جو آپ کے پاس ہے۔ شہزادو خان صاحب کی کہانی بھی شروع میں بہتر تھی لیکن آگے چلتی ہوئی نامعلوم کہاں نکل گئی۔ نینا خان صاحبہ محنت کررہی ہیں لیکن 'کالو' ایسی ملتی جلتی کہانی ڈر میں ناگ بیٹا کے نام سے شائع ہوچکی ہے۔ 'شیدے کی کرامت' ایک ایسی کہانی ہے جسے ایک علیحدہ نوعیت کی کہانی قرار دیا جاسکتا ہے اور الفاظ کی خاصیت کے اعتبار سے یہ کہانی پورے وطن کو پڑھنی چاہئے۔ ڈائجسٹ کی پہلی کہانی بھی بہتر طرز کی تھی۔ میری نظر میں سب سے زیادہ اچھی کہانی 'جان لیوا' ہے جو پڑھنے والے کی جان لینے پر تلی رہتی ہے، خیر امید ہے کہ احسان الحق صاحب کی صحت بہتر ہوگئی ہوگی۔ آمین، نیک تمنائیں۔

☆☆زینت صاحبہ: میرے خیال سے اب بہت سے رائٹرز نے آپ کی باتوں پر عمل شروع کردیا ہے، اور وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دوسروں کو سنتے ہیں، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام اہل خانہ کو خوشیوں سے نوازے، اور آپ اپنے چاہنے والوں میں خوشیاں بانٹیں۔ شکریہ۔

ایس حبیب خان کراچی سے۔ السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈر کی ٹیم اس کے رائٹرز اور تمام پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ قرآن کی باتیں سے ابتدا کی۔ خطوط کی بزم میں کافی دوستوں کو مس کیا اور جو حاضر تھے ان میں سرفہرست مسز زینت خان اس کے بعد مسز فرحین حامد، احسان الحق، عبدالجبار رومی، ڈاکٹر عامر شہزاد کے تبصرے جامع اور مفصل تھے جنہوں نے تمام لکھنے والوں کی بھرپور انداز میں تعریف واصلاح دونوں کی، میں ڈر کے ایڈیٹر، مسز زینت خان، نینا خان، احسان الحق، شاہد عظیم، میاں یاور حسین اور تمام ان لوگوں کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میری مما کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین) میں مسز زینت کی اس بات سے سو فیصد اتفاق کرتی ہوں کہ "والدین کی خدمت سعادت ہے بلکہ نصیب کی بات ہے۔" میرے نزدیک ماں جو یزداں کی مایہ ناز تخلیق ہے بلاشبہ میری متاع حیات ہے۔ اور میں واقعی خوش قسمت ہوں کہ مجھے اپنی مما کی خدمت کی سعادت نصیب ہے اور میں اس کو سعادت سے بڑھ کر عبادت کا درجہ دیتی ہوں۔ میری دعا ہے کہ میری مما کی ردائے شفقت ہمیشہ میرے سر پر رہے۔ (آمین) اب آتے ہیں مارچ کی تحریروں کی جانب تو جناب ڈر کی ابتدا اور انتہا دونوں ہی بہترین طریقے سے ہوئی۔ اور ہاں رائٹر کے قلم کی خوبصورتی اس کی تحریر سے صاف جھلکتی ہے۔ فلک زاہد اور احسان الحق صاحب کی تحریروں کی کمی محسوس ہورہی ہے۔ احسان الحق صاحب کا شمار ان رائٹرز میں ہوتا ہے جن کے بغیر ڈر ادھورا ادھورا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی تحاریر خاص ترین کے زمرے میں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے تاکہ آپ کے قلم سے نکلتیں لازوال تحریریں آپ کے فینز کی تشنگی دور کریں۔ ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆☆ایس حبیب صاحبہ: نئی ارسال کردہ کہانی اس ماہ شائع نہ ہوسکی اس کے لئے معذرت، آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ والدین سے بڑھ کر دنیا میں اور کچھ نہیں۔ وہ لوگ بدقسمت ہیں جو والدین کی خدمت نہیں کرتے اور والدین کی باتوں کو...... ہم آپ کی مما کی صحت وتندرستی کے لئے دعا گو ہیں۔

خدیجہ فاطمہ اسلام آباد سے۔ السلام علیکم انکل! میرے پیپرز 13 تاریخ سے شروع ہیں اور اپریل کے آخر تک رہیں گے۔

شاید اگلی مرتبہ ڈر میں حاضری نہ دے سکوں کیونکہ رسالہ پیپرز کے بعد پڑھوں گی۔ اس لئے اگلے شمارے میں غیر حاضری پر ابھی سے معذرت خواہ ہوں۔ اس مرتبہ مارچ کے شمارے کا سرورق بہت زبردست تھا اور ادارے کی محنت واضح طور سے جھلک رہی تھی۔ خطوط میں ایس حبیب خان باجی نہ تھیں، چونکہ انہوں نے اپنی امی جان کے متعلق پچھلے خط میں لکھا تھا تو دل سے دعا کی ہے کہ سب خیریت ہو، آمین۔ اس مرتبہ پڑھائی پر دھیان زیادہ رہا تو دو کہانیاں ہی پڑھ سکی ہوں ایک ڈاک بنگلہ اور دوسری جان لیوا۔ بہت زبردست لکھا ہے اور جان لیوا تو ایسی کہانی ہے کہ چھوڑنے کو جی ہی نہیں کرتا۔ باقی آئندہ سہی۔ بہت شکریہ، دعاؤں کی محتاج ہوں، والسلام۔

☆☆ خدیجہ صاحبہ: چلئے آپ کی معذرت قبول کرتے ہیں کہ آپ مئی کے شمارے میں نظر نہیں آئیں گی، لیکن ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی دے اور امتحانات میں اچھے نمبروں سے کامیاب وکامران کرے۔ (آمین)

مسز فرحین حامد رحیم یار خان سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب، مارچ 2018 کا شمارہ زیر تبصرہ ہے۔ سرورق دیکھ کر اندازا ہو گیا کہ ادارہ اس جانب خاص توجہ کے ساتھ محنت کر رہا ہے، سرورق کمال کا تھا بلکہ انتہائی زبردست۔ کہانیوں میں جان لیوا کا نمبر سب سے پہلے ہے کیونکہ یہ سلسلہ وار کہانی روح میں بسنے والی اور قاری کو اپنے ساتھ چلانے والی کہانی ہے۔ اور ویسے ہر اچھی کہانی خود کہتی ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ اب ان شاء اللہ تیسری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ دیگر کہانیوں میں ایس امتیاز احمد، ناصر محمود فرہاد، شکیل نیازی، گلاب خان سولنگی نے بھی انتہائی محنت سے لکھا ہے، البتہ شکیل نیازی صاحب کی کہانی کسی فلم کا خلاصہ تھی، شاید! Thor ٹائپ کی کسی کہانی کا۔ باقی بھی محنت کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ایک دن رائٹرز کی صفوں میں ممتاز نظر آئیں گے۔ اس مرتبہ خطوط میں اپنی فیورٹ رائٹر ایس حبیب خان صاحبہ کی کمی کو محسوس کرتی رہی۔ امید ہے کہ اپنی خیریت سے نوازیں گی، ان کی والدہ کے لئے دعا گو ہوں۔ اس مرتبہ کے لئے اتنا ہی۔ والسلام۔

☆☆ فرحین صاحبہ: آپ کی اور اپنے تمام چاہنے والوں کی خوشی کے لئے ایس حبیب صاحبہ نے اپنی کہانی بھیج دی ہے، جو کہ مئی کے شمارے میں ضرور جلوہ گر ہوگی۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ اور ہاں آئندہ ماہ بھی خط لکھنا مت بھولئے گا۔ Thanks۔

مریم فاطمہ کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ مارچ 2018ء کا ٹائٹل اس بار بہت اچھا تھا۔ خطوط کی محفل میں مسز زینت خان نے میرا بہت حوصلہ بڑھایا بہت بہت شکریہ، ڈر میں لکھنے والے رائٹرز کو ملی ادبی فاؤنڈیشن سے ملنے والے اعزازات پر ڈھیر ساری مبارکباد۔ فروری میں مجھے بھی ملی ادبی فاؤنڈیشن کی طرف سے بہترین ادب تخلیق کرنے پر سند اعزاز سرٹیفکیٹ بذریعہ ڈاک گھر پر مل گیا تھا۔ بے حد خوشی محسوس ہوئی۔ میں تقریب میں شریک تو نہ ہو سکی لیکن پھر بھی ساحل ابڑو صاحب سے فون پر بات ضرور ہوئی تھی۔ جناب نے بڑی خوش اخلاقی سے بات کی، اچھا لگا، محسن عزیز صاحب کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا آپ کو صحت وتندرستی عطا فرمائے۔ آمین! ثم آمین!

☆☆ مریم صاحبہ: ساحل ابڑو واقعی زندہ دل اور ادب سے لگاؤ رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں خوش وخرم رکھے، کہانی شامل اشاعت ہے خوش ہو جایئے، اور ہاں آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ ضرور بھیجئے گا۔

رشک نور فیصل آباد سے، امید ہے کہ ڈر کا تمام اسٹاف، رائٹرز اور قارئین کرام اللہ پاک کے فضل وکرم سے ٹھیک ہوں گے۔ سب سے پہلے تو Thank you جب میں کالج سے واپسی پر اپنے کمرے کی طرف گئی تو خاکی کاغذ میں پہلے کسی چیز کو اپنی اسٹڈی ٹیبل پر پایا جو اٹھایا تو میرا فیورٹ ڈر ڈائجسٹ تھا، خوشی کے مارے میرے منہ سے بے اختیار واہ نکلا، اتنی خوشی مجھے میرے فسٹ ایئر کے رزلٹ آنے پر بھی نہ ہوئی تھی۔ جتنا خوش ڈر ڈائجسٹ کو دیکھ کر ہوئی، Again Thank you۔ ڈر مجھے اس قدر پسند ہے کہ کیا بتاؤں۔ اس وقت میں بخار میں پھنک رہی ہوں اور خط لکھ رہی ہوں 'ڈر کی ترقی کے لئے شب وروز دعا گو رہتی ہوں۔

☆☆ رشک نور صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ، ایک مشورہ ہے کہ کہانی لکھ کر دوبارہ پڑھا کریں اور اس طرح تصحیح بھی ہو جایا کرے گی، پچھلی کہانی پر نظر ڈالئے گا کہ کس قدر محنت کرنی پڑی۔ شکریہ۔

فاطمہ خان علی پور مظفر گڑھ سے، السلام علیکم! مارچ کا شمارہ 22 فروری کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت خوب صورت لگا۔ رنگوں سے بھرپور اور جاذب نظر! اور کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اس شمارے میں اپنی کہانی کو نہ پا کر دکھ ہوا لیکن کوئی بات نہیں جناب صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، اگلی دفعہ ہی سہی۔ لیجئے جناب ایک اور خوب صورت تحریر لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی۔ تحریر

میں کمی بیشی دور کر کے ڈر کی زینت بنا دیجئے گا۔ بہت بہت شکریہ!

☆☆ مریم صاحبہ: چلئے اب کہانی شامل اشاعت ہے اور قوی امید ہے کہ دیر کئے بغیر ایک اور کہانی لکھ کر ارسال کردیں گی۔ Thanks۔

قاسم رحمان ہری پور سے۔ السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کا سارا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ مارچ کا شمارہ میں نے 3 مارچ کو خریدا۔ نئی قسط وار کہانیوں نے متاثر بھی بہت کیا، اور خوش بھی کیا ویلڈن۔ ایڈیٹر صاحب میں کافی عرصے سے اپنی کہانیوں کے چھپنے کا انتظار کررہا ہوں، میری کئی تحاریر آپ کے پاس ہیں، پلیز! نظر ثانی کریں۔ مارچ کے شمارے میں اپنی کہانی نہ پا کر اتنا افسوس ہوا کہ الفاظ میں بیان کرنے کی سکت نہیں۔ دو تین ماہ ڈر سے غیر حاضر کیا رہا آپ نے مجھے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر باہر پھینک دیا اور ہاں یہ بتادیں کہ "خوفناک کہانیاں" کہاں سے ملے گا، ہری پور میں دستیاب نہیں ہے۔ اگلے ماہ ایک مفصل تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گا۔ میں خالد شاہان بھائی کو اور این اے کاوش کو ایوارڈ ملنے پر مبارکباد دیتا ہوں، اللہ آپ کو ایسی ہزاروں کامیابی اور دکھائے۔ تب تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆☆ قاسم صاحب: اب تو خوش ہیں ناں کہ "محبتیں شمار کرنا" شامل اشاعت ہے ہم کسی کو مکھی کی طرح دودھ سے نکالتے نہیں بلکہ دل سے لگا کر رکھتے ہیں۔ تبصرہ ارسال کرنا بھولئے گا نہیں۔

احسان الحق، السلام علیکم محترم ایڈیٹرز صاحبان، رائٹرز اور قارئین کرام! اللہ پاک آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ مارچ 2018ء کا ڈر ڈائجسٹ دیکھ کر دل انتہائی خوش ہے کہ سرورق بے حد متاثر کن ہے اور لکھنے والے تمام رائٹرز نے اس میں خوب اپنا حصہ ڈالا ہے۔ کہانیوں میں ایس امتیاز احمد صاحب، ضرغام محمود صاحب، ناصر محمود فرہاد صاحب، ملک فہیم احمد، رشک نور، نینا خان، گلاب خان سولنگی صاحب، شکیل نیازی صاحب نے خوب خوب لکھا۔ ایڈووکیٹ نینا خان صاحبہ سے عاجزانہ درخواست ہے کہ واقعہ نگاری کی جگہ آپ کے قلم میں ایک کہانی کار کی خاصیت زیادہ پائی جاتی ہے، چاہے چھوٹی کہانیاں لکھیں لیکن واقعہ نگاری سے اپنے آپ کو علیحدہ کرتے ہوئے لکھیں اور کہانی کے انداز میں لکھیں۔ یہاں خاص طور پر مہر پرویز احمد دولو صاحب کا ذاتی طور پر احسان مند ہوں اور قلبی طور پر، عاجزی کے ساتھ شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے اپنی کہانی لکھ کر ناچیز کے دل کو ایک ایسی راحت بخشی جس کے نعم البدل میں کوئی دوا دارو نہیں ہوسکتی۔ آپ اپنی کہانی میں ہر ہر سطر پر سچ بولتے ہیں۔ آپ کی کہانی میں سب وطن عزیز کا المیہ ہے اور بہت قابل توجہ المیہ ہے اور میں عاجزی سے کہتا ہوں کہ جب جب ڈر مجھ گناہ گار کے ہاتھ میں آیا تو مختصر کہانیوں میں سب سے پہلے میں نے فہرست میں آپ کے نام کی تلاش کی اور سب سے پہلی کہانی آپ کی ہی پڑھی ہے اور جب جب (آپ کی کسی ذاتی مجبوری کی بناپر) آپ کہانی نہ لکھ سکے ہوں تو میں اُداس ضرور ہوتا ہوں۔ امید ہے کہ ڈر میں ہر ماہ ایک مختصر کہانی سہی، لیکن لکھیں گے لازماً، کیونکہ رائٹر کے ذہن میں کم از کم ایک پلاٹ تو مہینے بھر میں، ضرور ہوتا ہے۔ اور ہاں! ڈر ڈائجسٹ میں کمی ہے تو دو بہترین رائٹرز کی کمی ہے۔ ایک ایس حبیب خان صاحبہ کی اور دوسرے فلک زاہد صاحبہ کی۔ یقیناً ڈر کے تمام احباب ان دونوں کو Miss کر رہے ہوں گے۔ اللہ کرے کہ ان کی جانب سے جلد کوئی دھماکہ خیز کہانیاں شامل اشاعت ہوجائیں۔ دونوں ڈر ڈائجسٹ کی منجھی ہوئی رائٹرز ہیں بلکہ میں تو قائل ہوں کہ خوف و ڈر کے میدان میں ٹاپ کی رائٹرز ہیں۔ آپ سب کا شکریہ۔ اب اجازت دیجئے، والسلام و خیر اندیش۔

☆☆ احسان صاحب: یہ حقیقت ہے کہ دولو صاحب قلبی لگاؤ سے کہانی نہیں بلکہ معاشرتی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں، لیجئے ایس حبیب اور فلک صاحبہ کی کہانی اگلے ماہ ضرور شامل اشاعت ہوں گی۔ میں خود بھی ان دونوں رائٹرز کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے کہانی ارسال کر کے خوشی فراہم کی۔ Thanks۔

شاہد عظیم راولپنڈی سے، السلام علیکم محترم ایڈیٹرز ڈر ڈائجسٹ اینڈ ٹیم۔ مارچ کے مہینے کا ڈر پڑھا۔ سب سے پہلے سرورق کے متعلق عرض ہے کہ بہت خوب، محنت اور جان فشانی کے ساتھ بنایا گیا ہے، دل خوش ہوگیا۔ امید بندھی کہ کہانیاں بھی ڈر کے عین مطابق ہوں گی۔ جان لیوا نے دل خوش کیا۔ ڈاک بنگلہ بھی معیاری کہانی تھی۔ گلاب خان سولنگی صاحب نے بھی اس مرتبہ خوب کہانی لکھی۔ پرویز احمد دولو صاحب نے دراصل ملک کے حالات کا تذکرہ کیا ہے اور تمام باتیں ڈرا دینے والی ہیں۔ بے شک ایسے ملک ہر وقت بہت سے خطرات میں ڈوبے ہوتے ہیں جہاں ایسی باتیں ہو رہی ہوں جیسا کہ دولو صاحب نے سادہ الفاظ میں پیش کی ہیں۔

اللہ بچائے سب کو۔ ایس امتیاز احمد نے بھی ہمیشہ کی مانند بہترین لکھا۔ بہر حال عمومی طور پر ڈر میں اس مرتبہ کہانیاں بھی پسند آئی ہیں۔ امید ہے کہ باقی حضرات وخواتین بھی محنت کرتے رہیں گے۔ فلک زاہد صاحبہ کافی عرصہ سے ڈر ڈائجسٹ میں نہیں لکھ رہیں، برائے مہربانی ان تک عاجز کا پیغام پہنچادیں کہ کوئی ایک آدھ اچھی سی کہانی لکھ دیں، شکریہ۔ باقی آئندہ، دعا گو۔

☆☆ شاہد صاحب: فلک صاحبہ کی کہانی اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی، ان کی نئی کہانی آ گئی ہے۔ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

میاں یاور حسین اسلام آباد سے، السلام علیکم انکل! میرے پیپرز سر پر ہیں لیکن مارچ میں شائع ہونے والی صرف ایک کہانی پر کچھ کہوں گا جو جان لیوا کے عنوان سے انکل راشد نذیر طاہر کی بہترین پیشکش ہے، دوسری قسط بھی خوب رہی، اب دیکھتے ہیں کہ تیسری قسط میں کیا ہوگا۔ ڈر ڈائجسٹ کا سرورق بہت زیادہ زبردست بنایا گیا ہے اور ڈر ڈائجسٹ کی ٹیم کو داد دیتا ہوں کہ محنت سے سرورق کو ترتیب دیتے ہیں۔ اللہ ڈر ڈائجسٹ سے وابستہ ہر ایک کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ اس مرتبہ باجی ایس حبیب خان کا تبصرہ نہیں تھا جو کہ ڈر کی جان ہوتا ہے، آنٹی زینت خان کی باتیں بہت غور طلب ہوتی ہیں، میں ان کی باتوں سے رہنمائی لے رہا ہوں، شاید کسی ایک دن کوئی ایک کہانی لکھ سکوں، والسلام۔

☆☆ یاور صاحب: جو لوگ دوسروں کی باتوں پر غور کرتے ہیں وہی کامیاب ہوتے ہیں، آپ آنٹی زینت کی باتوں پر غور کیا کریں، ایک دن یقیناً کہانی لکھ سکیں گے، لیکن تبصرہ اگلے ماہ بھی بھیجئے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، خلوص تہنیت، خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔ ماہ رواں کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ کہانی اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا! Dar کے پلیٹ فارم پر کافی خوب صورت لکھنے والے جمع ہو رہے ہیں اور Dar کے خوفناک سفر پر ساتھ چلنے کو تیار ہیں! ''ڈر ایکسپریس'' اپنی تمام تر خوفناکیوں کے ساتھ سسپنس کی پرخطر راستوں پر رواں دواں ہے اور ہم اور آپ سب اس منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جس کی کوئی منزل نہیں۔ کوئی اسٹیشن نہیں......؟ دعا ہے کہ ''ڈر ایکسپریس'' کا سفر یونہی جاری رہے۔

☆☆ امتیاز صاحب: کم لکھا مگر سمجھنے کو بہت کچھ لکھا، اللہ تعالیٰ آپ کو اور بھی زورِ قلم عطا کرے، تاکہ اپنے چاہنے والوں کے لئے اچھی کہانیاں لکھ سکیں اور مکمل تبصرہ بھی، کیوں ٹھیک ہے ناں۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، مبارک آغاز بسم اللہ انجام خدا جانے، قوس قزح سمیت 18 کہانیوں کا گلدستہ ڈر کی صورت میں حاضر نظر ہے۔ خلیل جبار کو ڈر میں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے، شہزادہ چاند زیب عباسی اور خلیل جبار کی کہانیوں میں منظر کشی بہت کم ہوتی ہے۔ شہباز احمد کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ محسن عزیز حکیم کی صحت یابی کے لئے دعا گو ہوں، گلاب خان سولنگی، اللہ آپ کی پریشانی دور فرمائے۔ ڈر میں کسی ساتھی کو پریشان دیکھتا ہوں تو دل دکھی ہو جاتا ہے، کیوں کہ میں بھی خوشی کو ترستا ہوں۔ والسلام۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کی تحریر کردہ باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حقیقت میں آپ کا دل دکھی ہو جاتا ہوگا۔ کسی ساتھی کی پریشانی دیکھ کر، بس جی ہم تو کسی کے لئے دعا ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بھی صحت وتندرستی دے اور خوشیوں سے نوازے۔ آمین۔

طارق محمود کامرہ اٹک سے، السلام علیکم! 25 فروری کی گرم دوپہر میں اپنا پیارا ڈر ڈاکیہ کی طرف سے ملا، سچ میں بہت ہی خوشی ہوئی، ٹائٹل کی حسینہ کو دیکھ کر دلکش اسٹائل سے کجرارے نینوں سے جانے کسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے ہی شاید موت کا کنواں تھا جس میں سے تین انوکھی مخلوق ایک مردہ کو نکال کر لا رہی تھیں لیکن اس گرل کا دھیان جانے کدھر تھا۔ ''قرآن کی باتیں'' سب کے لئے مشعل راہ ہیں۔ خطوط کی محفل ایک بہترین سلسلہ ہوتا ہے۔ جس میں کسی کے لئے تعریف کے جانے کون کون سے کلابے ملاتے رہتے ہیں اور کسی کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چلیں پسند اپنی اپنی، اس دفعہ کچھ ماہ بعد ضرغام محمود صاحب ڈر ڈائجسٹ میں کہانی کے ساتھ نظر آئے، اتنے ماہ بعد ایک بہترین کہانی لے کر آئے، پڑھ کر سچ میں محظوظ ہوئے۔ ''پراسرار ہوٹل'' چھوٹی سی اچھی کہانی تھی۔ ہوٹل کی پراسراریت کے تینوں دوست شکار ہو گئے۔ ''کربناک انجام'' سبق آموز کہانی تھی۔ ''جان لیوا'' راشد نذیر طاہر صاحب بہت ہی اچھے دھیمے انداز سے کہانی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اسٹوری بہت ہی اچھی ہے۔ مکمل قسط پڑھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ ''موت سے

چھٹکارہ' اچھی تحریر تھی۔ کہانی کا لکھنے کا اسٹائل اور پلاٹ بہت ہی اچھا تھا۔ باقی کہانیاں بھی ڈر کے لحاظ سے بہترین تھیں۔ ڈر ہر رائٹر کی کہانی کو عمدہ طریقے سے پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے شکریہ۔

☆☆ طارق صاحب: دراصل ادارہ ڈر ڈائجسٹ اپنے تمام رائٹروں اور قاریوں کو دلی طور پر چاہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نئے رائٹروں کی کہانیاں بھی بنا سنوار کر پیش کرتا ہے اور اس طرح بہت کم عرصے میں ایک لکھنے والا رائٹر بن جاتا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔

عبدالعزیز بلوچ کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا پورا اسٹاف سارے لکھاری و قارئین حضرات خیریت سے ہوں گے۔ ماہ مارچ کا شمارہ 22 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق پسند آیا۔ خطوط میں تمام دوستوں کے خطوط خوب رہے۔ کہانیوں کی فہرست میں تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خاص طور پر کالی ماتا کا پجاری، کربناک انجام، پراسرار ہوٹل، اس بار کی بہترین کہانیاں تھیں، اس بار میں ایک کہانی ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے اصلاح کے بعد شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ شکریہ اللہ حافظ۔

☆☆ عبدالعزیز صاحب: فکر نہ کریں اصلاح کر کے کہانی شائع کردی جائے گی۔ کہانیوں کی تعریف اور اگلے ماہ بھی تبصرہ ارسال کرنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

ڈاکٹر عامر شہزاد رانا ننکانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹرز صاحب، معزز رائٹرز اور قارئین السلام علیکم! مارچ کا اعزازی کاپی ارسال کرنے پر بہت بہت شکریہ، ورنہ بازار سے تو بہت لیٹ ملتا ہے۔ سرورق انتہائی خوب صورت اور ڈراونا لگا ہمیشہ کی طرح قرآنی صفحہ پڑھ کر روح کو سکون ملا۔ "خطوط" میں مسز فرحین حامد، مسز زینت خان، مسز سندس اقبال، خدیجہ فاطمہ، فاطمہ علی خان، گریٹ نینا خان، مریم فاطمہ، مریم مرتضیٰ، ملک این اے کاوش، محترم احسان الحق، خالد عباس ہر دلعزیز محمد حنیف شاکر اور عبدالجبار رومی نے بہترین تبصرے لکھے۔ کہانیوں میں گریٹ نینا خان کی "کالو" نے تو دل خوش کردیا۔ اسد اللہ بھٹی کی پراسرار ہوٹل ملک این اے کاوش کی "کربناک انجام" شہزاد خان کی "موت سے چھٹکارا" ناصر محمود کی "یشمک" رشک نور کی "سزائے موت" محمد شعیب کی "وہ ایک پل" محسن عزیز کی "تکشک ناگن" اور شکیل نیازی کی "دیوتا نگری" عمدہ اسٹوریز ثابت ہوئیں۔ محمد حنیف شاکر صاحب کا منی شامنی میں چھا گئے۔ مہر پرویز صاحب آپ بھی ننکانہ صاحب تشریف لائیں میں آپ کو یہاں سکھ مذہب کے بانی گرونانک صاحب کے جنم استھان اور مختلف گورداروں کی سیر کرواؤں گا اور کچھ شیدوں سے بھی ملاؤں گا ویسے "شیدے کی کرامت" لاجواب کہانی ہے۔ غزل میں پروفیسر ڈاکٹر واجد، محمد اسلم جاوید، گریٹ نینا صاحبہ، فروا تنویر، محمد حنیف شاکر، کائنات رشک، خالد عباس، رابعہ آفرین اور الیس امتیاز احمد نے قابل تعریف غزلیں لکھیں۔ خیر میری دعا ہے کہ پاکستان کا نمبرون ڈائجسٹ "ڈر" مزید کامیابی سمیٹے، دعائے خیر ہے کہ "ڈر" ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔

☆☆ عامر شہزاد صاحب: دراصل میری بھی خواہش ہوتی ہے کہ میں ہر کسی کا خط پورے کا پورا شائع کردوں مگر ہائے رے مجبوری، محدود صفحات کے بنا پر خواہش گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ ماشاء اللہ آپ سمجھدار ہیں، سمجھ گئے ہوں گے۔ Thanks۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیروعافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، پچھلی بار آپ کو خط تحریر نہ کرسکا، معذرت خواہ ہوں، کام کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے شہر جانا نصیب نہ ہوا۔ سوچتے ہوئے کافی دن گزر گئے، پرچہ پریس میں جانے کی تیاری کے قریب تھا۔ چند دن رہ گئے۔ اس وجہ سے خط آپ کو نہ لکھ سکا کام زوروں پر ہے۔ وقت نہیں ملتا۔ شہر بک اسٹال پر جانے کو آپ نے سابقہ روایات کے تحت دوستی کا حق ادا کردیا ہے ابھی ابھی کام سے آیا ہوں اور یہ مختصر سی تحریر آپ کی نظر کر رہا ہوں ویسے میں پرچے کا بہت پرانا قاری ہوں۔ اس کا اپنا ہی معیار ہے۔ اس کے تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہت خوب ہیں۔ نئے نئے قلم کاروں کو متعارف کرانا آپ ہی کا کام ہے۔ مقررہ تاریخ پر ڈر ڈائجسٹ کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ موسم بھی آہستہ آہستہ تبدیل ہوا دکھائی دیتا ہے۔ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ خدا آپ کو اپنے نیک مقصد میں کامیابی سے ہمکنار کرے۔ ہر بار کہانیاں اور غزلیں خوب سے خوب تر ہوتی ہیں۔ قوس قزح کے اشعار بھی اچھے ہوتے ہیں۔ قرآن کی باتیں بھی اچھا سلسلہ ہے۔ اس سے ہر مسلمان کو استفادہ کرنا چاہئے۔

☆☆ اسلم صاحب: دراصل زندگی مسلسل تگ ودو کا نام ہے۔ اگر انسان احکام خداوندی پر عمل پیرا ہوجائے تو ساری مشکلات دور ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ سارے عمل کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم رکھے۔ (آمین)

خضر حیات روڈہ تھل سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر کا سارا اسٹاف خیر خیریت سے ہوگا۔ مارچ کا شمارہ ایک خوبصورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ 25 فروری کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت ہی خوب صورت اور دلکش تھا۔ ٹائٹل ایک طرف اور شمارہ ایک طرف۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگا۔ شمارہ بہت بہت زبردست تھا۔ سب کہانیاں بہت بہت زبردست، اچھی اور عمدہ تھیں۔ ویسے تو سب کہانیاں زبردست اور اچھی تھیں لیکن کچھ کہانیاں بہت بہت ہی زبردست تھیں۔ ان میں ''کربناک انجام'' ''جان لیوا'' ''موت سے چھٹکارا'' شامل ہیں۔ باقی کہانیاں بھی سب سے عمدہ اور اچھی تھیں۔ قوس قزح میں گیا تو پورے شمارے کا مزہ ہی دوبالا ہوگیا۔ پورے کا پورا قوس قزح زبردست تھا۔ اپنی غزل اور شعر دیکھ کر خوشی 4 گنا بڑھ گئی۔

☆☆ خضر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ قبول کریں۔

عجب گل اداسی ٹنڈو الہ یار سے، السلام علیکم! ڈر کے تمام اسٹاف اور تمام قارئین کے لئے پرخلوص دعائیں، مارچ کے شمارے کا ٹائٹل اپنی مثال آپ تھا، کئی ماہ سے ٹائٹل بہت زبردست آرہے ہیں، تمام کی تمام کہانیاں قابل تعریف ہیں، لیکن پھر بھی چند کہانیاں جو دل کو بھا گئیں وہ ہیں، موت سے چھٹکارا، کربناک انجام، یشمک، کامنی شامنی، شیدے کی کرامات اور دیوتا نگری، تمام رائٹروں کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید ہے کہ تمام رائٹر آئندہ بھی اچھی اچھی کہانیاں لکھ کر پڑھنے والوں کو خوش کریں گے۔ ڈر کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ عجب گل صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ نے کہانیوں کی تعریف کے لئے خط لکھا، تو پلیز! آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد دانیال روڈہ تھل سے، السلام علیکم! میں ڈر ڈائجسٹ کا بہت بہت شکرگزار ہوں کہ آپ نے میری تحریروں کو شمارے میں جگہ دی، مجھے ویلکم کہا اور حوصلہ افزائی کی۔ پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین بھی نہیں آرہا تھا۔ اب آتا ہوں شمارے کی طرف، مارچ کا شمارہ ایک حسین، خوب صورت سرورق کے ساتھ 23 فروری کو مل گیا۔ سرورق بہت بہت ہی خوب صورت تھا اور اس نے پورے شمارے کو آٹھ چاند لگا دیئے۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ شمارہ بہت بہت زبردست تھا۔ شمارے میں شامل سب کہانیاں بہت زبردست، اچھی اور عمدہ تھیں۔ جب قوس قزح اپنی غزل اور شعر کو دیکھ کر پاگل ہوگیا خوشی سے مجھے تو اپنی آنکھوں پر بھی یقین نہ آیا۔ اب تک کے لئے اتنا ہی۔

☆☆ دانیال صاحب: ہم بھی آپ کی خوشی میں شامل ہیں اور یہ خوشی اس وقت تک رہے گی جب تک آپ اچھی اچھی تحریریں لکھتے رہیں گے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے سینئرز کو پڑھیں اور تحریریں لکھتے رہیں کامیابی قدم چومے گی۔

محمد خالد عباس ننکانہ صاحب سے، محترم ایڈیٹرز صاحب السلام علیکم، مارچ کے شمارے میں غزل اور خط شائع ہونے پر خوشی ہوئی، اس بار رسالہ بہت خوب صورت لگا، تمام رائٹرز نے خوب اچھا لکھا، کہانیوں میں ''پراسرار ہوٹل'' ''کربناک انجام'' ''ڈاک بنگلہ'' ''سزائے موت'' ''نینا خان کی'' ''کالو'' ''بہادر کون'' ''شیدے کی کرامت'' ''دیوتا نگری'' رانا عامر شہزاد نے ''خوفناک رات'' نہایت اچھی کہانی لکھی، جسے پڑھ کر دل خوش ہوگیا، یہ واقعی بہت خوفناک، پراسرار اور ہیبت ناک کہانی ہے۔ ''کامنی شامنی'' میں محمد حنیف شاکر نے بھی خوب رنگ جمایا۔ واقعی شاکر صاحب بہترین ہارر رائٹر ہیں۔ امید ہے جلد ایک اور خوفناک کہانی کے ساتھ پیش ہوں گے۔ غزل میں ڈاکٹر واجد صاحب، محترمہ نینا خان صاحبہ، محمد حنیف شاکر صاحب، فروا تنویر، کائنات صاحبہ، رابعہ آفرین اور رانا عامر شہزاد صاحب نے نہایت عمدہ غزلیں لکھیں، دعائے خیر ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کی راہوں پر گامزن رہے۔ آمین۔

☆☆ خالد صاحب: خط بھیجنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں اور ہاں اگلے ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا مت بھولئے گا۔

شہباز احمد ایبٹ آباد سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کے تمام لکھاری و قاری اور ادارے والے خیر خیریت سے ہوں گے اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو پریشانیوں اور مصیبتوں سے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ مارچ کے شمارے میں تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ کہانیوں میں احسان الحق صاحب کی کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔ کہانیوں کے علاوہ قوس قزح میں بھی ہر شاعر نے اچھا کلام پیش کیا۔ شاعری لکھنا نثر لکھنے سے مشکل ہوتا ہے۔ آخر میں سب کو پیار بھرا اسلام اور ایک بات کہنا چاہوں گا ہر ماہ ڈر کا ٹائٹل مزید ہارر

کریں۔عین نوازش ہوگی۔

☆☆شہباز صاحب: آپ کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری کوشش ہوگی کہ ٹائٹل مزید بہار ہو اور آپ خوش ہوجائیں۔

مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں سے۔السلام علیکم! محبتوں کی گٹھڑی اٹھائے چاہتوں کی لاٹھی کی ٹک ٹک کرتے بائیس فروری کو ناچیز کے غریب خانے کے دروازے پر ڈر جی خلوص سے ٹھک ٹھک کرنے لگے۔سرورق کی حسینہ کے الھڑپن پر قربان ہونے کو جی چاہا،سادگی ہو تو ایسی، نیلی آنکھوں سے سجا خوب صورت سوہنا من موہنا چہرہ من کی دھرتی پر انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔ایسی حسینہ کو دیکھ کر خوفناک تحریر کے بجائے وفا کی دہکتی آگ میں جل جانے والی آپ بیتی لکھنے کو جی چاہتا ہے۔بالوں کی خوب صورتی الگ غضب ڈھا رہی ہے۔ڈرنے والی تو کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی۔خیر قرآن کی باتیں مشعل راہ تھیں۔خطوط الفاظ،جذبات،خواہشات کے فروٹ چاٹ تھے،کہیں تحریروں کی تعریف ہورہی ہے تو کوئی تعریف کے قرض تلے دھنسا شکریہ سے ادائیگی کرتا نظر آیا۔محترم شاہد علی بھی حوصلہ افزائی کرتے نظر آئے،کراچی کی ادیب ہستیوں نینا خان،اور مریم فاطمہ کا ممنون ہوں۔جناب ضرغام محمود کی ماتا کی پجاری پڑھی اور دل خوش ہوا۔پراسرار ہوٹل میں تین دوستوں کی عبرت ناک موت پر اسد اللہ بھٹی لب کشائی کرتے نظر آئے جو کہ اچھا لگا۔کربناک انجام میں جناب این اے کاوش نے ایم این اے شہروز کے سدا جوان ہونے کے جذبے پر مدلل روشنی ڈالی اور لاجواب کہانی تھی۔جان لیوا راشد نذیر طاہر کی بہت ہی دلچسپ تحریر تھی۔شہزاد خان کا موت سے چھٹکارا خوب سبق آموز تحریر تھی،پڑھ کر اچھا لگا،ناصر محمود نے بشمک سے،بحری جہاز کے سفر کی سیر کروائی جس نے پڑھنے کا مزہ دوبالا کردیا۔ ملک فہیم کا اندھیرا اجالا مسلمانوں کی رحم دلی،محبت اور ہندو لڑکوں کی مخالفت پرمبنی تحریر پڑھی۔اب انتظار ہے کہ آگے آگے ہوتا کیا ہے۔حنیف شاکر نے کامنی شامنی سے بہن کو نجات دلائی،نینا خان نے مہر النسا کے بیٹے سانپ کو تحریر میں ڈھالا۔گرم پانی سے موت نے مہر النسا کو دکھی کردیا۔خالد شاہان کے اسرار آہستہ آہستہ کھلتے جارہے ہیں۔گلاب خان سولنگی کی بہادر کون پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔رانا عامر شہزاد یہ سچ ہے کہ لاش کے ساتھ بیٹھنا مشکل ہے اور اس کے انتقام کا نشانہ بننا بہت ہی مشکل کام ہے،طارق محمود ایک بزرگ کریم بخش اور اس کے بھائی نعیم بخش کی رحم دلی کے واقعات پر روشنی ڈالتے نظر آئے،محسن عزیز انسانوں کی بستی میں سانپوں پر ہونے والے ظلم کی داستان سنا رہے تھے۔دیوتا نگری میں شکیل نیازی اور دیوتاؤں کے قید خانوں،دنیا کے لوگوں پر ظلم وستم کی تحریر لائے اچھا لگا۔

☆☆مہر پرویز صاحب: آپ کی کہانی بھی پڑھ کر دلی خوشی ہوئی،معاشرے کی حقیقت کو بیان کرکے آپ دل خوش کردیتے ہیں اور کاش کہ ہم لوگ ان واقعات سے سبق حاصل کریں۔

محمد حنیف شاکر ننکانہ صاحب سے،السلام علیکم،سلام مسنون کے بعد خیریت کا طالب،اللہ کے فضل سے بالکل خیریت سے ہے۔اس بار ڈر کا جتنی بے چینی سے انتظار تھا اتنی ہی تاخیر سے ملا تو اس کے ملنے سے ساری بے چینی دور ہوگئی تمام خطوط حسب معمول ایک ہی لمحے یعنی چند منٹوں میں ہی کھنگال ڈالے،سب سے پہلے میں آپ جناب کا بہت بہت مشکور ہوں اور بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے نہ صرف کہانی کامنی شامنی بلکہ غزل کے ساتھ خط بھی شائع کیا،جناب ایڈیٹر صاحب آپ نے کہانی کا نام تبدیل کرنے پر معذرت کی جس پر مجھے بے حد شرمندگی ہوئی۔آپ ہمارے لئے بہت ہی محترم ہیں ایسا کرکے ہمیشہ شرمندہ نہ کیا کریں،اللہ آپ کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے،آمین۔کہانیوں میں ضرغام محمود صاحب کی کہانی ”کالی ماتا کا پجاری“ بہت اچھی کہانی ہے،عمدہ کہانی لکھنے پر آپ کو بہت ہی مبارک ہو،ڈاکٹر عامر شہزاد صاحب کی ”خوفناک رات“ پڑھنے پر واقعی میں خوف آگیا،اچھی کہانی پر ڈاکٹر صاحب مبارکباد قبول فرمائیں۔ہم مٹھائی کے حق دار ہیں یا نہیں۔ضرور آگاہ کرنا۔باقی تمام کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔کیوں کہ ڈر آج ہی ملا،اس لئے ”خطوط“ قوس قزح غزلیں اور یہ تین عدد کہانیاں ہی مطالعہ کرسکا۔لہٰذا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے خط لکھ رہا ہوں۔ایک کہانی جادو کا بیل تحریر کررہا ہوں۔جلد ہی روانہ کردوں گا۔آخر میں سب رائٹرز خواتین وحضرات کو اور ڈر کے تمام اسٹاف کو بہت بہت سلام،آخر میں ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆حنیف صاحب: بڑی کہانی لائن میں لگ گئی ہے پلیز! چھوٹی کہانی ارسال کریں،چھوٹی کہانیاں ہی بار بار شائع ہوتی ہیں۔امید ہے مثبت جواب ضرور دیں گے۔Thanks۔

محمد شمیر یوسف مہرے والا سے،السلام علیکم،میں ڈر ڈائجسٹ کے تمام قارئین کو تہہ دل سے سلام پیش کرتا ہوں۔مارچ

کا شمارہ ڈراؤنے سرورق کے ساتھ سامنے ہے۔فروری 2018ء کا شمارہ کافی دلچسپ اور لاجواب کہانیوں پر مشتمل تھا۔مارچ 2018ء کا شمارہ بھی لاجواب کہانیوں پر مشتمل تھا۔یہ تمام تحریریں بہت پسند آئیں۔اور آخر میں ڈر کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ شمیر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا بھولئے گا مت شکریہ۔

خبر (آل پاکستان ساگر تقریب ایوارڈ) (رپورٹ: ساحل ابڑو ڈیرہ اللہ یار سے، ملی ادبی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام 7 جنوری 2018ء ڈسٹرکٹ کونسل ہال ڈیرہ اللہ یار میں جعفر آباد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ آل پاکستان تقریب ایوارڈ کا انعقاد کیا گیا۔جس کی صدارت ادیب، دانشور، پروفیسر محمد ایوب منصور نے کی جبکہ مہمان خاص اے ڈی سی او محمد یعقوب ہنگوکی اور اعزازی مہمان پاکستان کی جانی پہچانی بلوچستان یونیورسٹی بلوچی ڈپارٹمنٹ کی ہیڈ ڈرامہ آرٹسٹ پروفیسر ڈاکٹر زینت ثنا بلوچ تھی، تقریب ایوارڈ کا آغاز تلاوت کلام سے ہوا، جس کی سعادت عزیز احمد اور نعت شریف پڑھنے کا شرف محمد اویس لاشاری نے حاصل کیا۔نظامت کے فرائض محمد ابراہیم منگریو نے سرانجام دیئے۔مہمان خاص محمد یعقوب کو وائس چیئرمین راقم الحروف (ساحل ابڑو) نے ایوارڈ پیش کیا۔اعزازی مہمان پروفیسر ڈاکٹر زینت ثنا بلوچ کو چیئرمین محمد اسلم آزاد نے ایوارڈ اعزاز سے نوازا اور ملی ادبی فاؤنڈیشن کے اغراض و مقاصد پیش کئے۔جس کے بعد مہمان خاص نے پاکستان بھر میں ادبی خدمات سرانجام دینے پر عادل ابڑو، محمد ابراہیم منگریو، پروفیسر منظور احمد وفا، پروفیسر سلیم اختر کراچی، پروفیسر محمد ایوب منصور، منظور حسین سلال، صاحب خان جعفر آبادی، پروفیسر گلزار آثم، شمس ندیم، استاد احمد بخش شاد، عاشق بلوچ، سجاد علی راہی راولپنڈی، ملک فیاض علی کو ایوارڈ کے اعزاز سے نوازا۔اعزازی مہمان پروفیسر زینت ثنا بلوچ نے مقابلہ کہانی نویس ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں محمد خالد شاہان صادق آباد، مقصود احمد بلوچ میاں چنوں، مہر پرویز احمد دولو اقبال نگر، ملک این اے کاوش سرگودھا، مریم فاطمہ کراچی، ایڈووکیٹ وقار احمد برق جعفر آباد، محمد رفیق مغیری بھاگ، اسرار احمد شاکر اوستہ محمد، حمیدہ وحید واہ کینٹ، شبنم وارثی آزاد کشمیر اور بشریٰ زین لاہور کو ایوارڈ پیش کئے۔شعبہ بچوں کا ادب اور صحافتی ایوارڈ حاصل کرنے والوں میں صحافی لعل محمد شاہین جعفر آباد، علی گل چندرانی اوستہ محمد، بچوں کے ادیب غلام حیدر شاہین کوئٹہ، ادیب عبدالغفار عطشان مستونگ کو صدر مجلس پروفیسر محمد ایوب منصور نے تقسیم کئے۔اس موقع پر مہمان خاص، اعزازی مہمان اور صدر مجلس و دیگر ادیب پروفیسروں نے ملی ادبی فاؤنڈیشن کے احسن اقدام کو بہت سراہا اور چیئرمین محمد اسلم آزاد، وائس چیئرمین ساحل ابڑو اور دیگر عہدیداران کو مبارکباد پیش کی، بلوچستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ آل پاکستان ساگر تقریب ایوارڈ کا انعقاد کرکے شعراء، ادبا کو جو عزت اور اعزاز سے نوازا ہے وہ صدیوں تک یاد رکھا جائے گا اور بلوچستان میں قائم ادبی تنظیموں کے لئے ایک پیغام اور سبق چھوڑا ہے کہ ادبی پروگرام کے ساتھ ادبی ایوارڈ کے انعقاد کو بھی یقینی بنائیں۔تقریب ایوارڈ میں شمس ندیم، پروفیسر منظور احمد وفا، عاشق بلوچ، بقا محمد بقا اور شمس مجبور نے اپنا تازہ کلام پیش کیا جبکہ پاکستان کے مشہور شاعر صاحب خان جعفر آبادی اور نور محمد نور کا لکھا ملی ادبی فاؤنڈیشن پر ترانہ حافظ امان اللہ واگہ نے پیش کرکے مقررین کے دل جیت لئے۔ساگر تقریب ایوارڈ کے بعد نصیر آباد ویلفیئر سوسائٹی رجسٹرڈ کی جانب سے ملی ادبی فاؤنڈیشن کے عہدیداران میں محمد اسلم آزاد، ساحل ابڑو، محمد سلیم اختر، شمس مجبور، گلزار وفا، شاد چندرانی، ایم اے شکیل، نور محمد نور، ڈاکٹر رسول بخش کے ایوارڈ اعزاز سے عادل ابڑو نے نوازا اور ملی ادبی فاؤنڈیشن میں بھرپور تعاون کی یقین دہانی کروائی۔تقریب کے اختتام میں بیاد شہید میر محمد مراد ابڑو کی سماجی خدمات پر وڈیرہ محمد شریف ابڑو اور کونسلر راجحن علی ابڑو نے علمی ادبی و سماجی خدمات پر علی گل جاموٹ، مزار خان ابڑو، رئیس گلاب خان، پروفیسر فضل الدین ابڑو اور محمد نواز کو ایوارڈ دیا۔آخر میں تمام مہمان اور گرامی ایوارڈ یافتگان کے لئے ملی ادبی فاؤنڈیشن پاکستان کی جانب سے ظہرانہ دیا گیا۔

☆☆

قارئین کرام! ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر کئی ماہ سے کاغذ کا ریٹ بھی مسلسل اضافے کا شکار ہے لہٰذا ملک کے سارے پرچے مہنگائی سے متاثر ہو رہے ہیں، خیر ہماری ابھی بھی دعا ہے کہ کاغذ کا بڑھتا ہوا ریٹ اپنی جگہ ٹھہر جائے، تا کہ مہنگائی کا بوجھ پڑھنے والوں پر نہ پڑ سکے۔ (ادارہ)

المیہ

احسان الحق

کیا یہ خوفناک باتیں نہیں کہ ملک کی اصل انسانی دولت ضائع ہورہی ہے اور یہ خوفناک بات ہی نہیں بلکہ انتہائی خطرناک بات بھی ہے، ہر ملک میں مثبت سوچ رکھنے والی قوم ہی نظام کو بدلتی ہے ناکہ اختلافی سوچ رکھنے والی قوم......

انگشت بدنداں کردینے والی...... کہنہ مشق رائٹر کے قلم کی...... شاہکار حقیقت

میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میری عمر پچاس سال ہے۔ مَیں نے ''باقاعدہ'' .M.B.B.S کر رکھا ہے۔ باقاعدہ کا لفظ تو مَیں نے دانستہ استعمال کیا ہے ورنہ آپ بھی معترض ہو سکتے ہیں کہ کیا ہر ڈاکٹر .M.B.B.S نہیں ہوتا؟

تو لیجیے جواب بھی حاضر ہے۔ جی نہیں! آج کل ہر ڈاکٹر کے پاس ایک عدد سند تو ہوتی ہے لیکن وہ .M.B.B.S نہیں ہوتا۔ اب آپ کہیں گے کہ کیوں جی؟ تو جواب یہ ہے کہ کتابیں پڑھ لینے سے انسان انجینئر، ڈاکٹر، اکاؤنٹنٹ اور مکینک نہیں بن جاتا۔ اس کے لئے لازم ہے کہ اس کا تجربہ وسیع ہو۔ صحبت کامل بھی تو کسی شے کا نام ہے کہ نہیں! اور یہ بھی تو یاد رکھیے کہ آج ہر استاد/ ٹیچر یا پروفیسر ''کامل'' تو نہیں ہوتا نا!۔۔۔ ورنہ ہم سب معاشرے میں ''گوہر نایاب'' کو کیوں تلاش کرتے؟

مجھے یاد ہے کہ .M.B.B.S کے آخری کلاس سیشن میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم صاحب مرحوم نے بھری کلاس سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک جملہ کہا تھا۔ شاید وہ .M.B.B.S کے ہر آخری کلاس سیشن میں اُسے دہراتے آئے تھے۔ ہم سے پہلے والوں کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی وہ جملہ اُن کی وصیت سمجھتے ہوئے ہم نے اپنے پلّے سے باندھ لیا تھا۔

اور وہ جملہ یہ تھا!

''محترم دوستو! آج سے آپ لوگ ڈاکٹر نہیں بنے بلکہ ڈاکٹر بننے کے لئے تیار ہوئے ہیں۔''

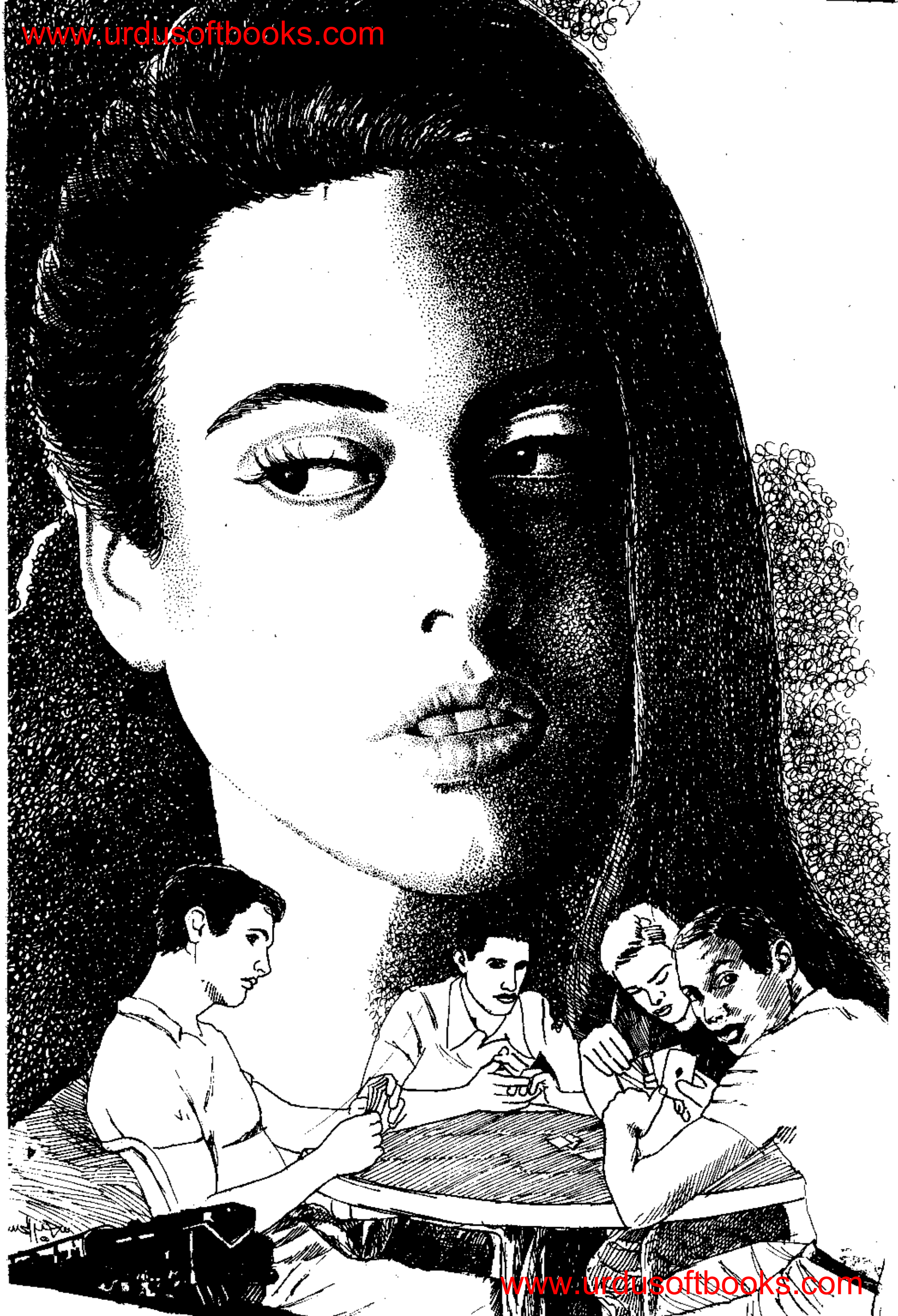
بیڑا غرق! ستیاناس!۔۔۔ یہ پانچ سال! تو پھر یہ کس کھاتے میں گئے۔ نہ دن کا پتہ نہ رات کو چین۔ کیا ہم جھک مارتے رہے تھے؟

اُس وقت ہم سب کو یہی محسوس ہوا تھا۔ لیکن! ہمارے اُستاد نے بالکل تجربے کی بات کہی تھی۔ وہ ٹھیک تھے اور ہم غلط۔ انسان اپنی ابتدائی زندگی کے چالیس سال تک غلط ہی ہوتا ہے۔ یہ ہمیں بعد میں پتہ چلا۔

پھر امتحانات ہوئے۔ میری تیاری پوری تھی کیونکہ منزل کا تعین کر چکا تھا یعنی اگر مجھے بننا ہے تو ڈاکٹر ہی بننا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں بننا۔

پھر ایک دن مَیں گھر آیا اور نہا دھو کر جب کپڑے تبدیل کئے تو ابا جان نے آواز لگادی۔ ''جمیل الدین آیا کہ نہیں؟''

''بھئی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہے آپ کے پاس!'' یہ امی جان تھیں۔



www.urdusoftbooks.com

"اس لڑکے کو تین دن قبل دیکھا تھا میں نے، عالیہ! اور اب بھی کوئی خاص اُمید نہیں رکھتا۔" ابا کے انداز میں شکوہ تھا۔

"ابا میں آ رہا ہوں، آپ ہی کے پاس!" میں نے قدرے اونچی آواز سے کہا تھا کیونکہ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں فوری ابا کے پاس چلا گیا۔ سلام کے بعد ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹری کہاں تک پہنچی آپ کی؟"

"پیپرز تو دے دیئے ہیں، ابا۔ اب بس رزلٹ کا انتظار ہے۔"

"کیا آپ سے اُمیدِ بہاراں رکھی جا سکتی ہے یا......؟" ابا نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ ان کی یہ بات سن کر دل تو چاہا کہ زوردار قہقہہ لگا دوں لیکن ہمارا دور بزرگوں اور بڑوں کے احترام کا دور تھا۔ میں نے سر جھکا کر جواب دیا تھا۔ "ابا، آپ اور امی جان کی دعاؤں کی بدولت میں نے پورے M.B.B.S. میں کہیں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور یقیناً آپ کامیابی کی نوید سنیں گے۔"

"اس کے بعد کیا کرنا ہے، میرا مطلب ہاؤس جاب کہاں کرو گے؟" ابا نے فی البدیع سوال پوچھ لیا۔

"ابا، میرا ارادہ تو ---" اور میں نے ایک بڑے اسپتال کا نام لے لیا کہ میں وہاں پریکٹس کرنا چاہتا ہوں۔

"ہونہہ، وہ ذات ایسا ہی کرے! جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہو" ابا نے اخبار ایک جانب سائیڈ میز پر رکھتے ہوئے پہلی مرتبہ سوچ میں ڈوبے ڈوبے انداز میں کہا تھا۔ اُن کا رویہ مجھے سمجھ میں نہ آیا لیکن اُس وقت میں نے یہ سوچا ضرور کہ اُنہیں کیا معلوم کہ سرکاری اور نجی ہسپتالوں میں ڈاکٹر کی طلب کتنی ہوا کرتی ہے اور یہ ہسپتال ہاتھوں ہاتھ ڈاکٹر کو لے لیا کرتے ہیں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ ابا ٹھہرے ایک سرکاری ملازم جو آغاز میں ایک نچلے درجے کے کلرک تھے اور اب بیس سال بعد کہیں سولہویں درجے تک پہنچے ہیں۔ اپنے زمانہ کے ایم اے (اردو)۔

اردو میں ماسٹرز! اردو! --- اور وہ بھی اس مضمون میں دو سال کھپا ڈالے میرے ابا نے۔ بھلا اردو بھی کوئی مضمون ہے؟ یہ سب میں اُس وقت سوچ رہا تھا۔ دفع دور گندی گھورا!

اردو تو ہمارے امی ابا ہمیں بچپن میں سکھا دیتے ہیں۔ بھلا اس میں 730 دن ضائع کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی اور اوپر سے نتیجے کا انتظار کیجیے، وہ علیحدہ Fatigue! یعنی خواری۔ (یاد رہے کہ یونیورسٹیوں کے ہاں پہلے سالہا سال اگر امتحانات کے نتائج نہ بھی آتے تو بھی اُن کے سر پر جوں نہ رینگتی تھی، یہ تو اب تھوڑا بہت نظام سیدھا ہوا ہے اور وہ بھی عدلیہ اور فوج کی دراندازی کی بدولت، معاف کیجیے گا!)

تو ایسی سوچیں اُس نوجوانی کے دور میں اپنا ذہن سوچا کرتا۔ لیکن جب میں ہاؤس جاب کے لئے ایک کے بعد دوسرے ہسپتال دربدر ہوا تو مجھے اپنی قدر و قیمت کا احساس ہو گیا۔

"یہ تم نے اپنے منہ پر چھ کیوں بجا رکھے ہیں۔" خالدہ نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں مجھے "بوتل" دیتے ہوئے کہا تھا۔

آپ لوگ غلط مت سمجھئے، اُس زمانے میں مشروبِ لطیف کو بوتل ہی کہا جاتا تھا۔ یا اِسے مزید واضح کر دوں --- کہ جو مشروب، شیشے کی بوتل میں قیمتاً، بازار سے منگوا کر سرِ عام یا محفل میں، ہر رشتہ دار کے سامنے یا ان کے ساتھ بیٹھ کر پیا جاتا، اُسے عام بول چال میں "بوتل" کہا جاتا۔ اور جو مشروبِ حرام چھپ کر یار دوستوں کے ساتھ پیا جاتا اُسے "بوتلی" کہا جاتا۔ بہرحال! خالدہ نے مہمان نوازی کے بطور ایک بوتل میرے سامنے میز پر رکھ دی تھی۔

خالدہ میری بہت اچھی دوست بھی رہی تھی۔ وہ مجھ سے دو سال پیچھے کے Batch میں تھی۔ ایک

پوش علاقے میں رہتی کیونکہ اس کے والد ایک اچھے خاصے کاروباری آدمی تھے۔ ان کی دو فیکٹریاں تھیں۔تین مرغیوں کے فارم ہاؤس تھے۔اُس دور کے حساب سے اُس کے والدین آزاد خیال تھے اور حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی

اکلوتی بیٹی کو اُنہوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ مجھ جیسے شریف اور خاندانی لڑکے سے بات چیت کی حد تک ملاقات کی جاسکتی ہے۔دیگر یہ کہ گھر کے وفادار ملازمین اِدھر اُدھر جاسوسوں کی مانند بھٹکتے دکھائی دیتے تھے جو کہ یقیناً خالدہ کے والد اور والدہ کی خاص تاکید پر ہی ایسا کر رہے تھے۔اب اُس دور میں C.C.TV کیمرے تو تھے نہیں، یہی لوگ تھے۔

مجھے بھی کسی عشق یا ہوس کے ٹٹو نے لات نہیں ماری تھی، مَیں تو خود حالات اور نظام کا مارا تھا۔M.B.B.S مکمل کرنے کے بعد ہاتھ کچھ نہیں آرہا تھا۔

”خالدہ! مَیں اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہوں۔“

”مسئلہ کیا ہے؟“ اُس نے دونوں ہاتھوں کی ٹکیاں بنا کر اپنے رخساروں کے گرد جماتے ہوئے کہا۔

مَیں نے ساری بات اُس کے گوش گزار کر دی۔”اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے سال پڑھنے کے بعد بھی میری وقعت ایک عام سے طالب علم جتنی ہی ہے۔کروں تو کیا کروں؟“

”اااا...... اگر تم کہو تو مَیں ڈیڈی سے بات کروں؟“ اُس نے معنی خیز انداز میں کہا۔مَیں نے اُس کی جانب ایک بار دیکھا ضرور لیکن مجھے اپنی ذات میں ندامت سی محسوس ہوئی۔ابا تو میرے بھی تھے۔ بھلا وہ اپنے ڈیڈی سے میرے متعلق کیوں بات کرتی، مَیں اپنے ابا سے بھی مدد مانگ سکتا تھا۔

”اب کیا سوچ رہے ہو، جمی؟“ اُس نے جمیل الدین سے مجھے جمی بنا دیا۔

”مجھے جمی مت کہو، ایسا لگتا ہے جیسے اپنے پالتو کتے کو پکار رہی ہو۔“ وہ میری بات پر زیرِ لب مسکرائی اور دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، جمیل الدین صاحب۔“ اس مرتبہ میرے مکمل نام کے ساتھ اُس نے ”صاحب“ پر کچھ زیادہ ہی زور دیتے ہوئے کہا تھا اور مَیں نے اُس کی جانب پُرشکوہ انداز میں دیکھا۔

”خالدہ، تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو نا، کیونکہ مَیں حالات کا مارا ہوا ہوں، ہے ناں؟“

”خیر، چھوڑو، بوتل پیو اور ٹھنڈے مزاج سے سوچ کر میرے سوال کا جواب ضرور دینا۔ویسے ڈیڈی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ وہ میری بات کبھی رد نہیں کریں گے۔“ اُس نے اپنے سامنے رکھی مشروب کی بوتل کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”مَیں تمہارے ڈیڈی کا احسان نہیں لینا چاہتا۔“ مَیں نے اپنے دل کی بات اُس پر عیاں کر دی۔

”اِس میں احسان والی کون سی بات ہے؟“

”احسان تو ہے!“ مَیں نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا۔لیکن اُس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

”احسان وحسان کچھ نہیں ہے، یہ تمہارا حق ہے۔اب سیدھی انگلی سے تو گھی نہیں نکلتا نا، تو انگلی ٹیڑھی کرنا پڑے گی۔“ اُس نے مجھے سمجھانے کے سے انداز میں کہنا شروع کیا۔”تم فکر مت کرو۔مَیں موقع دیکھ کر اپنے ڈیڈی سے بات کر لیتی ہوں۔“ اور پھر مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی۔”اب مسکراؤ ناں۔“

مَیں نے زبردستی اپنے چہرے پر غیر تاثرانہ مسکراہٹ دی۔

”مسکراؤ بھی یار، ایسا لگتا ہے کسی نامور اخبار کے فرنٹ پیج پر چیونگم کے ایڈ پر نظر آرہے ہو۔“ اس کی اس بات پر مَیں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

خالدہ نے اپنا کام کر دیا تھا۔ جو ''گیدڑ سنگی'' میرے ابا کے پاس نہ تھی، وہ خالدہ کے ڈیڈی کے پاس تھی بلکہ کچھ وافر مقدار میں دستیاب تھی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر میرا کام ہو گیا تھا۔

اتنی جلدی تو جنتر منتر اور کالا جادو کے ماہر افریقی یا بنگالی باپے بھی مسئلہ حل کرنے پر قادر نہ تھے۔ پہلے تو مجھے گھر پر فون آیا۔ شہر کے سب سے بڑے سرکاری ہسپتال سے۔ دوسری کال شہر کے سب سے بڑے نجی ہسپتال سے تھی۔ اور تیسری کال خالدہ کے ڈیڈی کی جانب سے تھی۔ ٹیلی فون چونکہ ابا ہی اُٹھایا کرتے تھے یا امی جان تو اس مرتبہ ابا نے اُٹھائی۔

''جی کون صاحب؟'' ابا نے ریسیور کان سے لگاتے ہی پوچھا۔ دوسری جانب سے کچھ بتایا گیا۔ ''اچھا! لیکن میرا بیٹا تو ڈاکٹر بننا چاہتا ہے، بھلا کسی فیکٹری سے اُس کا کیا لینا دینا؟'' دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تو ابا نے بھی ریسیور میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

''جمیل الدین، یہ کوئی خاقانی صاحب ہیں، ملک کے نامور صنعت کار ہیں، تمہیں مبارک باد دینا چاہتے ہیں۔'' اور اپنا منہ ٹیڑھا سا بنا کر جھکتے ہوئے خیالات میں گم وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ خالدہ کے ڈیڈی ہیں، میں نے کھنکارا بھرتے ہوئے سلام کے بعد اُن کا دھیمے سے شکریہ ادا کیا۔

''کوئی بات نہیں بیٹے، یہ تو میرا فرض تھا، لو اب خالدہ سے بات کرو۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے خالدہ کو فون دے دیا۔ لیکن میں سوچ میں گم ہو گیا کہ یہ سفارش کرنا اُن کے فرائض میں کیونکر شامل ہو سکتا تھا۔

''مبارک ہو۔'' خالدہ نے فون پر آتے ہی پر جوش انداز میں مجھے مبارک باد دی۔

''میں تمہارا احسان مند ہوں، خالدہ!'' میں نے اُس وقت اپنا آپ منوں بھاری محسوس کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''تمہارا بہت بہت شکریہ۔''

''بے کار ہی ہانکے جا رہے ہو۔ فون تو ڈیڈی نے اس لئے کیا تھا کہ تمہیں یاد کروا دیں کہ اب مٹھائی کھلانا مت بھولنا اور میں نے اس لئے کیا تاکہ معلوم ہو کہ ابھی بھی منہ پر چھ ہی بجے ہیں یا سوئیاں چھ سے آگے بھی بڑھی ہیں؟''

اُس کی بات سن کر میں ہنس دیا۔ ''اچھا یہ بتاؤ، کب آؤں؟''

''پہلے یہ تو فیصلہ کر لو کہ سرکاری ہسپتال میں پریکٹس کرنی ہے یا نجی ہسپتال میں۔ جوائننگ دے دو، پھر تھوڑا سا جب ڈاکٹری کی ریل گاڑی آگے بڑھنے لگے تو مٹھائی بھی کھلا دینا۔''

''اوکے، ڈن!''

''چم چم مت ڈلوانا مٹھائی میں کیونکہ ڈیڈی کو شکر کا عارضہ ہے۔'' اُس نے مجھے سنجیدگی سے تنبیہ کی۔

''نہیں ڈلواؤں گا۔'' پھر کچھ سوچتے ہوئے میں نے اُس سے سوال کیا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم میری جگہ پر ہوتیں تو سرکاری ہسپتال میں کام کرنے کو ترجیح دیتیں یا نجی ہسپتال میں؟''

دوسری جانب سے کچھ وقفے کے بعد خالدہ گویا ہوئی، غالباً وہ سوچ رہی تھی۔

''میں نجی ہسپتال میں کام کرتی۔''

''اور اس فیصلے کی وجہ کیا ہوتی؟''

''ایک تو بھیڑ کم، تجل خواری کم، صفائی والا ماحول، بیرون ممالک سے پڑھے لکھے ڈاکٹروں کے زیر سایہ مجھے زیادہ سے زیادہ جدید پیرائے پر سیکھنے کا موقع ملتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ سرکاری ہسپتالوں سے ڈھائی تین گنا زیادہ تنخواہ اور اہمیت ملتی۔''

(یہ باتیں اچھے وقتوں کی ہیں ورنہ نجی ہسپتالوں میں اب بلیک میلنگ کی جاتی ہے اور کم از کم تنخواہ دی جاتی ہے جبکہ سرکاری محکموں میں اب بہتر حالات ہیں۔)

''تو تم چاہتی ہو کہ میں اپنا کیریئر نجی ہسپتال سے شروع کروں!'' میں نے دانستہ بات اُس کے

www.urdusoftbooks.com

کورٹ میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"میری مرضی تھوڑا ہی ہے، تم نے پوچھا سو میں نے کہہ دیا۔"

"اچھا!؟! کیا واقعی؟" اس مرتبہ میں نے اُسے کریدتے ہوئے شرارت بھرے انداز میں کہا تھا جسے وہ بخوبی سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ شرما جائے گی لیکن اس کے برعکس وہ چڑ کر بولی۔

"ہاں تو اور کیا؟ جس میں تمہاری خوشی، جمی"

"مجھے جمی مت کہو" میں چڑ کر بولا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ ایسا سن کر اپنا آپ پر بھونکنے کو دل کرتا ہے۔" میں نے مصنوعی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا ورنہ مجھے اُس کے منہ سے اپنے لئے جمی کا لفظ اتنا بھی برا نہیں لگتا تھا، بس، ہمارے کلچر میں ایسے خطاب رائج نہیں تھے۔ یہ کہتے ہوئے وہ مجھے زہر لگتی تھی۔

"اوہ سوری، میرا مطلب تھا۔۔۔ جمیل الدین صاحب"

"یہ صاحب بھی ہٹاؤ!" میں نے احتجاجاً کیا۔

"جمیل الدین!" وہ ہنس کر بولی۔

"بائی دی وے، جمیل سے کام نہیں چلا سکتیں، کیا؟"

"میں چاہتی ہوں، جمیل کہ تم ایک کامیاب انسان بن کر مجھے دکھاؤ۔ بس!"

"بہت بھوگس ڈائیلاگ ہے۔ اکثر فلموں میں ماں کا کردار ادا کرنے والی اداکارائیں بولتی ہیں۔ تم میری ماں تو نہیں ہو۔" میری بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ پھر بولی:

"اب کام پر فوکس کرو، باتیں بعد میں۔ اور ہاں مٹھائی میں چم چم نہ ہوں کیونکہ۔۔۔"

"۔۔۔ تمہارے ڈیڈی کو شکر کا عارضہ ہے، یاد رکھوں گا۔" میں نے اُس کی بات اُچک کر مکمل کر دی۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا چلا گیا۔ میں نے خالدہ کے مشورے اور اُس کی بات میں وزن ہونے کی بنا پر نجی اسپتال سے ہی آغاز کیا۔ اور اس دوران اپنی تعلیم آگے جاری رکھی۔ چار سال جرمنی میں بیتائے۔ وہاں سے گردہ و مثانہ کی مہارت حاصل کی اور واپس اُسی نجی ہسپتال میں بحیثیت ماہر گردہ و مثانہ کے اپنی پریکٹس کا از سرنو آغاز کیا۔

لیکن فرق یہ تھا کہ پہلے میں ایک عام ڈاکٹر تھا اور اب مخصوص شعبے کا انچارج بھی تھا اور بہت سے ڈاکٹروں کا اُستاد بھی۔ گویا اب میں اپنے شعبے کا ایک طبی ماہر تھا اور دیگر ڈاکٹرز میری رائے کے طلبگار اور محتاج تھے۔ وہ میرے آگے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے اور کان کھڑے کر کے میری بات کو دھیان سے سنتے اور یہی نہیں بلکہ مجھے بھی اپنی حیثیت کا حقیقی معنوں میں اب ادراک ہو چلا تھا۔

گردہ و مثانہ کے شعبے میں تحقیق کرنے کی وجہ یہ بنی تھی کہ ابا کو شکر کے عارضے نے آلیا تھا جس وجہ سے اُن کے گردوں میں خطرناک سوزش پیدا ہو گئی۔ ریٹارمنٹ کے بعد وہ کافی عرصہ علیل رہے اور پھر ایک دن وہ ان کوچے گلیوں کو چھوڑ کر تنہائیوں بھرے، ابدی نیند والے سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے واپس کوئی نہیں آتا۔

کافی عرصہ تک ابا کی یادوں نے مجھے اپنے کام سے روکے رکھا تھا۔ نہ کپڑوں کا ہوش تھا اور نہ ہی اپنی بڑھی شیو کا۔ عجیب مجنونانہ سا ہو گیا تھا، میں۔ میری حالت ایسی تھی جیسی ناصر کاظمی نے کہہ ڈالی تھی۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے

وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا، میں باہر جاؤں کس کے لئے

سرکاری ملازمت سے انیسویں درجے پر ابا ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ امی جان کو پینشن مل رہی تھی۔ آفیسر گریڈ میں پینشن ہمیشہ سے اعلیٰ رہی ہے، ورنہ نچلے درجے کے لوگ تو فقط چار دن کا خرچ بنام پینشن وصول کرتے ہیں۔

خیر، اس سے قطع نظر خالدہ سے فون پر بات چیت رہتی تھی۔ اس کے والدین کا اصرار تھا کہ مَیں اب خالدہ سے تمام عمر کے لئے منسلک ہو جاؤں۔ بات تو ہم میں کب کی ایک خاموش سمجھوتے کے طور پر طے ہو چکی تھی، بس! ٹھیک اور مناسب وقت کا انتظار تھا، سو وہ وقت اب آن پہنچا تھا۔

ہماری شادی ہوگئی۔

خالدہ بھی ڈاکٹر تھی لیکن اُس نے ناک، کان اور گلا کے امراض میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ ہم دونوں شادی کے بعد بھی ایک دوسرے سے زیادہ عرصہ دور ہی رہتے تھے۔ دراصل ساری بات فرائض منصبی ادا کرنے کے اوقات کے تفاوت کی وجہ سے تھی۔

اُس کی نائٹ ڈیوٹی تو میری دن کو، اُس کی دن کو تو میری رات بھر میں۔ ویک اینڈز میں کہیں اتفاقاً ایسا ہوتا کہ ہم دونوں کو آپس میں فراغت کے لمحات مل پاتے، اُن لمحات کو بھی امی جان کے ساتھ تینوں گھومنے پھرنے نکل جاتے اور خوب اچھا سا کھانا کسی فائیو اسٹار ہوٹل یا کلب میں کھاتے۔ زندگی محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

اور پھر ایک دن ہمارے ہسپتال کے ڈین کا تبادلہ ہوا اور دوسرا ڈین ہسپتال کا ایڈمنسٹریٹر بن کر یہاں تعینات کیا گیا۔ اُس کا نام ظہیر الدین تھا۔ ڈاکٹرز کی فہرست میں اُسے مَیں کچھ زیادہ ہی بھا گیا تھا۔ جس کا اُس نے پہلی ملاقات میں مجھ سے ذکر بھی کیا۔

''ڈاکٹر جمیل الدین، آپ کا نام تو میرے نام سے مماثلت رکھتا ہے لیکن اب آپ کا کام بھی مماثلت رکھے تو بات بنے۔''

''جی شکریہ، سر۔ لیکن مَیں کچھ سمجھا نہیں۔ کیا میرے کام میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟''

اُس نے میری بات سن کر اپنی آرام دہ کرسی پر ٹیک لگا کر کہا۔ ''کام تو سپرب ہے۔ لیکن یوں کام کرتے کرتے تو کام کا وقت نکل جائے گا۔'' اُس نے دونوں آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''نہیں، ابھی بھی آپ کی بات نہیں سمجھا، سر'' اب میرے ماتھے پر پریشانی کی سلوٹیں نمایاں ہو چکی تھیں۔

''بھئی، زندگی ایک بار ملتی ہے، بار بار نہیں ملتی اور یہ بات ایک ڈاکٹر تو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔''

''جی بالکل صحیح کہا آپ نے، سر''

''تو پھر کچھ چینج لایئے، اپنے اندر کے انسان میں، اپنی سوچ میں، اپنے لائف اسٹائل میں۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حالانکہ مَیں ابھی بھی اس کی باتوں میں چھپی بات تک نہیں پہنچ پایا تھا۔

''جی ضرور، سر!'' مَیں نے ایک گول مول جواب دیا۔

''دیکھیے اکیسویں صدی کا آغاز ہو چکا۔ چند روز ہی گزرے ہیں، لیکن ہماری سوچ وہیں پرانی ہوئی ہے۔ فرض کیا، ڈیوٹی پر گئے، واپس لوٹے، لگی بندھی پر شکر کر لیا، یہ سوچ رکھتے ہوئے کہ اوپر والا بڑا مہربان ہے، آج نہیں تو کل خواہشات ضرور پوری ہو جائیں گی اور ویسے بھی کتابی محاورہ ہے کہ روم ایک دن میں تو تعمیر نہیں ہوا تھا تو یوں اس کہاوت کو سچا تسلیم کرتے ہوئے ہم جیسے بدھو بھی اپنی تمام تر زندگی روم کی تعمیر پر بِتا دیتے ہیں، لیکن ذرا غور فرمایئے جمیل الدین صاحب! کہ انسان نے ایک آلہ بنایا، جسے کمپیوٹر کہتے ہیں، یہ آلہ انسان ہی استعمال کر رہے ہیں اور اس آلے کا مقصد تو یہ تھا کہ ہر کام ایک معمول کے مطابق، منظم طریق سے بروقت کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے اور نہ صرف مکمل ہو بلکہ شمار میں بھی آ جائے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ یہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ ہمارے یہاں پر یہ آلہ اب انسان کو استعمال کر رہا ہے۔'' پھر اُس نے اپنی آرام کرسی سے کھڑے ہو کر میری جان پیٹھ کرتے ہوئے، بڑے سے روزن کے سامنے باہر کھلے میدان کی جانب دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''ہم نے اپنے نیچے والوں کو ابھی تک غلامی میں رکھا ہوا ہے۔ جو ہم کریں گے، یہ لوگ وہی کریں گے۔''

''سر، نظام ہی ایسا ہے! اور پھر اُنہیں اِسی کام کی تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔''مَیں ابھی بھی اُس کی سوچ تک رسائی نہیں کر سکا تھا۔

''اِسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ قدیم دقیانوسی انداز کو اپنائے ہوئے ہیں، اب تھوڑی جدیدیت پیدا کیجئے۔''اُس نے مڑتے ہوئے میری جانب مسکرا کر کہا۔

''اور یہ جدیدیت کیسے پیدا کی جا سکتی ہے، سر؟''مَیں نے براہِ راست سوال کر دیا۔

''لیجیے، پھر مَیں آپ کو سمجھاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر ہم میں اگلے دو گھنٹے تک طویل بات چیت ہوئی۔

☆......☆......☆

خاقانی صاحب میرے محسن ہی نہ تھے بلکہ اب میرے سسر بھی تھے۔ اُن کی صحت اِس وقت بھی قابلِ رشک تھی حالانکہ وہ شکر کے عارضہ کے دائمی مریض تھے اور وہ بھی ''قسمِ دوم'' کی شکر کے لیکن پھر بھی اُنہوں نے اور میری ساس صاحبہ نے اس عمر کی بڑھتی رفتار کے ساتھ ساتھ اپنے مرض پر خوب قابو رکھا ہوا تھا۔

آج اُن کی دعوت تھی۔ ہمارے گھر پر بحیثیت مہمانانِ خصوصی وہ مدعو تھے۔ لیکن مَیں نہ جانے کیوں سارا وقت بوجھل بوجھل سا بیٹھا رہا تھا، شاید اکیسویں صدی کا لیکچر جو نئے ڈین نے مجھے دو گھنٹے کی طویل ملاقات میں دیا تھا میری روح کو مکمل طور سے ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔ میرے بجھے بجھے رویئے کو خاقانی صاحب نے بھی محسوس کیا تھا اور باتوں ہی کے دوران مجھ سے شکوہ بھی کیا تھا لیکن میں نے دانستہ بات آئی گئی کر دی تھی۔ مَیں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے گھر میں دفتری معاملات کو زیرِ بحث لاؤں بلکہ کوئی بھی ایسا نہیں چاہتا۔

اسی لئے جب سب مہمان رخصت ہوئے اور امی جان بھی آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں تو بستر پر دراز ہو کر مَیں چھت کی جانب خاموشی سے گھورتے ہوئے لیٹا رہا۔ ویک اینڈ تھا اور خالدہ کا ساتھ میسر تھا۔ ورنہ عام دنوں میں وہ نائٹ ڈیوٹی کیا کرتی تھی۔

''آپ کچھ نارمل والے جمیل نہیں تھے، آج!''

آخر کار اُس نے بھی مجھ سے شکوہ کر ہی ڈالا تھا اور مَیں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بات کا آغاز کرے۔

''خالدہ!۔۔۔'' مَیں نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے کہا۔''اگر مَیں نوکری چھوڑ دوں تو تمہیں کیسا لگے گا؟'' وہ میرے ساتھ لیٹتے ہوئے یکدم چونک کر میری جانب دیکھی تھی۔ شاید اُسے میری بات عجیب سی لگی ہو۔

''آخر پرابلم کیا ہے اِس نوکری میں؟'' اُس نے میرے بڑے کمبل میں گھستے ہوئے اور اپنے اوپر اوڑھتے ہوئے پوچھا۔

''خالدہ۔۔۔اسپتال میں نیا ڈین آ گیا ہے۔''

''تو آپ کو اِس سے کیا فرق پڑتا ہے؟۔۔۔وہ آیا ہے، اپنے لئے اور آپ کو اِس سے کیا، آپ وہاں سے جانے کی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔''

''تم سچ کہتی ہو، وہ اپنے لئے ہی آیا ہے۔'' مَیں نے چھت کی جانب سوچتے ہوئے، گھورتے ہوئے کہا۔

''چلیں ایزی ہو کر میرے ساتھ کھل کر بات کریں، اس طرح تو آپ کی بات مجھے سمجھ میں نہیں آ سکتی۔''

''تم نے آج مجھے یہ نہیں کہا کہ منہ پر چھ کیوں بجا رکھے ہیں مَیں نے؟''مَیں نے اُس کی جانب کروٹ لے کر اُسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے پوچھا۔

''اُس کی ضرورت نہیں، یہ ٹائم آپ کے منہ پر اکثر نظر آتا رہتا ہے، اب مجھے عادت سی ہو گئی ہے۔'' اُس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ لیا تھا۔''چلیں ذرا جلدی سے اُس نئے آنے والے ڈین کی سنایئے کہ اُس کا آنا آپ کو کیونکر گراں گزر رہا ہے۔''

''وہ چاہتا ہے کہ مَیں اُس کی ٹیم کا حصہ بن جاؤں۔''

"لیجیے، یہ تو احمقانہ بات ہے، ہر ڈاکٹر اُسی کی ٹیم کا حصہ ہے۔ اس میں چاہنے یا نہ چاہنے والی کون سی بات ہے؟"

میں نے اُس کو اپنی بانہوں سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

"دراصل وہ چاہتا ہے کہ میں ڈاکٹری کے مقدس پیشے پر کلنک لگا دوں۔ وہ کروں جو ایک ڈاکٹر کے شایانِ شان نہیں۔"

وہ اب بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ میری جانب حیرت سے گھورتے ہوئے مخاطب ہوئی۔ "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی؟ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"دیکھو خالدہ، ہم دونوں کا پیشہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم مرض کی تشخیص کے بعد اُس کے علاج یا مرض پر ایک خاص حد تک قابو پانے کی کوشش کریں، اُسی مطابق مریض کو مؤثر ادوائیات دیں۔" میں نے پھر اُس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کیوں! ایسا ہی ہے ناں؟"

اُس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ "ہاں ایسا ہی ہے۔"

"لیکن اُس ڈین کا کہنا یہ ہے کہ ہم کمپنیوں سے معاہدہ کریں گے، اور جو کمپنیاں ہمیں کچھ دیں گی تو ہم بھی اُنہیں کمپنیوں کی ادوائیات اپنے مریضوں کو تجویز کریں گے۔ چاہے ادوائیات مؤثر ہوں یا نہ ہوں۔"

"لیکن یہ تو سراسر رشوت ہے اور اپنے پیشے سے غداری بھی۔" اس نے حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ جواب دیا۔

"اگر میں ایسا نہیں کروں گا تو وہ میرا جینا مرنا دوبھر کر دے گا۔ اور تمہیں معلوم ہے خالدہ! کہ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔" میری بات سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

"پلیز، خالدہ۔۔۔ میرا مقصد تمہیں ہرگز ٹھیس پہنچانے کا نہیں تھا، میں تو صرف تم سے مشورہ مانگ رہا ہوں۔ باقی جو تم کہو گی اور جیسا تم چاہو گی۔"

اُس نے اس مرتبہ مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ اُس کے جسم کے گداز حصوں سے مس کرتے ہوئے مجھے اپنا آپ ہلکا پھلکا سا لگا تھا۔ وہ میری حوا تھی اور میں اُس کا آدم۔ ہماری سیدھی سادی خوبصورت سی بسی بسائی جنت میں جانے کہاں سے شیطان گھس آیا تھا۔ وہ میرے کاندھے کو سہلاتے ہوئے بولی:۔

"میں سوچتی ہوں جمیل، کیا یہ ہے اکیسویں صدی؟ جس کا انتظار انسانوں نے کیا تھا کہ ایک نمایاں تبدیلی آجائے گی۔ انسانی ذہنی خلفشار دور ہوں گے۔ پریشانیوں میں کمی آجائے گی۔ انسان ترقی کرے گا۔ انسانیت کے امور والے فلاحی کاموں میں اضافہ ہوگا۔ زندگی جنگ و جدل اور برائیوں کے عزائم سے پاک ہوگی۔ ایسی فضا ہوگی جس میں ہر آنے والی نئی روح ایک طمانیت اور فخر محسوس کرے گی اور اپنے خالق کا شکر بجالائے گی جس نے اُسے اِس صدی میں پیدا کیا۔ میں سوچتی ہوں کہ یہ سوہانے خواب دکھلائے تھے، اُن دجل وفریب کے کاریگروں نے جو اپنے آپ کو نئی دنیا کا حکم سمجھتے ہیں۔ اور ہم نے ان لوگوں کو اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جو لوگ ازل کی بھوک کے مارے، رزق اور انسانی خون و جسم میں فرق نہیں سمجھتے۔ واہ جمیل واہ۔۔۔ یہ ہے اکیسویں صدی جس کے آغاز پر دنیا بھر میں ایسا جشن منایا گیا تھا کہ جیسے دُنیا کے تمام مسائل حل ہونے کو جا رہے ہیں۔"

میں اُس کی باتوں کو غور سے سنتا رہا تھا، کیونکہ وہ اکیسویں صدی کے ان نئے کارناموں کو اپنے دکھ بھرے انداز میں ٹھیک ہی تو بتا رہی تھی۔

"اور ہاں ایک بات یہ بھی تھی، خالدہ۔۔۔ ڈین چاہتا ہے کہ میں پرچیز کمیٹی (Purchase Committee) میں شامل ہو کر جاؤں اور کل خریداری میں اُس کا 7% اور اپنا 5% حصہ رکھتے ہوئے بل بنواؤں اور ہسپتال کے لئے خریداری کروں۔"

''لیکن یہ تو سرکاری ہسپتالوں میں حکومتی فنڈز کا غبن کرنے کی غرض سے وہاں کے بڑے ڈاکٹرز ایسا کرتے ہیں، آپ کے نجی ہسپتال کو اس سے کیا فائدہ ہو گا؟ یہ تو سراسر اُن کا نقصان ہوگا۔'' اُس نے پریشانی میں سوچتے ہوئے دریافت کیا۔

''انکم ٹیکس کم دینا پڑے گا اور دیگر فوائد بھی ہیں۔'' مَیں نے مختصراً کہا۔ ''ہسپتال کے مالک کا وہ داماد بھی ہے۔''

''تو یہ بات ہے!۔۔۔'' اُس نے طنزیہ جملہ کہا ''نئی صدی، نئے لوگ، نئی سوچ، نیا آغاز۔''

''ہاں ایسا ہی ہے لیکن تم مجھے کیا مشورہ دو گی؟''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں ڈیڈی سے اس بات کا ذکر کرنا چاہئے۔''

''کمال ہے، خالدہ۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔'' مَیں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''کیا مطلب ہے کہ کیا سوچیں گے؟'' اُس نے مجھے اپنی بانہوں کی قید سے آزادی بخشتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا اور اس بات کو کرتے ہوئے وہ سنجیدہ تھی۔

''مطلب ۔۔۔ اگر تمہیں یاد ہو کہ مجھے اس مقام تک پہنچانے میں بھی تو تمہارے اُن سے بات کرنے کا عمل دخل رہا ہے تو کہیں وہ۔۔۔'' مَیں نے دانستہ اپنا جملہ مکمل نہیں کیا تھا۔

''جمیل، پلیز ۔۔۔ یہ کامیابیاں آپ کی ہی تھیں۔ آپ کا حق جو نہیں دے رہے تھے، اُن سے دلوا کر آپ کو دے دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مَیں جاننا چاہتی ہوں کہ ڈیڈی کے پاس اس کا توڑ کیا ہے۔''

''اوہ اچھا یہ بات ہے تو ٹھیک ہے لیکن ۔۔۔'' مَیں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا نہیں خیال کہ ہمیں یہ باتیں اب ڈیڈی سے کرنی چاہئیں کیونکہ اب ہم بھی نہ تو بچے ہیں اور نہ ہی اتنے غیر سمجھدار کہ بار بار ممی ڈیڈی کو پکارتے رہیں۔ مَیں اس لئے کہہ رہا تھا کہ ڈیڈی بھی پھر کیا سوچیں گے؟''

''مَیں کہہ رہی ہوں ناں کہ وہ ایسا کچھ نہیں سوچیں گے، اس وقت فی الحال آپ کو اور مجھے نیند کے متعلق سوچنا چاہئے، باقی کے معاملات مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ میں جانوں ڈیڈی جانیں اور ہمارا کام۔''

مَیں نے مسکراتے ہوئے اُس کی جانب دیکھا اور دھیمے سے ''تھینک یو'' کہہ کر کروٹ بدل لی۔

''کوئی ناراضگی ہے کیا؟'' میرے عقب سے اُس کی آواز سنائی دی اور جب مَیں نے اُس کی جانب کروٹ لی تو اُس نے مجھے زور سے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

اُس کی بانہوں میں آ کر مَیں اپنے سارے جھمیلے بھول گیا تھا۔

☆......☆......☆

خالدہ کے ڈیڈی نے میرے ٹرانسفر پوسٹنگ کے آرڈرز جاری کروا دیئے تھے۔ دوسرے شہر لیکن جڑواں شہر میں مجھے ترقی دلوا دی تھی اور یہی نہیں بلکہ ایک نئے عالیشان بنگلے میں بھی ہمیں شفٹ کروا دیا تھا جو اُنہوں نے اپنی بیٹی خالدہ کو تحفے میں دیا تھا۔

جب ہم تینوں نئے بنگلے میں آئے تو خالدہ کے ڈیڈی نے جبراً ہم سے اپنی دعوت کروائی۔ وہ زندہ دل انسان ہیں۔ صنعت کار بھی ہیں اور اب تک ایک مصروف زندگی گزار رہے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے لئے بھی اس نئی اسکیم میں بنگلہ خرید لیا ہے اور اپنی اہلیہ سمیت یہاں منتقل ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہمسایہ ہیں۔ اُن کی اکلوتی اولاد اگر خالدہ ہے تو اُن کا داماد اور بیٹا مَیں بھی ہوں۔ دعوت میں جب امی جان، خالدہ اور اُس کی ممی قدرے فاصلے سے آپس میں بات چیت اور خوش گپیوں میں مصروف تھیں تو مَیں نے اُن سے سوال کیا،

''انکل، ایک بات بتایئے کہ ہم کس شعبے میں محفوظ ہیں۔''

حالیہ واقعات کے تناظر میں وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ اُنہوں نے کافی کی چسکی بھرتے

ہوئے پوچھا۔

"تمہارا مطلب یہ کہ کرپشن سے؟"

"جی ایگزیکٹ لی!" مَیں نے جواب دیا۔

"بیٹا مَیں ایک صنعت کار ہوں۔ اس میدان میں پرانا کھلاڑی ہوں۔ اور جب سے اس میدان میں ہوں تو تب سے مَیں اپنا ہر کام نکلوانے کے لئے دانہ ڈالتا آیا ہوں۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ میرے کہنے کا کیا مطلب ہے؟"

"جی!۔۔۔" مَیں نے مختصراً جواب دیا۔ پھر مَیں نے کچھ سوچتے ہوئے اُن سے پوچھا۔ "اور اگر کوئی دانہ نہ ڈالے تو؟"

"تو پھر کوے کا کیا بنے گا؟" اُنہوں نے میری آنکھوں میں نہایت رعب دار انداز میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"لیکن انکل، جب مَیں جرمنی میں تھا تو وہاں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ سب ایک نظام کے تحت حکومت اور سرکاری مشینری کے قابو میں تھا اور۔۔۔" میری بات کاٹتے ہوئے وہ بولے۔

"روم میں وہی کرو، جو رومی کرتے ہیں۔" پھر وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولے۔ "اور ویسے بھی تم ہنس کی مثال دے رہے ہو۔ یہاں تو کوّے زیادہ ہیں اور ہنس کم۔ کوا، کوا ہی رہے تو بہتر ورنہ سیانے کیا کہتے ہیں، کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا!"

"کیا یہ نظام بدل سکتا ہے؟" مَیں نے دوٹوک سوال کر دیا۔

"نظام ایک قوم بدلتی ہے۔ نظام کو ایک بھیڑ، ہجوم، اختلافی سوچ رکھنے والے لوگ نہیں بدلتے۔ بلکہ آبشار کی بہتی دھارا کے ساتھ خود بھی بہہ جاتے ہیں، کیونکہ یہی بات اُن کی نظر میں اور ہر دیکھنے والے کی نظر میں آسان ہے۔ لیکن اہل نظر یہ کہتے آئے ہیں کہ نظام ایک سوچ کے زیرِ نگیں رہتے ہوئے بدلا جاتا ہے، مختلف افکار رکھنے والے تو شاید عمر بھر اپنا آپ بدلنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے۔"

"آپ نے آج تک کتنوں کو رشوت دی ہے؟" سوال احمقانہ سا تھا لیکن مَیں نے کر دیا۔

"سرکاری محکموں میں تو ہر ہر قدم پر اور نجی کام میں بعض جگہ اور بعض جگہ بالکل بھی نہیں۔" اُنہوں نے کچھ لگی بندھی رکھے بغیر جواب سے مجھے نواز دیا۔

"انکل، میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اس نظام میں شاید۔۔۔"

"Miss fit ہوں۔۔۔" اُنہوں نے میری بات مکمل کرتے ہوئے کہا تو مَیں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "ہاں تو صحیح ہے، تم واقعی مس فٹ ہو۔ بلکہ تم جیسے اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو پردیس میں ہیں اور جو لوگ یہاں آئے ہیں اور انہوں نے کوئی مقام حاصل کیا ہے تو شرائط کے ساتھ۔ ورنہ وہ بھی یہاں نہ ٹھہرتے۔"

"کیا یہ خوفناک بات نہیں کہ ملک کی اصل انسانی دولت ضائع ہو رہی ہے؟" مَیں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"خوفناک بات ہی نہیں بلکہ انتہائی خطرناک بات بھی ہے۔ کالا دھن جس معیشت میں عام ہو جائے، اُس کی دھجیاں اُڑ جاتی ہیں، بیٹا ایسوں کا تو، نام بھی نہیں رہتا نام والوں میں۔"

وہ تو اپنی بات روانی میں کہہ گئے تھے لیکن مجھے ٹھنڈے پسینے آنے لگ گئے تھے کیونکہ مجھے اپنے وطن سے شدید پیار رہا تھا اور اب بھی ہے۔ کیونکہ یہ وطن میرا آبائی گھر ہے۔ مجھے ان کی بات سن کر یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے ایک زلزلہ آیا، 8 اکتوبر 2005 والے زلزلے سے بھی شدید زلزلہ اور وہ سب کچھ اور سب کو زمین بوس و مسمار کرتے ہوئے نکل گیا۔

انکل نے یہ کیا کہہ ڈالا تھا۔

"ایسوں کا تو بیٹا نام بھی نہیں رہتا نام والوں میں!"



خونی نمبر

فاطمہ خان۔علی پور مظفر گڑھ

خوبرو حسینہ کے ہاتھوں سے اچانک موبائل نیچے گر پڑا تو حسینہ خوف کی وجہ سے گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی اور پھر اس کے سامنے ایک آتما نمودار ہوئی جسے دیکھ کر حسینہ کی......

جسم وجاں میں خوف کی لہر دوڑاتی اور آنکھوں کو پتھرا دینے والی دہشت ناک روداد

''چھ سال ہوگئے اس اخبار میں کام کرتے ہوئے مجال ہے کہ ایک دن بھی باس ہمارے کام سے خوش ہو، اور بھول کے بھی تھوڑی بہت ترقی دی ہو۔'' کرن نے ایک بھاری فائل جانوی کی ٹیبل پر پٹختے ہوئے کہا۔

''جانوی اور کرن کو صحافت میں آئے ہوئے کم وبیش چھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اتفاق سے وہ بہت اچھے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے خواب بھی ایک ساتھ ہی دیکھنے لگے تھے مگر کرن کا کہنا تھا کہ جب تک وہ ایک گھسے پٹے صحافی سے تھوڑا اوپر ترقی نہیں کرلیتا تب تک جانوی سے شادی نہیں کرے گا۔ جانوی جس حال میں تھی خوش تھی۔ اس نے اونچے اونچے خواب کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔ مگر کرن کی اس ضد کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ بخوبی

جانتی تھی کہ وہ دونوں معمولی صحافی ہیں اوراب اس سے زیادہ اونچا رتبہ ان کے مقدر میں نہیں ہے مگر کرن ہواؤں میں اڑنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ ایک مشہور صحافی اور تجربہ کار بن جائے دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے اوراب یہ اس کا جنون بن گیا تھا۔

کرن کا اس طرح باس کو کوسنا معمول تھا لہٰذا جانوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کرن یار چھوڑو تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنا باس کبھی کسی کے کام سے خوش نہیں ہوتا تو پھر تم کیوں کڑھتے رہتے ہو، چلو دفع کرو ان سب باتوں کو، آج آف ہونے کے بعد اچھی سی کافی پیتے ہیں ساتھ، کافی دن ہوگئے ایک ساتھ جی بھر کر گھومے بھی نہیں ہیں۔“ کرن کی ڈھارس صرف جانوی ہی باندھتی تھی اوراس کے موڈ کو بھی وہ ہی خوشگوار کرنا جانتی تھی۔ لہٰذا کرن اکتاہٹ بھرے چہرے پر ایک مسکراہٹ لے آیا اور یوں اٹھا۔ ”چلو ٹھیک ہے چلتے ہیں آج آفس کے آف ہونے کے بعد۔“

چند لمحوں بعد ہی وہ کافی شاپ میں مزیدار کافی سے لطف اندوز ہورہے تھے ٹھنڈ کے موسم میں گرم گرم کافی نے ان کے موڈ کو تروتازہ کردیا تھا۔ اتنے میں کرن کا فون بج اٹھا۔ اس نے دیکھا تو اس کا دوست ارجن تھا۔

”ہاں ارجن بول۔“ فون اٹھانے کے بعد وہ گویا ہوا۔

”اوہ بھگوان کیا بول رہا ہے تو؟“ کرن کے چہرے پر حیرت، خوشی اور پرجوشی کے تاثرات تھے۔

”چل سب ٹھیک ہے کل پھر ملتے ہیں۔“ کرن نے یہ کہہ کر فون بند کردیا تو جانوی بول اٹھی۔ ”کیا کہہ رہا تھا؟“

کرن پرجوش انداز میں گویا ہوا۔ ”جانوی! ارجن بتارہا تھا کہ ایک افواہ بہت مشہور ہورہی ہے اور مختلف اخباروں کے صحافی اس کے متعلق ٹھوس معلومات اکٹھی کررہے ہیں، یقیناً اس کے بعد وہ آرٹیکل لکھیں گے لیکن اگر میں سب سے پہلے سے معلومات اکٹھی کرکے آرٹیکل لکھ دوں تو شاید بوڑھا باس خوش ہوجائے اور پھر ترقی کے بعد بھی چانس ہیں کیونکہ لوگ ایسی ہی پراسرار خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔“

جانوی نا سمجھنے والے انداز میں بولی۔ ”ارے کرن پہلے یہ تو بتاؤ کہ خبر ہے کیا؟“

”جانوی خبر یہ ہے کہ سننے میں آیا ہے ایک رانگ نمبر سے لوگوں کے موبائل پر کال آتی ہے جو کوئی فون اٹھالیتا ہے تو ایک آتما اسے مار دیتی ہے۔“ کرن نے پراسرار لہجے میں کہا۔

یہ سننا ہی تھا کہ جانوی کی ہنسی نکل پڑی۔ اس نے زور زور سے ہنسنا شروع کردیا اور بولی۔ ”کرن اس ٹیکنالوجی کے جدید دور میں اور ایک پڑھے لکھے صحافی ہوتے ہوئے بھی تم یہ آتما واتما پر یقین کرتے ہو، تھوڑا ہوش کرو اگر اس قسم کا کوئی آرٹیکل لکھا بھی تو باس ہم دونوں کو دھکے مار کر نکال دے گا نوکری سے پھر کچھ بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔“

کرن غصے میں لال پیلا ہوگیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اگر تم میرا ساتھ نہیں دینا چاہتی تو نہ دو اور دور رہو مجھ سے...... نہ خود کبھی ترقی کروگی اور نہ ہی کبھی مجھے ترقی کرنے دوگی، آئندہ بات کرنے کی جرات نہ کرنا مجھ سے۔“ کرن غصے سے تقریباً چلاتے ہوئے گویا ہوا۔

جانوی سب کچھ برداشت کرسکتی تھی مگر کرن کا غصہ کبھی نہیں، وہ بوکھلاہٹ میں بولی۔ ”نہیں کرن میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی تم جو کہوگے میں کروں گی بلکہ میں تمہاری مدد بھی کروں گی یہ آرٹیکل لکھنے میں، بس تم مجھ سے ناراض مت ہو۔“ جانوی کے اس طرح گڑگڑانے پر کرن بول اٹھا۔ ”ٹھیک ہے کل صبح ارجن سے ملنا ہے میں تمہیں پک کرنے آجاؤں گا تم تیار رہنا۔“

اگلی صبح وہ ارجن کے ساتھ ایک کافی شاپ میں موجود تھے۔ ارجن ان کو سب کچھ بتاچکا تھا۔ وہ کرن کا مخلص دوست تھا اور ہمیشہ کرن کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا، اسی لئے اس نے کرن کی اس قدر مدد کی کہ خونی رانگ نمبر کا بھی سراغ لگالیا تھا۔

☆......☆......☆

www.urdusoftbooks.com

اس خونی رانگ نمبر کے بارے میں مشہور تھا کہ جس کسی نے بھی کال ریسیو کی تو وہ آتما کا شکار بن گیا۔

بریک ٹائم میں جانوی اور کرن ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ کرن بولا۔ ''جانوی مجھے لگتا ہے کہ اپنے آرٹیکل کو تھوڑا اور مزیدار بنانا چاہئے ہوسکتا ہے یہ کسی انسان کا کام ہو۔ تم نے کہا تھا کہ آتما پر کوئی یقین نہیں کرتا۔''

''ہاں بالکل میں نے کہا تھا۔'' جانوی نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ کرن بول اٹھا۔ ''اس نمبر پر کال کرتا ہوں۔''

جانوی اچھل پڑی۔ ''نہیں کرن! پتہ نہیں کیا راز ہے اس نمبر کا کچھ بھی ہوسکتا ہے ہمیں بس آرٹیکل لکھنا چاہئے۔ کال وال چھوڑو۔'' جانوی نے ڈرتے ہوئے کہا۔ کرن جھنجلا کر بولا۔ ''جانوی میں جو کہتا ہوں وہ درست ہوتا ہے خاموش رہو تم، اور مجھے کال کرنے دو۔'' یہ کہہ کر کرن نے اپنا موبائل اٹھالیا۔ ''اوہ شٹ! میں لوڈ کروانا تو بھول ہی گیا خالی ہے موبائل میرا۔'' کرن جھنجلا کر بولا۔ جانوی کرن کے ہر مسئلے میں دل و جان سے مدد کرتی آتی تھی۔ بولی۔ ''یہ لو میرا موبائل اس میں بیلنس بھی ہے اور پیکیج بھی۔''

کرن نے جھٹ جانوی کا موبائل لے لیا۔

☆......☆......☆

نمبر ڈائل کر کے کرن نے کال کی تو آگے سے مکمل خاموشی طاری رہی۔ پندرہ بیس منٹ گزر جانے کے بعد بھی مکمل خاموشی رہی۔ کرن نے کال کاٹ دی اور بولا۔ ''ایک اور مذاق اب کیا آرٹیکل لکھنا ہے اس نمبر پر جس پر کال تک نہیں جاتی۔''

جانوی مکمل خاموش رہی، آفس کے بعد کرن نے اسے گھر ڈراپ کر دیا۔

گھر پہنچ کر جانوری نے اپنا موبائل ٹیبل پر رکھ دیا اور نہانے چلی گئی۔ جب لوٹی تو اس نے اپنا موبائل بجتے ہوئے پایا۔ فون اٹھانے پر۔

حقیقت

☆لوگوں کے مکانوں کی دیواریں اتنی بلند ہوگئی ہیں کہ مساجد کے مینار میری نگاہ کی رسائیوں سے باہر نکل گئے ہیں۔

☆آزادی کی مشعل قربانی کے خون سے جلتی ہے۔

☆دکھ بے بسی کا دوسرا نام ہے۔

☆حیا سوچ کا لباس ہے۔

☆تھکن فنا کی طرف اشارہ ہے۔

☆انسان کی قیمت اس کا کام ہے۔

☆خود غرضی، اتحاد کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

☆زندگی اوروں کے لئے جینے کا نام ہے۔

☆محبت کے بول پتھروں کو جواب پر مجبور کردیتے ہیں۔

☆سب کچھ پالینا ہی کامیابی نہیں، کبھی ناکامی بھی کامیاب کردیتی ہے۔

☆سماجی مقام بدلنے سے رشتے تبدیل نہیں ہوتے۔

(مہر پرویز احمد ودلو۔میاں چنوں)

اس کے موبائل پر ایک نمبر آویزاں تھا۔ اس نے کال کاٹ دی۔

جانوی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر کرے تو کیا کرے۔ موبائل ایک بار پھر بج اٹھا اور اب کی بار بھی وہی رانگ نمبر اس کے موبائل کی اسکرین پر نمایاں نظر آرہا تھا۔

جانوی کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر نیچے پر پڑا۔ مگر موبائل اب بھی بدستور بج رہا تھا۔ کافی دیر بعد موبائل خاموش ہوا تو جانوی نے ڈرتے ڈرتے موبائل

اٹھایا اور کرن کو کال کی، کرن نے جلد ہی کال ریسیو کرلی تو جانوی بوکھلاہٹ میں بول اٹھی۔ ”کرن مجھے بچالو وہی رنگ...... وہی رانگ نمبر میرے موبائل پر بار بار آرہا ہے۔ مجھے بہت خوف آرہا ہے۔ کرن پلیز! جلدی آجاؤ۔ کرن پلیز۔“

کرن پریشان سا ہوگیا اور بولا۔ ”میں ابھی آرہا ہوں جانوی تم پریشان نہ ہو میں ابھی آرہا ہوں۔“

جانوی نے موبائل واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کے حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے۔ سردی کے باوجود بھی اس کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ اس نے ٹیبل پر سے پانی کا جگ اٹھایا تو وہ خالی تھا، وہ کچن کی طرف مڑ گئی۔ پانی کا گلاس اس نے ایک ہی سانس میں پی لیا۔

جانوی اور کرن کا کوئی رشتے دار نہ تھا، وہ دونوں ہی تنہا رہے تھے۔ والدین نہ جانے کب حادثے میں گزر گئے تھے۔ جانوی کے اور کرن کو ایک دور دراز کے رشتہ دار نے پالا تھا جو کب کا مر چکا تھا۔

زندگی میں پہلی بار جانوی کو اپنے گھر کی تنہائی سے خوف آیا تھا۔ وہ خوف سے تقریباً کانپ رہی تھی۔ کچن سے جب وہ واپس لوٹی تو ایک مرتبہ پھر اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے دیکھا تو وہی رانگ نمبر بج رہا تھا۔ جانوی نے غصے اور ڈر کے ملے جلے جذبات میں فون دیوار پر دے مارا تو اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ مگر یہ کیا چند ہی لمحوں میں موبائل فون دوبارہ مکمل تھا۔ اور ایک مرتبہ پھر بج اٹھا۔

☆......☆......☆

جانوی کو اب یقین ہوگیا تھا کہ یہ ضرور کسی آتما کا چکر ہے۔

موبائل فون کی مسلسل بجتی ہوئی رنگ ٹون اسے وحشت زدہ کیے جارہی تھی اور پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ کال ریسیو کرے گی۔

بھرپور جرأت اور بہادری سے اس نے کال ریسیو کرلی۔ اس نے اپنے موبائل سے چند دلخراش چیخیں سنیں، پچھتانے میں اس نے بالکل دیر نہ لگائی۔

کیونکہ یہ جانوی کی اپنی چیخنے کی آوازیں تھیں جو اسے موبائل سے آرہی تھیں۔ موبائل اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑا اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔

چند ہی لمحوں میں اس نے سیاہ لباس میں ملبوس ایک آتما کو اپنے سامنے دیکھا جس کے لمبے نوکیلے دانت کسی ڈریکولا سے مشابہت رکھتے تھے جانوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ بھاگ جائے۔

آتما اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی۔ اس کے لمبے نوکیلے دانت منہ پر صاف نظر آرہے تھے حلقوں میں آنکھوں کا نام ونشان تک نہ تھا اور رخسار ایسے جیسے کسی نے سارا گوشت نوچ لیا ہو۔

خونی آتما جانوی پر پل پڑی۔

کرن دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو خون میں لت پت جانوی تڑپ رہی تھی کیونکہ جانوی آتما کا شکار بن چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد کرن تڑپتی ہوئی جانوی کو جلد از جلد اسپتال لے گیا مگر تب تک جانوی زندگی کی بازی ہار چکی تھی۔ پوسٹ مارٹم کے بعد تصدیق ہوگئی تھی کہ کسی درندہ نے اپنے نوکیلے دانتوں اور پنجوں سے جانوی کی گردن کو بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد جانوی کی لاش کرن کو دے دی گئی تھی اور اس نے اس کی آخری رسومات ادا کردی تھیں۔

کرن نے جانوی کی موت کے بعد صحافت کا کام چھوڑ دیا تھا اور مزدوری کرنے لگا تھا۔ وہ جانوی کی موت کا ذمہ دار خود کو ہی سمجھ رہا تھا۔ ایک جانوی ہی تھی جو اس دنیا میں اس کا واحد سہارا تھی اب وہ بھی اس کے پاس نہ رہی تھی۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا اور جانوی کو یاد کرتا رہتا۔ اس کی زندگی ایک چلتی پھرتی لاش کے علاوہ کچھ نہ تھی۔



پُراسرار مخلوق

ایس امتیاز احمد۔کراچی

منفی سوچ رکھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ کسی بھی جانور کو عام جانور سمجھتے ہوئے اس پر سختی نہ کریں کیونکہ ہوسکتا ہے وہ جانور کوئی اور نادیدہ مخلوق ہو جو کہ......

ایک حقیقی کہانی جس میں پڑھنے والوں کے لئے خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ سبق بھی سبق ہے

یہ کہانی اس واقعہ سے متعلق ہے جو گزشتہ سال گرمیوں کے مہینے میں ہمارے ساتھ پیش آیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں جب ہم کزنز اپنے آبائی گاؤں نور پور گئے تھے۔ جہاں ہمارے پردادا، دادی کا بہت بڑا مکان ہے، دراصل وہ شہر کی ہنگامہ پرور اور گرد آلود فضاؤں میں رہنے کی بجائے گاؤں کی سرسبز و تر و تازہ فضا اور ماحول میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اسی لئے تایا جان اور ابو کے بے حد اصرار کے باوجود وہ شہر میں ہماری بڑی سی کوٹھی میں آکر شہر کی آلودہ فضاؤں میں بیمار ہونا نہیں چاہتے، یہی وجہ ہے کہ سو برس کی عمر کے باوجود وہ دونوں ابھی تک صحت مند اور چاق وچوبند ہیں چونکہ نور پور پنجاب کا ایک دور دراز مگر انتہائی سرسبز علاقہ ہے لہٰذا ہم سب ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے نور پور آتے ہیں لیکن گزشتہ سال

نور پور میں پیش آنے والے واقعہ نے ہم سب کزنز کو بے حد خوف زدہ کردیا۔ بالخصوص مجھ سے چھوٹا فرحان جو مزاجاً چلبلا ہوا کرتا تھا اس واقعہ کی وجہ سے پورا سال گزرنے کے باوجود اب تک سہما ہوا رہتا ہے۔

دراصل واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہر سال کی طرح گزشتہ سال بھی نویں جماعت کے امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد ہم سب کزنز یعنی میرے تایا ریاض احمد اور میرے ابو بشیر احمد شہر میں ایک ہی کوٹھی میں اوپر نیچے کے پورشن میں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ رہائش پذیر ہیں اور ہمارا لیدر گارمنٹس کا کاروبار بھی ساتھ ہی ہے۔ چونکہ تائی جان اور امی آپس میں بہنیں بھی ہیں اس لئے دونوں خاندانوں میں مثالی محبت اور یگانگت ہے جس کے باعث ہم سب کزنز ایک ہی گھر میں بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ تایا جان کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں جبکہ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ یعنی تین بھائی اور ایک بہن۔

بہرحال فائنل ایگزامز سے فارغ ہوتے ہی ہم سب کزنز چھوٹے ماموں جو ابھی کالج میں زیر تعلیم ہیں، کے ساتھ نور پور گاؤں روانہ ہوئے چونکہ گاڑی ڈرائیور چلا رہا تھا اس لئے ہم سب ماموں کے ساتھ بیٹھے سفر کو انجوائے کرتے ہوئے آپس میں گپیں لڑاتے ہوئے جا رہے تھے۔ تینوں لڑکیاں یعنی میری بہن شمع اور تایا زاد کی ثناء اور روشنی پچھلی سیٹوں پر اپنی باتوں میں مگن تھیں۔ ہم سب پہلے اسکول کے قصوں میں اتنے مگن تھے کہ سفر کٹنے کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ جب نور پور گاؤں کی حدود میں گاڑی داخل ہوئی تو ڈرائیور نے ہی ہمیں سرسبز لہلاتے کھیتوں کی جانب متوجہ کیا۔ صاف ستھری پکی سڑک کے دونوں اطراف گندم کی فصل لہلہا رہی تھی اور بیچ پگڈنڈی نما سڑک سے ہماری گاڑی گزر رہی تھی۔ تب ہی ڈرائیور کے کہنے پر ہم سب بے ساختہ کھڑکیوں کی جانب لپکے اور پردے ہٹا کر باہر کے خوب صورت سرسبز نظارے کی دلکشی میں محو ہوگئے تھے۔ گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ سنہری بالیوں کے ڈھیر جیسے سورج کی روشنی میں سونے کی طرح دمک رہے تھے۔ حالانکہ یہ اور ایسے بے شمار دلکش مناظر ہمارے لئے نئے نہیں تھے لیکن قدرت کے ان دلکش فطری مناظر میں کچھ ایسی کشش ہے کہ جتنی بار دیکھو یہ منظر آنکھوں کو بھلے اور دل کو تازگی بخشتے ہیں۔ جیسے صاف ستھری آلودگی سے پاک دھلی شفاف فضاؤں سے روح تر اور شفاف ہوجائے۔

بہرحال ڈرائیور کافی تیز رفتاری سے آگے کا سفر طے کر رہا تھا کیونکہ دوپہر سر پر تھی اور ہم سب کو بھوک بھی لگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم نور پور گاؤں کے داخلی پھاٹک پر پہنچ چکے تھے۔ وہاں رک کر ماموں نے حلوائی کی دکان سے ڈھیر ساری مٹھائی اور دادی کی پسندیدہ مٹھائی رس ملائی خریدی تھیں۔ پھر گاڑی آگے روانہ ہوگئی۔

اگلے آدھے گھنٹے کے بعد ہم ناریل، کیلے، امرود، آم اور چیکو کے سرسبز درختوں میں گھرے بڑے سے باغ کے درمیان بنے سرخ اینٹوں کے بڑے مکان کے سامنے موجود تھے۔ ڈرائیور کے برآمدے میں گاڑی پارک کرتے ہی گھریلو ملازمین نے آ کر گاڑی سے سامان اتارنا شروع کیا اور ہم سب نے اندر کی جانب دوڑ لگادی۔ جہاں دادا، دادی اور گھر کے سب سے پرانے ملازم سلیم چاچا بے چینی سے ہم سب کی آمد کے منتظر تھے۔ ہم سب بڑے ہال میں پہنچے تو ساڑھے چھ فٹ کے لمبے چوڑے دادا اور لحیم شحیم دادی نے ہم سب کو اپنی آغوش میں سمیٹ کر ڈھیروں پیار کیا۔ جبکہ ملازمین ہماری آمد پہلے ہی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ تب دادی جان نے ہم سب کو مخاطب کرکے کہا۔

''چلو بچو! پہلے تم لوگ نہا دھو کر تازہ دم ہوجاؤ۔ پھر سب مل کر بڑے ہال میں کھانا کھائیں گے۔'' دادی کا با آواز بلند فرمان جاری ہوتے ہی سب کے فرمائشی پروگرام شروع ہوگئے۔ سب سے پہلے مجھ سے چھوٹا فرحان بولا۔

"دادی میں نے گڑ والے چاول کھانے ہیں۔" لہٰذا فرحان کو دیکھ کر ذیشان اور عمر بھی پیچھے نہیں رہے۔

"اور دادی ہمیں کھانے میں آم کی میٹھی چٹنی بھی کھانی ہے......"

ذیشان اور عمر کی اسی معصومیت پر میں اور ماموں جی کھول کر ہنسے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد بڑے ہال میں گاؤں کے روایتی کھانوں سے اٹھتی اشتہار انگیز خوشبوؤں نے سب کی بھوک بڑھادی تھی اور کچھ ضرورت سے زیادہ کھالینے کے باعث سب ہی قیلولہ کی غرض سے سونے مشترکہ کمرے میں آرام کے لئے چلے آئے جبکہ لڑکیاں بھری دوپہر میں اپنی دلچسپ سرگرمی یعنی آم اور پیپل کے گھنے درخت پر ڈالے گئے جھولوں پر جھولنے چل دی تھیں۔

شام کو پانچ بجے منہ ہاتھ دھوکر ہم سارے لڑکے ماموں کے ساتھ دادی اور دادا سے اجازت لے کر گاؤں کی نہر کی جانب چل پڑے تھے۔ جہاں ہماری ذاتی زمینیں ہیں چونکہ فصلوں کو پانی دیا جا چکا تھا اس لئے نہر میں پانی زیادہ نہیں تھا مگر ماموں کے منع کرنے پر ہم لڑکوں نے نہر میں نہانے سے گریز کیا۔ البتہ کھیتوں میں لگے ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پانی سے سب خوب لطف اندوز ہوئے۔ وہاں موج مستی کرتے ہوئے وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا اور ساڑھے چھ بجے ملگجا سرمئی اندھیرا پھیلتے ہی اردگرد کے گھروں سے دہکتے تندوروں میں پکتی روٹیوں کی سوندھی سوندھی مہک اور کھلی فضاء کی ٹھنڈک کے باعث ہلکی خنکی نے ہم سب کو گھر کی جانب چلنے پر مجبور کردیا۔ لہٰذا ماموں نے ہم سب لڑکوں کو بلا کے اکٹھا کیا، پھر پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ ابھی ہم گھر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر تھے کہ وہاں موجود ایک اندھے کنویں کے پاس ایک کالی بلی کو بیٹھے دیکھا۔ اس بلی کی آنکھیں بڑی عجیب سی تھیں، جیسے کسی جانور کی نہیں بلکہ انسان کی بولتی آنکھیں ہوں۔ میں نے بڑے غور سے رک کر اس بلی کو دیکھا تھا اور ماموں کو بھی بتایا تھا لیکن جواباً ماموں بولے۔

"دیکھو کاشان! یہ گاؤں ہے اور یہاں اب بھی پرانے زمانے کی توہم پرستی کے واقعات کو مانا جاتا ہے۔ بڑے بزرگ کہتے ہیں کالی بلی کا راستہ کاٹ جانا اچھا نہیں ہوتا۔ اس لئے بلی سے کوئی چھیڑ چھاڑ کئے بغیر چپ چاپ یہاں سے نکل چلو۔ فرحان کے مزاج کو تم جانتے ہو، کہیں اس کی کسی شرارت سے ہم سب کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔"

ابھی ماموں نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی کہ فرحان نے زمین سے پتھر اٹھا کے کنویں کے پاس بیٹھی کالی بلی کو مارا جو عین بلی کی داہنی آنکھ پر جا کے لگا اور وہ زور کی غراہٹ کے ساتھ وہاں سے بھاگ گئی۔ اس سے پہلے کہ ماموں، فرحان کی اس حرکت پر سرزنش کرتے بلی کی خوف ناک غراہٹ سے سب نے وہاں سے دوڑ لگادی۔

گھر پہنچ کر ہم سب راستے کے اس معمولی سے واقعہ کو بھول بھی چکے تھے کیوں کہ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آگے جا کر یہ معمولی سا واقعہ ہمارے لئے بہت بڑی سبق آموز کہانی بن جائے گا۔

چونکہ گاؤں میں لوگ جلدی سو جاتے ہیں اور سویرے اٹھ بھی جلد جاتے ہیں۔ اس لئے مغرب کے بعد ہی سلیم چاچا نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی تھی، لہٰذا ہم سب معمول کے مطابق ہاتھ منہ دھو کر بڑے ہال میں پہنچ گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب کی مشترکہ فرمائش تھی کہ آج دادی جان سے کوئی پرانے زمانے کا خوف ناک قصہ یا کہانی سنیں گے۔ لہٰذا سب نے اندر کمروں میں سونے سے انکار کردیا تھا اور کچھ اس روز فضا میں حبس بھی تھا، لہٰذا ملازم سے کہہ کر ہم سب کے لئے گھر کے کھلے دالان میں چارپائیاں بچھادی گئی تھیں۔ ہم سب دالان میں پاس پاس چارپائیوں پر بیٹھے دادی کے عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے منتظر تھے حالانکہ وہ روز ہی ہمیں باقاعدگی سے پانچوں وقت نماز پڑھنے کی تلقین کرتی تھیں۔ فجر

میں باقاعدہ سر پر کھڑے ہو کر سب کو نماز کیلئے اٹھاتی تھیں جن میں سے میں اور ماموں ہی بمشکل اٹھ کر نماز پڑھتے تھے پھر دوبارہ لمبی تان کے سو جاتے تھے۔

بہرحال تھوڑی دیر بعد چکن کے سفید براق سوٹ میں دادی اپنی مخصوص لاٹھی ہاتھ میں تھامے چلی آئیں۔ تو سب نے مشترکہ ”دادی کہانی سنائیں۔“ کا نعرہ بلند کیا۔ جواباً دادی اپنے پرنور چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئیں جبکہ کچھ فاصلے پر اپنے پلنگ پر بیٹھے دادا گرم حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ ہماری فرمائش سن کر دادی سے مخاطب ہو کر بولے۔

”سنو بھاگوان! کوئی سچ مچ کی خوف ناک کہانی سنا کر بچوں کو پریشان مت کر دینا۔ بس اپنے اور میرے بچپن کا کوئی واقعہ سنا دو۔ ورنہ رات کا وقت ہے، بچے ڈر جائیں گے۔“ جانے دادا جان کی سرزنش میں کیا بات تھی کہ مجھے لگا انہوں نے دانستہ دادی جان کو کسی خاص بات سے روکا ہو کیونکہ دادی نے جواب دیئے بغیر بس ہاتھ سے اشارہ کیا تھا اور دادا سمجھ گئے تھے اس لئے پھر سے اپنے مشغلے میں مگن ہو گئے۔

پھر دادی نے واقعی اپنے بچپن کا واقعہ سنانا شروع کیا جب وہ اپنے پھلوں کے باغ میں بھری دوپہری میں گھوما کرتے تھے اور کچے امرود اور کیریاں توڑا کرتے تھے۔ ابھی وہ ایسا ہی ایک واقعہ سنا رہی تھیں کہ میری نظر دالان کی منڈیر پر بیٹھی کالی بلی پر پڑی۔

چاند کی روشنی میں وہ بلی مجھے صاف نظر آ رہی تھی اور بغور دیکھنے پر میں چونکا بلکہ اچھل پڑا تھا۔ یہ وہی بلی تھی جو آج نہر سے واپسی پر راستے میں کنویں کے پاس موجود تھی اور جسے فرحان نے پتھر مارا تھا۔ اس بلی کی آنکھ سے ابھی تک سرخ سرخ خون بہہ رہا تھا جسے دیکھ کر بے اختیار خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے ساتھ بیٹھے ماموں کو کہنی مار کے دیوار کی منڈیر پر بیٹھی کالی بلی کی جانب اشارہ کیا تب ماموں بھی بری طرح چونکے کیونکہ میری طرح انہوں نے بھی اس کالی بلی میں غیر معمولی پراسراریت محسوس کی تھی۔

دراصل وہ کالی بلی مسلسل دیوار سے ٹیک لگائے فرحان کو گھور رہی تھی اور تب ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ فرحان نے ہی اس بلی کو پتھر مار کے زخمی کیا تھا۔

”کہیں یہ بلی فرحان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“

میرے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا تھا اس لئے میں نے فوراً سے پیشتر سب کو مخاطب کر کے کہا۔

”بہت رات ہو گئی ہے، مجھے تو اس کھلے آسمان کے نیچے سردی لگ رہی ہے، چلو ہم سب اندر چل کے سوتے ہیں۔“

میرے یہ کہنے پر دادی کے بائیں گھٹنے پر سر رکھے ذیشان اور عمر نے منہ بسور کے مجھے دیکھا۔ وہ قصہ بیچ میں ادھورا چھوڑ کر وہاں سے اٹھنے کے لئے تیار نہ تھے اور فرحان بھی ان کا ہمنوا بن گیا تھا لیکن میرے اصرار پر بے اختیار دادی نے سامنے دیوار کی منڈیر کی جانب دیکھا تھا اور اچنبھے میں رہ گئیں شاید انہوں نے کچھ محسوس کیا تھا۔ ورنہ ہم نے کالی بلی کی وہاں موجودگی کے بارے میں دادی کو نہیں بتایا تھا مگر جانے کیسے انہیں پتہ چل گیا تھا؟ اور انہوں نے بھی میری بات کی تائید کی تھی۔ البتہ ان سب کی ضد کی وجہ سے مجھے اور ماموں کو بھی اس رات وہیں چارپائیوں پر سونا پڑا تھا لیکن میری چھٹی حس خطرے کا الارم دے رہی تھی اس لئے میں نے ذیشان، عمر اور فرحان کی ضد کی وجہ سے بالخصوص فرحان کو دادی کے ساتھ ان کے بڑے سے پلنگ پر سونے کے لئے کہا تھا۔ وہ تیرہ برس کا تھا اور چونکہ سب گھر بھر کا لاڈلہ بھی تھا اس لئے جانے کیوں مجھے اس کی حفاظت کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

جانے اس کالی بلی کی آنکھوں میں کیسی وحشت تھی کہ میں ڈر گیا تھا۔ میں توہم پرستی پر یقین نہیں رکھتا لیکن بڑا بھائی ہونے کی حیثیت سے قدرتی طور پر فطری لگاؤ اور محبت کے باعث میرے دل میں فرحان کی فکر بڑھ گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے فرحان

نے اس کالی بلی کو پتھر مار کے اچھا نہیں کیا۔ جیسے وہ کالی بلی حقیقت میں جانور نہیں کوئی اور مخلوق ہو، کیونکہ جس وقت فرحان نے اس کالی بلی کو پتھر مارا تھا جب اسے اب تک اگر وہ بلی عام جانور تھی تو اس کا خون خشک ہوجانا چاہئے تھا مگر بلی کی آنکھ سے اب بھی تازہ خون ٹپک رہا تھا جس کے باعث مجھے خوف کے ساتھ ساتھ کسی انہونی کا بھی ڈر تھا۔ بہرحال دادی کے چونک کر دیوار کی منڈیر کی جانب دیکھنے اور پھر خاموشی اختیار کرلینے پر مجھے بھی اچنبھا ہوا تھا۔ دادی نے بلی کو دیکھ کر انجانے پن کر تاثر کیوں دیا؟

اگر بلی ہمیں نظر آرہی تھی تو انہیں بھی نظر آئی ہوگی پھر انہوں نے اسے نظر انداز کیوں کیا؟ حالانکہ بلی کی جانب دیکھ کر ان کی آنکھوں میں اچانک اچنبھے کے ساتھ فکرمندی بھی امنڈ آئی تھی۔ ان کی خاموشی پر میں نے دانستہ فرحان کو دادی کے ساتھ سونے کی تاکید کی تھی۔ تب جاکر مجھے اطمینان ہوا تھا۔ جانے کیوں؟ مجھے یقین تھا کہ دادی کی موجودگی میں وہ کالی بلی فرحان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔

بہرحال تھوڑی دیر بعد ہم سب گہری نیند میں چلے گئے، شاید کوئی رات تین بجے کا وقت ہوگا تب اچانک پیاس لگنے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا اور ماموں کا پلنگ ساتھ ساتھ بچھا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری نظر بے ساختہ دادی کے پلنگ پر گئی تھی اور وہاں ان کو نہ پاکر میں بے اختیار اپنے پلنگ سے چھلانگ لگا کے اترا۔ فرحان کو قریب سے صحیح سلامت دیکھ کر میری جان میں جان آئی تو میں دادی کی تلاش میں آگے بڑھا اور تب میری آنکھیں خوف اور حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جب میں نے دادی کو سامنے صحن کی دیوار کے پاس کھڑے دیکھا۔ میں میکانکی انداز میں چلتا ہوا ان کے پاس پہنچا تو وہ کالی بلی سے کہہ رہی تھیں۔

”یہ تیری آنکھ کو کیا ہوا؟ تیرے زخم سے تو خون بہہ رہا ہے کہ کہیں کسی شرارتی بچے نے تو نہیں مارا۔ دیکھ تو اس کو معاف کردینا۔ معصوم بچے فرشتے ہوتے ہیں۔ انہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہئے۔ پھر تجھے ضرورت کیا ہے، ادھر ادھر گھومنے کی۔ آ میں تیرا زخم صاف کردوں۔“

دادی اس کالی بلی سے باتیں کررہی تھیں جیسے کسی انسان سے باتیں کررہی ہوں۔ میری خوف سے گھگھی بندھ چکی تھی کیونکہ آناً فاناً دادی نے دونوں بازو پھیلا کے اس کالی بلی کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا تھا۔ پھر وہیں بیٹھ کر اس کا زخم صاف کرنے لگیں۔ ساتھ ہی اس سے باتیں بھی کرتی جارہی تھیں۔ میں وہیں کھڑا سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دادی

گوہر آبدار

اللہ تعالیٰ کی عبادت رات کے پہلے حصے میں پھول اور پچھلے حصے میں پھل ہوتی ہے کیوں کہ وہ وقت ہوتا ہے جب دعاؤں کو شرف قبولیت عطا فرماتے ہیں۔

وہ بدبخت روح جس سے رب تعالیٰ نے منہ موڑ لیا ہو اب وہ خواہ جس قدر افسوس کرے اور غم میں گھلتی رہے رب تعالیٰ کو دوبارہ پانا اس کے نصیب میں نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی ان ہی کو ملتی ہے جو راتوں کو جاگ کر فکر کے ساتھ ذکر الٰہی کرتے ہیں۔

بے زاری اور بے بسی کے عالم میں ترک دنیا کوئی کمال نہیں اصل کمال تو یہ ہے کہ عیش و عشرت کی زندگی چھوڑ کر اللہ سے لو لگائی جائے۔

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

بار بار اسے ایک ہی تاکید کررہی تھیں کہ ’’دیکھو شاموا جس بچے نے بھی یہ شرارت کی ہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا اسے کیا معلوم کہ تو کون ہے؟ اور ہاں شہر سے بچے آئے ہوئے ہیں۔ جب تک وہ سب یہاں ہیں، تو یہاں مت آنا، وہ بے چارے خوف زدہ ہوجائیں گے۔‘‘

دادی اپنی بات مکمل کر کے کالی بلی کو دوبارہ دیوار کی منڈیر پر بیٹھا کے کہہ رہی تھیں۔

’’اب تو اپنے ٹھکانے پر جا۔ صبح ہونے والی ہے، کسی بچے کی آنکھ کھل گئی تو وہ طرح طرح کے سوال کریں گے۔‘‘

دادی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور جانے کہاں سے میرے اندر اتنی طاقت آ گئی تھی کہ میں الٹے پاؤں وہاں سے تیزی سے آ کر واپس اپنے پلنگ پر لیٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد واقعی صبح ہونے والی تھی کیوں کہ فجر کی نماز کے لئے دادی وضو کرنے اندر جا چکی تھیں۔ مگر میری نیند اڑ چکی تھی۔ مجھے فرحان کی فکر ستا رہی تھی کیونکہ دادی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کالی بلی (جو کہ اصل میں پراسرار مخلوق تھی) اس کو فرحان نے پتھر مار کے زخمی کیا ہے۔ تب ہی میرے دل میں خیال آیا تھا کہ مجھے دادی کو بتا دینا چاہئے کہ بلی کو فرحان نے پتھر مار کے زخمی کیا ہے۔

دراصل میرے دل میں اب بھی یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ پراسرار مخلوق فرحان کو نقصان نہ پہنچائے۔ اگرچہ دادی نے اس کالی بلی کو تاکید کی تھی کہ وہ اس انجانے بچے کو معاف کردے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے لیکن میرے دل کو بے چینی لاحق تھی۔ اس لئے صبح ہوتے ہی میں نے دادی کو جالیا۔ وہ فجر کی نماز اپنے کمرے میں پڑھ رہی تھیں ان کے فارغ ہوتے ہی میں نے ان سے سوال کر ڈالا۔

’’دادی! رات آپ اس کالی بلی سے جو باتیں کررہی تھیں وہ میں نے سن لی تھیں۔ دراصل میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس کالی بلی کو فرحان نے پتھر مار کر زخمی کیا تھا۔ پہلے میں بھی اسے عام جانور سمجھا تھا لیکن کل رات آپ کو اس سے باتیں کرتے سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کوئی عام بلی نہیں بلکہ کوئی پراسرار مخلوق ہے آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ کہیں وہ فرحان کو نقصان نہ پہنچادے۔ پلیز آپ مجھے بتائیں آخر یہ ماجرا کیا ہے؟‘‘

میرے اصرار پر مجبوراً دادی کو اس کالی بلی کی حقیقت بتانی پڑی۔

’’کاشان جسے تم بلی سمجھ رہے ہو اور جسے فرحان نے پتھر مار کے اس کی ایک آنکھ ضائع کردی ہے وہ دراصل ایک ہندو بچے کی آتما ہے۔ شہر کے پڑھے لکھے لوگ جن، بھوتوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں، لیکن یہ سچ ہے۔ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہوتے ہیں کچھ نیک اور کچھ شرارتی۔ مگر یہ ہندو بچہ ہمارے گھر کا وفادار ملازم تھا۔ میں نے ہمیشہ اسے گھر کے دوسرے بچوں کی طرح سمجھا۔ اسے ملازم سمجھ کر بدسلوکی یا تفریق نہیں کی۔ اسی لئے وہ مجھ سے زیادہ قریب تھا۔ ایک رات وہ گاؤں میں لگے میلے سے واپس آرہا تھا، راستے میں کسی چور لٹیرے نے اسے لوٹ لیا اور اس کے ہاتھ سے گھڑی چھین کر اسے زندہ کنویں میں پھینک کر فرار ہوگیا۔ جب وہ گھر واپس نہ لوٹا تو تمہارے دادا نے چاروں طرف ملازمین دوڑا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مایوس ہو کے واپس آگئے۔

تب چار دن بعد گھر سے قریب اندھے کنویں سے اس کی گلی سڑی لاش ملی۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب تمہارے ابو اور چچا بچے تھے۔ وہ ہندو بچہ ان ہی کے ساتھ پلا بڑھا تھا۔ اس کی بے بسی کی موت کا ہم سب کو بہت صدمہ تھا، بے چارہ اندھے کنویں میں دن رات زندہ پڑا جانے کب تک تڑپتا رہا ہوگا پھر جا کے بھوک پیاس اور زخموں سے چور بدن سے روح نکلی ہوگی۔ چونکہ ہندو دھرم میں دوسرے جنم کا عقیدہ پختہ ہوتا ہے اس لئے گاؤں کے سب ہی لوگوں کا اس کی ناگہانی موت پر کہنا تھا کہ یہ بچہ دوسرا جنم لے کر اپنے

قاتل سے اپنی موت کا بدلہ ضرور لے گا اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ کچھ عرصے بعد گاؤں کے پھاٹک پر ایک انجان شخص کی لاش پڑی ملی، جس کی آنکھیں کسی جانور نے پنجوں سے نکالی ہوئی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ شخص کسی دوسرے گاؤں کا چور رہ چکا تھا۔ چونکہ دوسرے جنم میں اس نے بلی کی شکل لی تھی اس لئے تب ہی اپنی موت کے کچھ عرصے بعد سے اس کالی بلی نے مستقل پھر سے اس گھر میں ڈیرا ڈال لیا جسے تم کالی بلی سمجھ رہے ہو۔

"دراصل یہ وہی ہندو بچہ ہے۔ وہ تمہیں بلی نظر آتی ہے مگر میں اسے اسی انسانی روپ میں دیکھتی ہوں جس میں وہ میرے گھر میں پلا بڑھا تھا۔ وہ صرف مجھے انسانی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ شاید میری محبت اور انسانی ہمدردی کے صلے میں قدرت کا یہ کرشمہ ہے کہ وہ سب کو ایک جانور بلی کی شکل میں دکھائی دیتا ہے لیکن میری آنکھیں اسے اپنے شامو کے روپ میں دیکھتی ہیں۔ بس یہی حقیقت ہے اس کالی بلی کی۔ لیکن فرحان کو اسے مارنا نہیں چاہئے تھا کیا ہوا جو وہ جانور کی شکل میں نظر آتا ہے پر ہے تو اللہ کی مخلوق! اور اللہ کی بے زبان مخلوق کو کبھی جان بوجھ کر تنگ نہیں کرنا چاہئے۔ کیا پتہ؟ کوئی دوسری مخلوق کے روپ میں موجود ہو۔"

تب میں نے فکرمند لہجے میں جواباً کہا تھا۔

"لیکن دادی اب فرحان کو وہ مخلوق نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔ پلیز آپ کچھ کریں مجھے فرحان کی بہت فکر ہے۔"

میری پریشان صورت دیکھ کر دادی بھی فکرمند ہوگئی تھیں اور فوراً اٹھ کر میرے ساتھ باہر دالان کی جانب دوڑی تھیں مگر شاید ہماری باتوں میں بہت دیر ہوچکی تھی۔ جب ہم وہاں دالان میں پہنچے تو فرحان دادی کے پلنگ سے غائب تھا۔ خوف سے میری چیخ نکل گئی تھی اور انجانے دکھ نے میری آنکھیں اشکبار کردی تھیں۔

میری چیخ کی آواز سے سب اٹھ گئے اور آناً فاناً فرحان کی گمشدگی کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ ہم سب اسی وقت فرحان کی تلاش میں گھر سے نکل پڑے۔ جب اندھے کنویں کے قریب جہاں پر فرحان نے کالی بلی کو بیٹھے دیکھ کر پتھر مارا تھا۔ وہیں پر فرحان بے ہوشی کی حالت میں ملا۔ جب ماموں نے اس کی پشت پکڑ کے سیدھا کیا تو ہم سب کی بے اختیار چیخیں نکل گئیں کیونکہ فرحان کی آنکھیں نکال لی گئیں تھیں اور اس کے خالی دیدوں کی جگہ گڑھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اور ماموں نے فرحان کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اسی وقت اسے لے کر گاڑی میں شہر کے اسپتال پہنچے تھے۔ ڈاکٹرز کی بروقت ٹریٹمنٹ سے فرحان کی جان تو بچ گئی تھی لیکن وہ اپنی دونوں آنکھیں گنوا بیٹھا تھا۔ وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہوچکا تھا۔ بس ایک معمولی سی شرارت نے فرحان کو ہنستی مسکراتی دنیا کو اندھیروں میں بدل دیا تھا۔ اس دکھ اور صدمے نے ہم سب کو ادھ موا کردیا تھا۔ مگر دادی نے پڑپوتے کی محبت میں اس کالی بلی کو جو حقیقت میں وہ ہندو بچہ تھا جسے اپنے ہاتھوں سے دادی نے پال پوس کے بڑا کیا تھا ہمیشہ کے لئے گھر بدر کردیا تھا اور اپنی اس سزا کے بعد وہ کالی بلی پھر کبھی اس گھر تو دور گاؤں میں بھی دکھائی نہیں دی۔ اس نے فرحان سے اس کی شرارت کا بدلہ تو لے لیا تھا لیکن دادی کی محبت وشفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

بس تب سے خاندان کے سارے بچوں نے کسی بھی بے زبان جانور کو مارنے یا تکلیف پہنچانے سے گریز کیا۔

اگرچہ فرحان کی ذات کا اتنا بڑا نقصان ہوچکا تھا مگر اس مخلوق نے اس کی جان بخش دی تھی۔ ہم سب کے لئے یہی کافی تھا۔ البتہ اس واقعہ کے بعد سے اس بلی کو سب نے پراسرار خونی بلی کے نام سے یاد رکھا۔

محبتیں شمار کرنا

محمد قاسم رحمان۔ ہری پور

حقیقت سے چشم پوشی انسان کو زندہ درگور کردیتی ھے اس لفظ کو احاطے کرتی اپنی نوعیت کی دل سے محو نہ ھونے والی برسوں یاد رھنے والی حقیقی کہانی

کیا یہ حقیقت ہے کہ عشق ومحبت میں پڑ کر انسان کہیں کا نہیں رہتا، سبق آموز کہانی

"**پاپا** آپ جانتے ہیں نہ کہ میں وکرم سے کتنا پیار کرتی ہوں اس کے باوجود آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں سوشانت سے شادی کرلوں...... کیوں کررہے ہیں آپ میرے ساتھ ایسا...... پاپا میں آپ کی بیٹی ہوں آپ کو اپنی بیٹی کی خوشی سے زیادہ اپنے اسٹیٹس کی پرواہ ہے۔" نمرتا اپنی بات مکمل کرکے رونے لگی۔

ارجن کمار، اپنی بیٹی کو دیکھنے لگے جس کی آنکھوں سے بدستور آنسو بہہ رہے تھے وہ بولے۔"بیٹا تم میری بیٹی ہی ہو اسی لئے تمہاری شادی وکرم سے نہیں کروانا چاہتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم کبھی بھی وکرم کے ساتھ خوش نہ رہ پاؤ گی...... تم جس آسودگی میں پلی بڑھی ہو وہ خوشحالی، وہ آسودگی تمہیں کبھی بھی وہ وکرم نہیں دے پائے گا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بہت کم حیثیت کا ہے میں سماج کو کیا بتاؤں گا کہ میرا داماد بیس ہزار روپے ماہوار کماتا ہے۔"

"آپ کو سماج کی پروا ہے اپنی بیٹی کی کوئی فکر نہیں ہے آپ کی بیٹی اس بیس ہزار روپے کمانے والے عام سے انسان پر مرتی ہے اسے اپنا بھگوان مانتی ہے اور آپ......" نمرتا بات کررہی رہی تھی کہ ارجن کمار زور سے دھاڑے۔

"بس کرو لڑکی تمہیں پیار کی زبان سمجھ میں نہیں آتی کیسی بے حیا ہوگئی ہو کیا تم یہ نہیں جانتی کہ تمہارے سامنے جو انسان کھڑا ہے وہ رشتے میں تمہارا باپ لگتا ہے۔"

نمرتا نے آگے بڑھ کر ارجن کمار کی کلائی پکڑلی۔"پاپا آپ ایک مرتبہ تو وکرم سے مل لیں آئی ایم شیور کہ وہ آپ کو اچھا لگے گا۔"

ارجن کمار نے غصے سے نمرتا کی طرف دیکھا اور اپنی کلائی جھٹک کر کمرے سے نکل گئے۔

نمرتا زمین پر بیٹھ گئی اب وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی اس کا دل جل رہا تھا...... روح گھائل ہورہی تھی...... نجانے کتنی دیر تک وہ اپنی اجڑتی محبت کا سوگ مناتی رہی وہ خود اندازہ نہ کرپائی لیکن جب اس کا موبائل رنگ کرنے لگا تب وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔ خود کو سنبھالتی ہوئی وہ ٹیبل تک گئی اور موبائل اٹھایا۔ اسکرین پر وکرم کا نمبر جگمگا رہا تھا نمرتا نے کال ریسو کرلی۔

"ہیلو نمرتا تم نے اپنے پاپا سے بات کی...... وہ مان گئے نا۔" دوسری طرف سے وکرم بے قراری سے پوچھ رہا تھا۔

نمرتا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا بولے۔ کیسے بولے کیسے بتائے اس کو، اپنے باپ کے سنگدلانا فیصلے کے بارے میں...... نمرتا ضبط نہ کرپائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کیا ہوا نمرتا...... تم کیوں رو رہی ہو۔ مجھے بتاؤ میں پریشان ہو رہا ہوں؟"



نمرتا روتی رہی کچھ نہ بولی۔

فارگاڈ سیک نمرتا مت رو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے تمہارے رونے سے پلیز مجھے بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ وکرم کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

”وکرم وہ پاپا میری شادی اپنے دوست کے بیٹے سوشانت سے کروانا چاہتے ہیں وہ کسی صورت میں ہم دونوں کو ایک نہیں ہونے دیں گے وکرم میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کیا کروں کدھر جاؤں میں مرجاؤں گی وکرم میں مرجاؤں گی......“ نمرتا روتے روتے بولتی چلی گئی۔

”شانت ہو جاؤ نمرتا، اور ابھی اور اسی وقت مجھ سے ملو۔“

”اوکے میں بھی تم سے ملنا چاہتی ہوں مجھے کہاں آنا ہوگا؟“

”ٹھیک ہے پھر وہیں آجاؤ اسی ہوٹل میں جہاں ہم ملے تھے۔“

☆......☆......☆

وکرم اور نمرتا ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ نمرتا کی آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور وکرم، اسے آنسو صاف کرنے کے لئے ٹشو دے رہا تھا۔

”رونا بند کرو نمرتا بس کرو کیا رونے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا؟“

نمرتا بولی۔ ”ہم لڑکیاں تو رونے کے سوا کر بھی کیا سکتی ہیں ایک عورت ازل سے قربان ہی تو ہوتی ہوئی آئی ہے۔ مردوں کی انا کی تسکین کے لئے عورت کی قربانی ہی اس دنیا کا دستور ہے خواہ وہ مرد بھائی کے روپ میں، شوہر کے روپ میں یا باپ کے روپ میں۔ ہمارے معاشرہ میں عورت کی کوئی چاہ نہیں ہوسکتی۔ میرے پاپا صرف اس لئے ہماری شادی نہیں کروانا چاہتے کہ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو کیا منہ دکھائیں گے کہ میں نے اپنی اکلوتی بیٹی ایک مڈل کلاس انسان سے بیاہ دی...... ایسے میں، وکرم تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں...... کیا مجھے رونے کا حق بھی حاصل نہیں ہے؟“

وکرم بولا۔ ”نمرتا رونا بہت آسان ہوتا ہے لیکن چیزوں کو فیس کرنا اتنا ہی مشکل...... لیکن یاد رکھو اس دنیا میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ ہو...... تم پریشان نہ ہو اپنے آپ کو پرسکون رکھو اور دماغ کو ٹھنڈا رکھ کر یہ سوچو کہ اس مسئلہ کا کیا حل نکل سکتا ہے۔ کیسے

تمہارے پاپا کو منایا جا سکتا ہے۔"

"وکرم میں پاپا کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ جب ایک بات کر دیتے ہیں تو اس پر قائم رہتے ہیں کسی صورت میں پیچھے نہیں ہٹتے۔" نمرتا نے کہا اب وہ پہلے کی بانسبت تھوڑی پرسکون تھی۔

"اگر تمہارے پاپا ایک بات کر کے اس پر قائم رہتے ہیں تو تم بھی انہی کی بیٹی ہو۔ ضد پر اڑ جاؤ وہ تمہاری بات ضرور مانیں گے۔" Lets hope for the best" وکرم نے کہا۔

لیکن وکرم میں اپنے پاپا سے بغاوت نہیں کر سکتی میں بہت پیار کرتی ہوں ان سے...... بہت چاہتی ہوں انہیں...... اپنی محبت مجھے اپنے پاپا کی شفقت سے زیادہ عزیز نہیں ہے...... آج میں ان سے آل ریڈی بہت Miss behave کر چکی ہوں اور بہت شرمندہ ہوں......" نمرتا نے کہا۔

وکرم بولا۔ "نمرتا تم اپنے پاپا سے بغاوت نہیں کر رہی ہو تمہیں ہر انسان کی طرح خوش رہنے کا پورا حق حاصل ہے اور تمہیں وہ ساری خوشیاں میں ہی دے سکتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر تمہارے پاپا ہم سے ناراض رہیں لیکن وہ بعد میں تمہیں خوش دیکھ کر مان جائیں گے کیونکہ تمہاری خوشی میں ہی ان کی خوشی ہے۔ لیکن اب اگر تم ان کے لئے سوشانت سے شادی کر لیتی ہو تو یاد رکھو تم اس کے ساتھ خوش نہ رہ پاؤ گی اور بعد میں تمہارے باپ بھی تمہاری حالت دیکھ کر جلتے کڑھتے رہیں گے۔"

نمرتا نے کہا۔ "وکرم تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... میں صرف تمہارے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہوں...... تم ہی مجھے خوش رکھ سکتے ہو۔ میں آج جا کے پاپا کو دوبارہ کونفیس کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

نمرتا بھگوان سے کبھی نراش نہیں ہونا ایشور پر اپنا یقین قائم رکھو سب اچھا ہو گا۔"

☆......☆......☆

ارجن کمار اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی پر بہت غصے تھے۔ بہت دکھ ہو رہا تھا ان کو...... ماضی یاد آ رہا تھا...... جب ان کی پتنی نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی کو ہمیشہ خوش رکھیں گے۔

ارجن کمار ایک خاندانی رئیس تھے...... ان کی شادی ان کے ماں باپ کی مرضی سے رچنا دیوی سے ہوئی تھی...... رچنا واقعی کسی دیوی سے کم نہ تھی...... اس نے ارجن کمار کی زندگی خوشیوں سے بھر دی۔

شادی کے دو سال بعد جب رچنا نے اپنے پتی کو ایک پیاری سے گڑیا کا تحفہ دیا تو اس کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ گئی...... ابھی نمرتا دو برس کی ہی تھی کہ یہ انکشاف ہوا کہ رچنا کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئی ہے...... اور کینسر تھا آخری اسٹیج پر...... رچنا کو امریکہ لے جایا گیا علاج کے لئے...... مگر شاید اوپر والے نے رچنا کی موت لکھ دی تھی...... رچنا کی موت کے بعد ارجن کمار کے ماں باپ نے ان پر شادی کے لئے بہت زور ڈالا مگر وہ نہ مانے اور یوں نمرتا ماں کے بغیر ہی پروان چڑھتی رہی۔

آج ارجن کمار کو نمرتا پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ ایک لڑکے کی خاطر اس نے اپنے باپ سے بدتمیزی کی تھی...... آفس میں بھی ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی ساری فائلز کلوز کی اور چائے پینے کے لئے قریبی ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔

ارجن کمار نے ریسٹورنٹ کا دروازہ کھولا اور سامنے کا نظارہ دیکھ کر ان کے طوطے اڑ گئے وہ حیرت زدہ رہ گئے کیونکہ سامنے نمرتا، ایک لڑکے کے ساتھ کارنر والے ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی...... تسلسل رونے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھی اور چہرہ متورم تھا...... مگر پھر بھی وہ بدستور روئے جا رہی تھی...... اس کے ساتھ والا لڑکا اسے خاموش کروانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بھی کافی پریشان نظر آ رہا تھا۔

ارجن کمار نے ایک آخری نگاہ اپنی بیٹی کے چہرے پر ڈالی اور ایک پل میں فیصلہ کر لیا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔

☆......☆......☆

تنہا جینا تو سیکھ لیا ہم نے
پر خوش کبھی نہ رہ پائیں گے
تیری دوری تو پھر بھی سہہ لیتا ہے دل
پر تیری محبت کے بغیر نہ جی پائیں گے

نمرتا اپنے کمرے میں مسلسل ٹہل رہی تھی۔ اور اپنے پاپا کے آنے کا انتظار کررہی تھی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ آج وہ انہیں منا کر ہی رہے گی...... تھوڑی دیر میں اس کا انتظار ختم ہوگیا۔ ارجن کمار کے کار کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ نمرتا نے کھڑکی سے جھانکا چوکیدار دروازہ کھول رہا تھا...... نمرتا کمرے سے باہر نکل آئی...... سامنے سے ارجن کمار آرہے تھے۔

''کیسی ہے میری پیاری سی گڑیا......'' ارجن کمار نے پیار سے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں پاپا آپ جلدی آگئے آج۔''

''ہاں جلدی آگیا ہوں ...... کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ آج ہم کچھ مہمانوں کو انوائٹ کریں کیا نام بتایا تھا تم نے اس لڑکے کا...... ہاں وکرم...... وکرم کے گھر والوں کو بلالو...... میں ان سے تمہارے رشتے کی بات کروں گا۔''

''سچ پاپا......'' نمرتا کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''جی میری جان...... تم کوئی خواہش کرو اور میں اسے پورا نہ کروں...... بھلا یہ ممکن ہے؟''

ارجن کمار نے نمرتا اور وکرم کی منگنی کی ڈیٹ فکس کردی تھی...... لیکن اب خود بہت پریشان تھے...... بیٹی کی خوشی کے لئے مان تو گئے تھے لیکن وہ اس رشتے سے مطمئن نہیں تھے۔

انہیں اپنے دوست شوریہ کھنہ کی طرف سے بھی پریشانی لاحق تھی...... کہ اب اپنے شوریہ کھنہ کو کیسے منہ دکھائیں گے۔ کیسے انہیں اپنی بیٹی کی منگنی پر بلائیں گے۔ لیکن ان سے بات تو کرنی تھی کیونکہ ان کے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ارجن کمار ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے اس بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ ان کا سیل فون رنگ کرنے لگا...... ارجن نے ٹراؤزر کی پاکٹ سے سیل فون نکالا اسکرین پر کوئی ان نون نمبر تھا۔

''ہیلو جی کون......؟''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''یار میں ہوں شوریہ کھنہ میں اپنے بیٹے کے ساتھ انڈیا آگیا ہوں...... جلدی سے ائیرپورٹ آجا...... ہمیں لینے کے لئے۔''

''کیا شوریے تم کب آئے......'' ارجن کمار کی حیرت دیدنی تھی۔

''او کے فائن میں آرہا ہوں...... تمہیں لینے کے لئے۔''

☆......☆......☆

''کیا بکواس کررہے ہو تم، ہوش میں تو ہو...... اتنے سالوں پہلے کی منگنی کو کیسے تم توڑ سکتے ہو...... تم نے ہماری برسوں پرانی دوستی کا لحاظ بھی نہ کیا۔'' شوریہ کھنہ حقیقت سن کر دنگ رہ گئے تھے اور اب اونچی آواز میں چلا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا بیٹا سوشانت بھی آیا تھا...... لیکن ان کی پتنی امریکہ سے نہ آئی تھی۔

نمرتا ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑی ساری گفتگو سن رہی تھی۔

''یار میں اپنی بیٹی کے آگے بے بس ہوگیا...... کچھ نہ کرپایا...... نمرتا اس لڑکے سے بہت محبت کرتی ہے کیسے میں اس کی محبت کو اس سے جدا کردیتا...... یار میری غلطی ہے مجھے معاف کردو......'' ارجن کمار نے اپنے دوست کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

نمرتا یہ سب نہ دیکھ پائی اور اپنے کمرے میں میں آگئی۔

''انکل آپ پلیز ہاتھ مت جوڑیں...... آپ چاہتے ہیں نہ کہ نمرتا کی شادی مجھ سے ہو...... اس کی شادی مجھ سے ہی ہوگی...... وہ بھی نمرتا کی اپنی مرضی سے...... وہ خود وکرم سے منگنی نہیں کرے گی۔'' سوشانت اب تک خاموش بیٹھا ہوا تھا۔

لیکن جب اس نے بات کی...... تو ارجن کمار اور شوریہ کھنہ حیران رہ گئے۔

"کیا مطلب......؟ یہ کیسے ممکن ہے۔" ارجن کمار نے تذبذب میں سوال کیا۔

"ممکن ہے...... اور بلیک میجک سے ممکن ہے۔" سوشانت نے کہا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کالا جادو؟"

"تم نے کالا جادو کہاں سے سیکھ لیا؟" شوریہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ریلیکس انکل اینڈ پاپا...... میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتاتا ہوں اس بارے میں۔"

☆......☆......☆

"اس روز میں بہت ہی خوش تھا۔ میری خوشی کی وجہ یہ تھی کہ میں نے قمار خانے میں جوا کھیلا تھا اور ہر بازی میں جیت میری ہی ہوتی رہی تھی۔ جب میں قمار خانے سے نکلا تو میرے پاس پانچ سو ڈالرز تھے۔ اس خوشی کو سیلبریٹ کرنے کے لئے میں ایک بار میں چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا وہ لڑکی بہت حسین تھی اس نے گرین شرٹ کے نیچے سفید پھولوں والا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بہت ہی زیادہ نشے میں تھی...... وہ لڑکی میرے پاس آگئی اور اس نے جھومتے جھومتے مجھ سے پوچھا۔"

"اے مسٹر...... کیا تم مجھے میرے اپارٹمنٹ تک ڈراپ کردو گے۔"

"ایسی حسین تتلی کی قربت کون بے وقوف نہیں چاہے گا۔" میں نے حامی بھرلی۔ اور اسے لے کر باہر اپنی کار میں آگیا...... اس نے اپنے گھر اپارٹمنٹ کا ایڈریس مجھے سمجھایا اور میں اسے ڈراپ کرنے اس کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ اس نے اپنا نام روزی بتایا تھا۔

اینی ویز جب میں اسے چھوڑ کر واپس آرہا تھا کہ اس نے ایک لفافہ میری جانب بڑھایا اور کہا کہ "تمہارا انعام ہے......" پہلے تو میں نہ مانا مگر جب اس نے فورس کیا تو مجھے ماننا پڑا۔

بعد میں جب میں نے لفافہ دیکھا تو اس میں ایک یو ایس بی تھی۔ اور ایک فولڈ ہوا کاغذ تھا...... اس کاغذ کی تحریر کچھ یوں تھی۔

"ڈیئر سوشانت تم ہرگز یہ جاننے کی کوشش نہ کرنا کہ میں کون ہوں؟ ہاں تمہیں اتنا بتادیتی ہوں کہ ہم شیطان کے چیلے ہیں۔ شیطانیت کے پیروکار ہیں...... تمہاری زندگی میں ایک موڑ ایسا آنے والا ہے کہ تمہاری شیطانیت کی ضرورت پڑے گی۔ اس یو ایس بی کو سنبھال کر رکھنا...... مستقبل میں یہ تمہارے کام آئے گی۔"

"Wish you all the best"

میں نے وہ صفحہ ایک طرف پھینک دیا اور یو ایس بی چیک کی اس میں ٹوٹکے اور عملیات تھے۔

پھر میں روزی کے اپارٹمنٹ میں گیا لیکن اب وہاں وہ اپارٹمنٹ تو کیا...... وہ بلڈنگ ہی سرے سے غائب تھی۔

"اس وقت سے یہ یو ایس بی میرے پاس ہے۔"

"تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہمیں کالے علم کے ذریعے نمرتا کے من کو بدلنا ہوگا۔" ارجن کمار نے سوال کیا۔

"ہاں انکل کیونکہ اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔ نمرتا میری محبت ہے میں اسے کسی اور کا ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ وکرم نمرتا کو کبھی خوش نہ رکھ پائے گا۔" سوشانت نے کہا۔

شوریہ کھنہ بولے۔ "لیکن یہ غلط ہے۔ کالا علم کرنا پاپ ہے اور میں تم دونوں کو یہ پاپ کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

"انکل پہلے آپ مجھے بتائیں کہ آپ کی کیا رائے ہے۔" سوشانت نے اپنے باپ کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے ارجن کمار سے پوچھا۔

وہ بولے۔ "میں تو شروع سے ہی وکرم کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ نہیں جوڑنا چاہتا تھا کیونکہ وہ

ہمارے اسٹینڈس کا نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کی خوشی کے لئے مان تو گیا کیونکہ میں نے دیکھا تھا اسے ریسٹورنٹ میں اس وکرم کے ساتھ...... اس وقت وہ زاروقطار رو رہی تھی اور مجھ سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ میں مان گیا لیکن اب پچھتا رہا ہوں......"

"اب اگر کوئی بھی راستہ ہے اس رشتے کو توڑنے کے لئے تو میں رضامند ہوں اس کے لئے...... خواہ وہ راستہ کالے جادو کا ہی کیوں نہ ہو۔"

شوریر کھنہ بولے۔"ارجن تو پاگل ہو گیا ہے اوپر والے کے شراپ سے ڈر۔"

"دیکھیں پاپا اصل بات یہ ہے کہ وکرم، صرف دولت حاصل کرنے کے لئے نمرتا سے شادی کر رہا ہے۔ نمرتا سے اسے کوئی پیار ویار نہیں ہے نمرتا کی زندگی کا سوال ہے...... اگر ہم کسی کی زندگی بچانے کے لئے کالا علم استعمال کریں تو اس میں برائی ہی کیا ہے؟"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو......" شوریر کھنہ نے کہا۔ اور تینوں اس بات کے لئے رضامند ہو گئے۔

"شیطان بھی بہت خوش ہوگا آج...... کیونکہ تین اور انسانوں کو بھٹکانے میں کامیاب تھا۔"

☆......☆......☆

کمرے کا ماحول بہت بھیانک تھا...... کمرے کے چاروں اطراف میں کالی ماں کی خوف ناک بت رکھے ہوئے تھے...... شوریر کھنہ، ارجن کمار اور سوشانت آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے آس پاس سندور سے دائرے بنا رکھے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹا سے ہون رکھا ہوا تھا جس میں آگ روشن تھی سوشانت اونچی آواز میں منتر پڑھ رہا تھا اور ہون میں کالی مرچیں ڈالتا جا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کا عمل ختم ہوا اور ہون کی آگ اپنے آپ بجھ گئی۔

سوشانت نے منتر پڑھنے بند کر دیئے اور ہون کی طرف دیکھا...... اس نے ہون میں سے ایک چٹکی راکھ نکالی اور اس راکھ کو سندور کی ڈبیا میں مکس کر دیا اور بولا۔

"اب ہمیں یہ راکھ نمرتا کے جسم کے ساتھ لگانی ہوگی...... اور اس کے بعد نمرتا وکرم سے نفرت کرنے لگے گی۔"

"ٹھیک ہے...... کشوری میری بہت ہی پرانی اور وفادار ملازمہ ہے میں یہ ڈبیا اس کو دے دیتا ہوں۔ اور یہ نمرتا کے جسم کے ساتھ لگا دے گی۔" ارجن کمار نے کہا۔

سوشانت اور شوریر کھنہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور یوں ارجن کمار نے اپنی ملازمہ سے مدد لے کر اپنے کالے کرتوتو کو مکمل کر لیا۔

☆......☆......☆

تجھ سے ہار جاؤں تو جیت جاتا ہوں
تیری خوشیاں عزیز ہیں...... اتنی

آج نمرتا اور وکرم کی سگائی تھی...... پورے گھر کو بہت ہی اچھے طریقے سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا...... وکرم بہت خوش تھا...... لیکن نمرتا کے ماں باپ کی طرح اس کی ماں گائتری دیوی بھی خوش نہ تھی...... صرف اور صرف اپنے بیٹے کی خوشی کے لئے مان گئی تھیں۔

سگائی کا وقت ہو گیا تھا...... گائتری دیوی نے ارجن کمار سے پوچھا۔

"بھائی صاحب آپ کی صاحبزادی کہاں رہ گئی کیا وہ نہیں جانتی کہ سگائی کا مہورت ہو گیا ہے۔"

"بس بہن جی تیار ہو رہی ہے...... آپ تو جانتی ہی ہیں کہ لڑکیاں ایسے موقعوں پر کتنا بجتی سنورتی ہیں تیار ہو کہ بس آنے ہی والی ہو گی۔" ارجن کمار نے کہا اور پھر اپنے آپ سے بولے۔

"ہاں بس ابھی آئے گی میری بیٹی اور تم دو ٹکے کے لوگوں کو ان کی اوقات یاد دلا دے گی۔"

گائتری دیوی نخوت سے بولی۔ "پتا نہیں ایسا کیا بجنا سنورنا ہے۔"

"آ گئی نمرتا وہ دیکھیں۔" سوشانت نے کہا

www.urdusoftbooks.com

اور سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا جہاں سے نمرتا نیچے اتر رہی تھی لیکن وہ تیار نہ تھی بالکل سمپل سے حلیے میں تھی۔

''نمرتا کیا ہوا ہے؟ تم بدلی بدلی سے دیکھائی دے رہی ہو؟'' نمرتا کے اندر کے بدلاؤ کو سب سے پہلے وکرم نے محسوس کیا۔

''اور تم تیار بھی نہیں ہوئی ہو۔ کیا تم جانتی نہیں کہ آج ہماری سگائی ہے۔ ہماری انگیجمنٹ کا فنکشن چل رہا ہے۔''

نمرتا نے کہا۔'' ہاں میری سگائی تھی...... لیکن ہے نہیں...... تھی...... مجھے کل رات اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ تمہیں مجھ سے کوئی محبت وحبت نہیں ہے بس تم صرف دولت کے حصول کے لئے مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔''

وکرم کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھر گئی۔

''نمرتا میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ میرے من میں کوئی لالچ نہیں ہے...... میں لالچی نہیں ہوں میرے من میں صرف تمہارے لئے پریم۔''

''بس ختم کرو یہ پیار کا بھاشن ...... میں نہیں سننا چاہتی تمہارے منہ سے پیار کی کوئی بات ...... اور نہ ہی میں تم جیسے دوکوڑی کے انسان سے شادی کروں گی دفعہ ہوجاؤ یہاں سے گیٹ آؤٹ فرام مائی ہاؤس۔''

نمرتا زور سے چلائی۔

''بس بہت سن لی میں نے بےعزتی۔'' گائتری نے کہا۔

''ارے میں تو تجھ جیسی آوارہ اور دو نمبر کی لڑکی کو اپنی بہو بنانا ہی نہیں چاہتی تھی جو آئے دن نت نئے لڑکے پھانس لے...... ارے میں تو صرف اپنے بیٹے کی خوشی کے لئے مان گئی ورنہ......''

''ایک منٹ...... آپ کی ہمت کیسے ہوئی میری بیٹی کو آوارہ اور دو نمبر کہنے کی۔''

گائتری نے کہا۔'' اب دو نمبر اور آوارہ لڑکی کو میں دو نمبر اور آوارہ نہ کہوں تو کیا اسے میں شریف لڑکی کہوں...... ارے اس لڑکی نے میرے بیٹے کو پھانسا ہے۔''

''یوشٹ اپ۔'' ارجن کمار دھاڑے تھے۔

''میری بیٹی نے آپ کے بیٹے کو نہیں پھانسا بلکہ آپ کے بیٹے نے میری بیٹی پر ڈورے ڈالے ہیں ارے اس وکرم نے دولت حاصل کرنے کے لئے شارٹ کٹ راستہ چنا ہے۔''

''بس بہت ہوگیا۔'' وکرم نے کہا۔

''نمرتا تم نے مجھے بےعزت کیا...... وہ تو میں برداشت کر ہی لیتا مگر اب تمہارا باپ میری ماں کو ذلیل کرر ہا ہے...... اور یہ میں برداشت نہیں کرسکتا...... آج سے میرا تمہارا رشتہ ختم...... ہاں یہ سچ ہے کہ میں اپنے دل سے تمہاری محبت نہیں نکال سکتا...... لیکن محبت عزت سے زیادہ ضروری نہیں ہوتی۔'' گڈ بائے۔

سوشانت ایک طرف کھڑا سارا تماشہ دیکھ رہا تھا...... منگنی کینسل ہوگئی...... لوگ واپس چلے گئے۔

سوشانت دل ہی دل میں اپنی جیت کا جشن منانے لگا۔

زندگی تیرے بن ادھوری ہے
نجانے کیوں تیرے میرے بیچ یہ دوری ہے
سوچتا ہوں کبھی خود کو مٹادوں
پر تجھ سے کیا ہوا وعدہ نبھانا بھی ضروری ہے

وکرم کی ہوتی ہوئی سگائی ٹوٹ گئی تھی...... وہ خود بھی ٹوٹ کر بکھر گیا تھا...... اس نے نمرتا کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا...... نمرتا سے مل کر اس نے محبت کے مفہوم کو جانا اور سمجھا تھا...... لیکن پتا ہی نہ چلا کہ کب وہ محبت کی دیوی اس ظالم زمانے کی آواز میں بولنے لگی...... پتا ہی نہ چلا کہ وہ نمرتا جو وکرم کے دل میں بستی تھی اب وکرم کی محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے لگی۔

وکرم سوچ سوچ کر پاگل ہوتا جارہا تھا...... نمرتا ایسی تو نہ تھی...... اچانک اسے کیا ہوگیا تھا...... کیا اس کے باپ نے اسے ایسا کرنے پر پریشرائز کیا ہے۔

نہیں یہ ممکن نہیں ...... کیونکہ نمرتا کے کسی بھی انداز میں اداکاری کا شائبہ تک نہ تھا۔

وکرم کو نمرتا کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی کہ کیسے نمرتا نے اسے ذلیل کیا یہ بات تو وہ نمرتا کی محبت میں برداشت کرلیتا لیکن وہ یہ بات برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی ماں کی ذلت ہوئی تھی...... اتنے زیادہ لوگوں کے سامنے نمرتا کے باپ ارجن کمار نے اس کی ماں کے ساتھ بحث کی تھی۔

اب وکرم کو ایک بار پھر یہ باتیں یاد آنے لگی تو اس کا خون کھولنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔

''نمرتا کو اس بات پر غرور ہے نہ کہ میں اس پر مرتا ہو...... اس کے بغیر جی نہیں سکتا...... ہاں یہ سچ بھی ہے...... لیکن میں اس سچائی کو اب تبدیل کروں گا۔ نمرتا اور اس باپ ارجن کمار پر یہ بات ثابت کروں گا کہ میری نمرتا سے محبت انہیں میری ماں کو ذلیل کرنے کا وارنٹ نہیں دیتی۔''

وکرم اسی وقت اٹھا اور گائتری دیوی کے کمرے میں آگیا۔

''کیا ہوا ہے بیٹا؟ اس وقت، کوئی کام ہے کیا؟'' گائتری دیوی نے سوال کیا۔

''ماں میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''شادی؟'' گائتری دیوی حیران ہوگئی۔

''لیکن تیری تو نمرتا کے ساتھ سگائی بھی نہ ہوسکی پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟''

وکرم بولا۔ ''نہیں ماں...... نمرتا سے نہیں...... کسی بھی لڑکی سے میری شادی کروادو جلد از جلد...... لڑکی جیسی بھی ہو...... لنگڑی لولی ان پڑھ، جاہل بھی ہو تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''چل شکر ہے نمرتا کا بھوت تیرے سر سے اترا میں کل ہی آرتی کے رشتے کی بات کرتی ہوں...... آرتی میری سہیلی کی بیٹی ہے...... اور میں تو شروع سے ہی یہ چاہتی تھی کہ آرتی میری بہو بنے۔''

گائتری کی بات سن کر وکرم اپنے کمرے میں آگیا...... ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

تو عالم ہے سمجھتا ہے کتابوں کی زباں
میرا چہرہ بھی پڑھ، میرے حالات بتا
بس ہوجائے مجھے تیری محبت حاصل
تو کوئی ایسی دعا ایسے مناجات بتا
کمال کرتے ہوا ے دل تم بھی
اسے فرصت نہیں، تمہیں چین نہیں

دو مہینے گزر گئے تھے...... آرتی، وکرم کی سہاگن بن چکی تھی...... نمرتا پر کیے جانے والے کالے جادو کا اثر اب تقریباً ختم ہوگیا تھا...... سوشانت کی امریکہ میں کوئی امپورٹڈ بزنس میٹنگ تھی وہ وہاں گیا ہوا تھا۔

نمرتا سب جانتی تھی کہ اس نے اپنے ساتھ کیا کرڈالا کیسے اپنی محبت کا اپنے ہی ہاتھوں بلیدان دے دیا...... وہ محبت جسے حاصل کرنے کے لئے اس نے کتنی محنت کی کوشش کی تھی...... کتنی دعائیں مانگی تھیں...... اور جب سے نمرتا کو یہ پتا چلا کہ وکرم شادی کرچکا ہے تو وہ مزید ٹوٹ گئی تھی...... وکرم سے بات کی ہمت نہ تھی اس میں...... بس اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔

کشوری، بھی نمرتا کا حال دیکھ رہی تھی نمرتا کی دلی کیفیات اس کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں تھی۔

وہ شرمندہ تھی...... اس روز جب ارجن کمار نے کشوری کو وہ ڈبیا لا کردی تھی اور کہا تھا کہ اسے نمرتا کے جسم پر لگا دینا جب وہ سوئے...... اس وقت کشوری کے دماغ میں کالے جادو والی بات تھی لیکن اس نے یہ سوچ کر اپنے خیال کو جھٹک دیا کہ بھلا ایک باپ اپنی بیٹی پر کالا جادو کیسے کرسکتا ہے۔

کشوری ایک ودوہ (بیوہ) عورت تھی...... وہ شروع ہی سے ارجن کمار کے ہاں ملازمہ تھی...... جب نمرتا کی ماں رچنا دیوی کینسر کا شکار ہوگئی اور اس کی مرتیو کے بعد کشوری نے نمرتا کو ماں کی طرح پالا پوسا تھا۔

ارجن کمار بھی اس حوالے سے ان کی بہت عزت کرتے تھے...... نمرتا نے بھی کشوری کو کبھی ملازمہ نہیں سمجھا تھا...... ہمیشہ کشوری کو ماں کی طرح سمجھا تھا۔

وکرم سے شادی کے لئے ارجن کمار کو منانا اور پھر سوشانت اور شوریہ کھنہ کا اچانک امریکہ سے لوٹ آنا...... پھر ارجن کمار کا اپنی بیٹی پر کالا جادو کرانا...... پھر نمرتا کا اپنی سگائی کے دن وکرم سے لڑنا...... اور پھر سگائی کا ٹوٹ جانا...... سب کچھ کشوری نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا...... پہلے تو وہ کچھ نہ سمجھ پائی...... لیکن اب نمرتا کی حالت دیکھ کر کشوری سمجھ گئی تھی کہ اس کا شک درست تھا...... نمرتا پر اس کے باپ نے کالا جادو کروایا تھا صرف اور صرف اس لئے کہ وہ وکرم سے شادی نہ کرے اور ارجن کمار کو اپنے دوستوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے...... آج کل ارجن کمار بھی بہت پریشان دکھائی دے رہے تھے...... نمرتا کا حال دیکھ کر شاید کہ پچھتا رہے تھے۔

لیکن کشوری کے دل میں ارجن کمار کے لئے کوئی رحم نہیں آیا...... اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ نمک حلالی کے بجائے نمرتا کی محبت کو ترجیح دے گی۔ اس نے نمرتا کو سب سچ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

کشوری نے دروازہ ناک کیا۔

''اندر سے نمرتا نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں ہوں بیٹا۔'' کشوری نے کہا۔

نمرتا نے کہا۔ ''آجائیں۔''

کشوری اندر داخل ہوئی تو نمرتا خفگی سے بولی۔

''ماسی میں نے کتنی بار آپ کو کہا ہے کہ آپ میرے کمرے میں بغیر ناک کئے ہی آجایا کریں۔ آپ کوئی غیر تھوڑی ہیں۔''

''اچھا بیٹا بھول گئی تھی۔'' کشوری نے کہا۔

''یہ تم نے اپنا کیا حال بنایا ہوا ہے؟''

''میرے حال کو چھوڑیں؟'' نمرتا بولی۔

''آپ بتائیں بہت پریشان دکھائی دے رہی ہیں؟''

''ہاں بیٹا میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں؟''

''کس چیز کی معافی...... ماسی کیا کہہ رہی ہیں یہ آپ؟''

''بیٹا میں نے تیری زندگی برباد کردی...... اپنے ہاتھوں سے تیری خوشیوں کو آگ لگادی...... مجھے معاف کردے......'' اتنا کہہ کر کشوری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نمرتا ہکا بکا تھی...... ''ماسی کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ میرے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے آخر میں، اس میں آپ کا کیا دوش ہے؟'' کشوری اب رونا بند کرچکی تھی۔

''دوش ہے...... میرا دوش ہے...... اور ساتھ میں تیرے اس سیٹھ باپ کی بھی کارستانی ہے۔''

''کیا...... کیا کہہ رہی ہیں ماسی...... ہوش میں تو ہیں آپ؟''

''ہاں میں ہوش میں ہی ہوں...... ٹھہر میں تجھے سب شروع سے صاف صاف بتاتی ہوں۔''

کوئی تو اس ہوا سے پوچھتا محسن
ملا کیا ہے اسے کلیوں کو بے ثمر کرکے

کشوری نے سب کچھ نمرتا کو بتادیا تھا لیکن نمرتا کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سچ ہوسکتا ہے ساری بات سننے کے بعد نمرتا نے کہا۔

''ماسی میں آپ کی بات نہیں مانتی۔'' یہ کالا جادو ہوتا کیا ہے...... میں نہیں جانتی...... لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ میرے پاپا میرے ساتھ کچھ غلط نہیں کرسکتے۔''

''ٹھیک ہے۔'' کشوری نے کہا۔

''تمہیں میری کسی بات پر یقین نہیں آرہا...... میں سمجھ سکتی ہوں کوئی بھی انسان اپنے باپ کے بارے میں ایسے حقائق جاننے سے گڑبڑاتا ہے...... تم ایک کام کرو...... ابھی اور اسی وقت اپنے باپ سے پوچھ لو...... انہیں کہو کہ تمہاری قسم کھا کر کہیں کہ انہوں نے تم پر کالا جادو نہیں کروایا ہے؟''

نمرتا نے کہا۔ ''میں پاپا سے اتنی بڑی بات نہیں پوچھ سکتی۔''

''کیا نہیں پوچھ سکتی ہماری بیٹی ہم سے۔'' اچانک ہی کمرے میں ارجن کمار داخل ہوئے۔

"پاپا دیکھیں نہ کشوری ماسی مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ آپ نے کالا جادو کروایا ہے مجھ پر...... کہیں نہ ان سے کہ یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔" نمرتا نے بہت آس بہت ہی امید بھری نگاہوں سے ارجن کمار کی طرف دیکھا۔

ارجن کمار کو لگا کہ جیسے کوئی بم پھٹ گیا ہو۔

انہیں ایسا لگنے لگا جیسے زمین گھوم رہی ہو...... آسمان چکرا رہا ہو۔" بھلا نمرتا یہ سچ کیسے جان گئی۔

"کیسے نمرتا کو پتا چل گیا کہ انہوں نے نمرتا پر کالا جادو کیا ہے؟"

نمرتا نے اپنی بات جاری رکھی وہ بولی۔

"پاپا کشوری ماسی کہہ رہی ہیں کہ جو کرم سے میری سگائی نہ ہو سکی یہ صرف اس کالے جادو کی وجہ سے جو آپ نے مجھ پر کیا ہے...... یا کروایا ہے...... پاپا سچ کیا ہے؟ میں جاننا چاہتی ہوں۔"

کشوری بولی۔" ہاں صاحب جی جو سچ ہے وہ بتائیں نمرتا کو...... لیکن نمرتا کے سر کی قسم کھا کر۔"

ارجن کمار نے کہا۔" کشوری مجھے تم سے یہ امید نہ تھی...... کیا ملا تمہیں نمرتا کو سچ بتا کر...... کیوں تم نے میری بیٹی کو مجھ سے بدگمان کر ڈالا۔

چونکنے کی باری اب نمرتا کی تھی...... وہ حیرت زدہ تھی۔

"پاپا آپ نے کیوں کیا ایسا...... کیوں اگر مجھ پر کالا جادو ہی کروانا تھا...... تو سگائی کے لئے کیوں مانے تھے۔"

"بیٹا میری بات سنو...... میں نے صرف۔"

ارجن کمار نے نمرتا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"پلیز پاپا میں نے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی، جسٹ لیو می آلون۔" نمرتا چلائی۔

کشوری اور ارجن کمرے سے باہر نکل گئے۔

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناطہ جوڑا ہے
مت پوچھ کیا کیا چھوڑا ہے

نمرتا مر گئی تھی اس نے اپنی کلائی کو کاٹ کر خودکشی کر لی تھی۔ اگرچہ اسے اسپتال لے جایا گیا مگر وہ بچ نہ سکی۔ نمرتا نے اپنے باپ سے کوئی سوال کرنے کے بجائے موت کو ترجیح دی تھی...... اور یہ ہی بات ارجن کمار کو توڑ رہی تھی...... ارجن کمار تو جیسے بیٹی کی موت میں ٹوٹ کر بکھر ہی گئے تھے۔ وکرم، نمرتا کی موت سے دو دن پہلے اپنی پتنی آرتی کے ساتھ جرمنی جا چکا تھا۔ اس لئے وہ نہ جان پایا کہ نمرتا مر گئی ہے۔

قدرت نے شاید شوریر کھنہ کے لئے بھی سزا تجویز کر رکھی تھی...... وہ انڈیا میں ہی تھے...... سوشانت کو جب پتا چلا کہ نمرتا مر گئی ہے تو اس نے انڈیا آنے والی پہلی فلائٹ پکڑی اور انڈیا روانہ ہوا۔

لیکن جس جہاز میں وہ آ رہا تھا...... وہ جہاز راستے میں کریش ہو گیا۔

شوریر کھنہ کو پتا چلا کہ ان کا اکلوتا بیٹا اس دنیا میں نہ رہا تو انہیں بھی فالج کا اٹیک ہو گیا۔ اور ان کا آدھا جسم پیرالائز ہو گیا۔

ارجن کمار کو ان دنوں صرف اپنی بیٹی یاد تھی۔

وہ بیٹی جس کی موت کی وجہ وہ خود تھے انہیں نہ پتا چلا کہ ان کا دوست معذور ہو گیا ہے اور اس کا بیٹا مر گیا ہے۔

اس رات ارجن کمار کو نمرتا کی بہت یاد آ رہی تھی انہوں نے اس رات ایک فیصلہ کر لیا۔

اور اگلے دن اپنے فیصلے پر عمل بھی کیا۔

سوشانت کی وہ USB اب ارجن کمار کے پاس تھی...... وہ ہی یو ایس بی جو سوشانت کو ایک انجان پراسرار لڑکی نے دی تھی۔

ارجن کمار نے اس یو ایس بی کے ڈیٹا کو چیک کیا اور اس میں سے اپنے مطلوب عمل کو نکال لیا۔

☆......☆......☆

کمرہ بالکل خالی تھا...... بس صندور سے ایک

دائرہ بنایا ہوا تھا اور صندور کے آس پاس موم بتیاں لگائی گئی تھیں ارجن کمار دائرہ میں بیٹھے تھے...... لباس کے نام پر انہوں نے صرف ایک انڈر ویئر پہن رکھا تھا...... اور اونچی آواز میں منتروں کا جاپ کررہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد موم بتیاں بجھ گئی...... کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا...... اور ایسی آوازیں آنے لگی جیسے بادل گرج رہے ہوں...... جیسے بجلی چمک رہی ہو۔

اور پھر کمرے میں اچانک آواز گونجی۔

"کیوں بلایا ہے مجھے۔"

ارجن کمار دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔"اے شیطان دیوتا...... اے پوجے دیو...... میں نے تیری وجہ سے اپنی بیٹی کو کھودیا...... میری نمرتا مرگئی ...... مرکر شمشان چلی گئی...... اور اب تو، مجھے میری نمرتا لوٹا...... بتا کوئی اوپائے...... دیکھا کوئی راستہ کہ کیسے میں اپنی نمرتا کو دوبارہ حاصل کرسکتا ہوں۔"

ارجن کمار آج اس وقت ایک کامیاب بزنس مین نہیں بلکہ ملعون جادوگر دیکھائی دے رہا تھا۔

وہی آواز دوبارہ آئی۔

"اے میرے غلام...... اے شیطانیت کے سچے پیروکار...... اس شیطانی دنیا میں تمہارا سواگت ہے۔"

"تیری بیٹی مرگئی ہے...... لیکن تو جانتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے...... میں تجھے بتادوں گا کہ نمرتا کب اور کہاں نیا جنم لے گی اور اس وقت بتاؤں گا جب نمرتا نیا جنم لے کر اٹھارہ برس کی ہوجائے گی ۔لیکن اس کے لئے میری ایک شرط ہے۔؟"

ارجن کمار بولے۔"ہاں بول کیا شرط ہے تیری؟"

"تجھے اس سنسار کو چھوڑنا ہوگا...... اپنا سب کچھ چھوڑ کر میری خدمت کرنی ہوگی...... مجھے پوجنا ہوگا بیس برس...... شیطانی منتر پڑھنے ہوں گے انسانوں کی بلی چڑھانی ہوں گی...... بول منظور ہے۔"

ارجن کمار نے کچھ پل سوچا اور پھر ایک ارادے سے بولے۔"ہاں منظور ہے۔"

ہم یہ ہی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے
جن کی تقدیر بدلتی ہے وہ کیا کرتے ہیں

☆......☆......☆

پنڈت جگن ناتھ مندر کے پجاری تھے۔ وہ بہت نفس کھ اور دیالو انسان تھے ہر کسی کی مدد کرتے تھے گاؤں میں ہر کوئی پنڈت جگن ناتھ کے گن گاتا تھا۔ کسی کو کوئی بھی مصیبت پیش آتی تو وہ سیدھا پنڈت جگن ناتھ کے پاس جاتا تھا۔

پنڈت جگن ناتھ کی پتنی بھی ان کی طرح ہی بہت رحم دل تھیں ان کا نام سریتا تھا...... سریتا کو اپنے دھرم سے بہت لگاؤ تھا...... وہ آئے دن اپنے گھر میں بھجن کرواتی رہتی تھیں پنڈت جگن ناتھ کی اور سریتا کی آنکھوں کا تارا ان کی اکلوتی بیٹی عالیہ تھی۔

عالیہ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا...... اس نے ہائی اسکول پاس کرکے کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔

ان دنوں عالیہ بہت پریشان رہنے لگی تھی پریشانی کی وجہ سے وہ اپنی پڑھائی پر دھیان نہیں دے پارہی تھی اس کی پریشانی کا سبب وہ خواب تھے...... جن کا مقصد وہ جان نہیں پارہی تھی۔ کل رات کو بھی عالیہ نے اپنے سپنے میں دیکھا تھا کہ وہ ایک نہایت حسین وجمیل جگہ پر کھڑی ہے۔ چاروں اطراف میں سرسبز پہاڑ ہیں ان پہاڑوں سے آبشاریں بہہ رہی ہیں۔

ہر طرف رنگ برنگی پھول کھلے ہیں...... جن کی خوشبو فضا کو مسحور کررہی تھی۔

عالیہ کھڑی تھی اور اس کے سامنے ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا...... اس لڑکے نے عالیہ کے دونوں ہاتھ تھام رکھے تھے۔ اور پیار بھری باتیں کررہا تھا۔

عالیہ بھی اس کی محبت بھری باتوں میں گم ہورہی تھی کہ اچانک عالیہ کے پتا جگن ناتھ کہیں سے آگئے ان کے پاس ایک کمان تھی...... عالیہ نے دیکھا کہ پنڈت جگن ناتھ نے کمان میں تیر کو سیٹ کیا اور اس لڑکے کا نشانہ لے کر تیر کو چھوڑ دیا۔

تیر فضا میں سرسراتا ہوا آیا...... اور سیدھا اس

لڑکے کے دل میں پیوست ہوگیا...... اس لڑکے نے ایک بھیانک چیخ ماری اور وہیں پر مر گیا۔

عالیہ کی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے باپ سے کچھ پوچھتی...... اس لئے وہ بھاگی اور آگے ایک بہت گہری کھائی تھی عالیہ کو پتا ہی نہ چلا کہ وہ اس کھائی میں کر گئی۔

پچھلے ایک مہینے سے عالیہ مسلسل یہ خواب دیکھ رہی تھی۔ اور اب تو عالیہ کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اپنے خواب والے اس لڑکے سے عالیہ پیار کر بیٹھی ہے نجانے کیوں عالیہ کا دل کرتا تھا کہ وہ اس لڑکے کو حقیقت میں دیکھے...... قریب سے دیکھے۔

لیکن عالیہ نے فیصلہ کرلیا کہ وہ اس خواب کا مقصد جان کر رہے گی۔ اور اس کے لئے وہ مندر کے بڑے پجاری پنڈت شاستری کے پاس جائے گی...... کیوں کہ وہ اپنے خواب کے بارے میں اپنے باپ پنڈت جگن ناتھ کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس لئے کہ وہ پریشان ہوجاتے اور عالیہ نہیں چاہتی تھی کہ پنڈت جگن ناتھ ذرا بھی پریشان ہوں...... آخر کیوں وہ اس کے پتا تھے۔

☆......☆......☆

ارجن کمار نے بیس برس تنہا گزارے تھے۔ صرف اور صرف شیطان کو پوجا تھا۔ لوگوں کی موت کے منتر پڑھے تھے...... شیطان کو خوش کرنے کے لئے کتنے لوگوں کی بلیاں چڑھائی تھیں کہ کسی طرح انہیں ان کی نمرتا واپس مل جائے۔

آج بھی وہ ایک بلی چڑھا چکا تھا...... ایک سات سال کے معصوم بچے کا گلا کاٹ رہا تھا اور اب شیطان سے مخاطب تھا۔

''اے شیطان دیوتا...... میں نے تجھے اپنا سب کچھ مانا ہے...... تیرے لئے اپنے دھرم کو چھوڑا ہے...... اے شیطانی طاقتوں والے لازوال دیوتا بیس برس گزر چکے...... اپنا وعدہ نبھا وفا کر اپنا وعدہ...... کہاں ہے میری نمرتا......

کہاں ہے میری بیٹی...... کہاں اور کس روپ میں اس نے دوسرا جنم لیا ہے۔

شیطان دیوتا کی آواز آئی۔ ''ہم اپنا وعدہ وفا کرنے آگئے...... بیس برس پہلے ہم نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ نمرتا کو دوسرا جنم دیں گے...... نمرتا دوسرا جنم لے چکی ہے...... دوسرے جنم میں وہ پنڈت جگن ناتھ کی بیٹی عالیہ ہے...... لیکن حقیقت میں وہ نمرتا ہے۔ جگن ناتھ گاؤں شانتی نگر میں رہتا ہے...... تو جلد از جلد شانتی نگر چلا جا...... عالیہ کی شکل ہو بہو نمرتا کی طرح ہے...... اور بہت جلد وہ بھی اپنی حقیقت جان لے گی۔'' اور وہ منحوس شیطانی آواز آنی بند ہوگئی۔

ارجن کمار بہت خوش تھے...... انہیں ان کے تپسیا کا صلہ ملنے والا تھا...... وہ اپنی بیٹی سے دوبارہ ملنے والے تھے۔

ارجن کمار نے شانتی نگر جانے کی تیاری شروع کردی۔

عالیہ پنڈت شاستری کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پنڈت شاستری کو اپنے خوابوں کے بارے میں سب کچھ بتا چکی تھی...... اور اب پنڈت شاستری کوئی گیان کررہے تھے ان کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولی پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

عالیہ نے پوچھا۔ ''پنڈت جی خیریت تو ہے نا؟''

پنڈت جی بولے۔ ''خیریت نہیں ہے عالیہ...... شیطانی اور کالی طاقتیں تیری تلاش میں ہیں۔''

''میری تلاش میں کالی طاقتیں وہ کیوں؟'' عالیہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کیونکہ یہ تیرا دوسرا جنم ہے؟'' پنڈت شاستری نے کہا۔

عالیہ پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ گرنے لگا۔ لیکن وہ ایک باہمت لڑکی تھی اس نے اپنے اعصاب پر قابو پاکر پوچھا۔

''تو کیا وہ کالی طاقتیں پچھلے جنم سے میرے پیچھے ہیں؟''

پنڈت شاستری بولے۔ "میں تجھے ایک بھوت دے رہا ہوں یہ بھوت رات کو اپنے جسم کے ساتھ مل کر سوجانا۔ اس بار تجھے تیرے سپنے میں سب کچھ پتا چل جائے گا۔"

عالیہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے پنڈت جی...... لیکن میرے پتا جی سے اس حوالے سے کوئی بات نہ کرنا وہ میں نہیں چاہتی کہ وہ پریشان ہوجائیں۔"

پنڈت شاستری نے اثبات میں سر ہلادیا اور عالیہ کو وہ بھوت دے دیا۔

عالیہ نے سونے سے پہلے وہ بھوت اپنے بدن کے ساتھ لگائی اور سوگئی...... اور خواب میں اسے سب یاد آتا گیا...... سب سے پہلے اپنی ماں رچنا دیوی کی موت...... گھر میں وہ سوگ کا عالم...... پھر کستوری کا اس کی ماں کا رول ادا کرنا، ماں کی طرح اس کا خیال کرنا......

سب یاد آرہا تھا عالیہ کو...... اپنے باپ ارجن کمار کی اپنے بزنس میں مصروفیات یاد آرہی تھیں۔

اس کے بعد پہلی دفعہ ہوٹل میں وکرم سے ملاقات...... پھر وکرم سے محبت...... سوشانت کا اس کی زندگی میں آنا...... اور پھر اسے کے سگے باپ ارجن کمار کا اس کی زندگی میں زہر گھولنا...... سگائی والے دن اس کی سگائی کا نہ ہونا...... اور پھر اس کا خودکشی کرلینا ایک ایک منظر وہ اپنے خواب میں دیکھ رہی تھی اور پھر اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا باپ ایک بزنس مین نہیں ایک شیطانی جادوگر بن گیا ہے۔

رات کے دو بجے عالیہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا اب اسے سمجھ آرہی تھی کہ خواب والے اس لڑکے سے کیوں پیار کربیٹھی کیونکہ وہ اس کا پیار تھا...... محبوب تھا...... اس کا۔

وہ سوچنے لگی۔ نجانے وکرم کہاں ہوگا اب تو اس کے بچے بھی ہوں گے اگر میں اس سے ملی تو کیا وہ مجھے پہچان پائے گا۔

نجانے کیوں عالیہ کو وکرم یاد آرہا تھا حالانکہ اس نے حقیقت میں وکرم کو دیکھا نہ تھا۔

شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔

یوں تو شاخ سے پتے گرا نہیں کرتے
بچھڑ کر لوگ زیادہ جیا نہیں کرتے

☆......☆......☆

ارجن کمار شانتی نگر میں آگئے تھے...... وہ اس وقت مندر میں تھے...... شیطان نے ارجن کو بتادیا تھا کہ اس مندر کا پجاری شاستری سب جانتا ہے اس لئے وہ شاستری سے ملنے کے لئے آئے تھے کہ شاستری سے پوچھ سکیں کہ ان کی بیٹی کہاں ہے۔

"آپ پنڈت شاستری ہیں۔" ارجن کمار نے پوچھا۔

"جی اور آپ غالباً ارجن کمار ہیں۔ شیطان کے پیروکار۔" پنڈت شاستری نے طنز سے کہا۔

"اگر تم سب جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی پتا ہوگا کہ میں صرف اپنی بیٹی کے لئے شیطان کا پیروکار بنا ہوں......" ارجن کمار نے کہا۔

پنڈت شاستری بولے۔ "لیکن تم اپنی بیٹی کے قاتل تھے...... اس پر کالا جادو کروادیا...... چلو شور یرکھنہ اور سوشانت تو غیر تھے...... لیکن تم تو اس کے سگے باپ تھے...... تم ہی تھے وہ...... جو اپنی اکلوتی بیٹی کو اس حد تک لے گئے کہ اس نے خودکشی کرلی...... اس کے بعد تم نے کستوری کو مار ڈالا کہ اس نے تمہاری سچائی تمہاری بیٹی کو بتادی تھی...... تم نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ وکرم کو مار ڈالا...... اس کی پتنی کو سہاگن سے ابھاگن بنادیا...... اور پھر شیطانی کھیل کھیلنے لگے۔ تمہاری بیٹی تمہیں کبھی نہیں مل سکتی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ۔"

ارجن کمار بولے۔ "یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔"

"ہاں میں کون ہوتا ہوں یہ فیصلہ کرنے والا...... یہ فیصلہ تو عالیہ کرے گی...... میں نے اسے سندیسہ بھجوادیا ہے...... وہ آتی ہی ہوگی...... لو وہ آگئی۔"

پنڈت شاستری نے سامنے اشارہ کیا جہاں سے نمرتا یا عالیہ آ رہی تھی۔

ارجن کمار کو لگا کر جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔ بالکل نمرتا جیسی شکل تھی عالیہ کی۔

عالیہ نے ہاتھ جوڑ کر پنڈت شاستری کو نمسکار کیا اور پوچھا۔ ''پنڈت جی آپ نے مجھے بلایا۔''

''ہاں بیٹا...... یہ دیکھ تیرا باپ آیا ہے تجھ سے ملنے۔''

عالیہ نے ارجن کمار کی طرف دیکھا۔ ارجن کمار کو نجانے ایک دم کیا ہوا...... انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ عالیہ کے سامنے جوڑ دیئے اور رونے لگے وہ بولے۔

''بیٹا میں جانتا ہوں کہ سب میری غلطی ہے...... تو میری وجہ سے مری ہے...... تیری موت کے بعد میں پاگل سا ہو گیا تھا...... میں نے اسی پاگل پن میں کشوری اور وکرم کو مار دیا...... معاف کر دے مجھے بیٹا...... معاف کر دے۔''

عالیہ نے بولنا شروع کیا۔ ''پاپا آپ نے میری زندگی کے ساتھ شیطانی کھیل کھیلا...... میں نے اس وقت ہی آپ کو معاف کر دیا تھا کیا میری خودکشی کے بعد یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آئی کہ میں آپ سے بغاوت کرنے پر موت کو ترجیح دوں گی...... لیکن آج نہ سمجھ پائے...... میری ماسی کشوری اور میرے محبوب وکرم کے قاتل بن گئے...... میں اس کے لئے بھی آپ کو معاف کر دیتی...... لیکن پاپا آپ انسان سے شیطان بن گئے کتنے لوگوں کو شیطان کے قدموں میں قربان کیا اور آپ کا یہ جرم ناقابل معافی ہے...... میں آپ کو نہیں معاف کروں گی آپ جائیں دوبارہ اس شیطان کے پاس...... اور اس کی پوجا کریں۔''

عالیہ نے اپنی بات ختم کی تو ارجن کمار کا ہاتھ اپنے سینے پر اٹھتا چلا گیا۔ وہ نیچے گر گئے۔ پنڈت شاستری نے ان کی نبض چیک کی وہ مر چکے تھے انہوں نے عالیہ سے کہا۔ ''عالیہ یہ مر چکے ہیں۔''

عالیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بولی۔ ''آپ ان کا انتم سنسکار کروا دیجیے گا۔ میں جا رہی ہوں۔''

عالیہ مندر کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی کہ اسے کسی نے بلایا۔ ''سنو۔''

عالیہ نے مڑ کر دیکھا...... وہ خوابوں والا لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''وکرم تم......؟'' عالیہ حیرت زدہ تھی۔

''تم تو مر چکے ہو۔''

وکرم بولا۔ ''ہاں میں مر گیا ہوں...... تمہارے باپ نے مجھے مار دیا تھا...... میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنی نئی زندگی کے سفر میں تم جب بھی ہماری محبت کو شمار کرو تو اس میں اپنے باپ کی عداوت کو نہ شمار کرنا بھول جانا کہ ہماری محبت کے امرت میں تمہارے باپ نے کیسا زہر ملایا تھا...... انہیں ان کے کئے کی سزا مل گئی ہے اور تمہیں بھی نیا پریوار مل گیا ہے...... اپنی نئی زندگی خوشی خوشی جیو...... زندگی میں خوشیاں پانے کے بعد تمہیں موت کے بعد بھی خوشیاں ہی ملیں گیں کیونکہ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمہاری زندگی میں بھی...... اور تمہارے مرنے کے بعد بھی۔'' وکرم اتنا کہہ کر غائب ہو گیا۔

عالیہ کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہو...... لیکن اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے کیونکہ اس کا پریوار، اس نئی زندگی اسے اپنی طرف بلا رہی تھی...... یہ الگ بات تھی...... کہ اس کی نئی زندگی میں وکرم اس کے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن ابھی وکرم نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گا اس کی زندگی میں بھی...... اور اس کے مرنے کے بعد بھی......

عالیہ، وکرم کے ان الفاظ کو سوچ کر مطمئن ہو گئی۔

جان لیوا

راشد نذیر طاہر

قسط نمبر:3

برس ہا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگرداں انسانوں کی پراسرار ہولناک داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بدنداں کرکے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایک بالکل نئے طرز کی حیرت ناک دلوں پر دہشت طاری کرتی کہانی۔

ایک نادیدہ اور پراسرار ہستی کی ہولناک روداد دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

میں نے چونک کر ماں جی کی طرف دیکھا تھا اور پھر بے اختیار میری نگاہیں رحیم بابا کی طرف گھوم گئیں۔

وہ پوری طرح ماں جی کی طرف متوجہ تھے، ان کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے، وہ یقیناً کچھ پڑھنے میں مصروف ہوگئے تھے۔

میں بے چین سا ہوگیا...... پہلے کی طرح ایک بار پھر ماں جی کا چہرہ بدلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

عین اسی وقت رحیم بابا نے ماں جی کو مخاطب کیا۔

”سنیں بہن...... کیا آپ اسے جانتی ہیں؟“

”کس کو......؟“ انہوں نے رحیم بابا کو گھورا۔

”جان لیوا کو......“ وہ پرسکون لہجے میں بولے۔

”یہ جان لیوا ہے کون ...... ؟ کہاں رہتا ہے......؟“

”ارے ...... ! آپ باہر کیوں کھڑی ہیں۔؟ اندر آجائیں......“

”نہیں ...... میں یہیں ٹھیک ہوں ...... !“ وہ بولیں۔

”کیونکہ میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے بہت سارے کام کرنے ہیں۔“

”اوہ اچھا......“ رحیم بابا نے سر ہلایا۔

”میں نے آپ سے جان لیوا کے بارے میں پوچھا تھا......! کون ہے وہ......؟“

”جلد معلوم ہوجائے گا......“ ماں جی نے سر ہلا کر کہا۔

پھر انہوں نے چاروں طرف نظر گھمائی اور فوراً ہی دروازے سے ہٹ گئیں۔ وہ جاچکی تھیں، میں نے ہونقوں کی طرح رحیم بابا کی طرف دیکھا وہ بھی خالی دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔

”رحیم بابا......!“ میں نے ان کا ہاتھ ہلایا۔

”آپ کہاں گم ہوگئے......؟“

”آں......!“ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

”گم کہاں ہوتا ہے ؟ تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔“

”دیکھا آپ نے......!“ میں نے ان کی توجہ مبذول کروائی۔

”کبھی کبھی یہ حال ہوجاتا ہے ماں جی کا......“

”ہاں...... میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں......!“ انہوں نے سر ہلایا۔



www.urdusoftbooks.com

"تم جلدی سے جا کر انہیں دیکھو...... مجھے فوراً بتاؤ کہ وہ کیا کر رہی ہیں اور کہاں ہیں۔"

"جی اچھا......" میں فوراً اٹھا۔

"جلدی کرو بیٹا......" انہوں نے کہا تھا۔

میں سر ہلا کر کمرے سے نکل آیا، میں ادھر ادھر جھانک تاک کرتا ہوا کچن میں جا پہنچا، ماں جی یہاں موجود تھیں اور بڑے مزے سے چولہے پر رکھی ہوئی ہانڈی میں چمچہ گھما رہی تھیں۔

"اماں جی......" میں نے انہیں پکارا۔

وہ فوراً پلٹیں اور بول اٹھیں۔

"ارے شکیل...... تم بالکل صحیح موقع پر آئے ہو...... یہ لو...... ذرا نمک تو چکھ کر بتاؤ...... میری تو آج سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

میں نے بے ساختہ اپنی ہتھیلی آگے بڑھا دی، انہوں نے چمچے میں موجود شوربہ پر پھونک ماری اور میری ہتھیلی پر ٹپکا دیا۔

میں نے زبان سے شوربہ چاٹا اور سر ہلا کر بولا۔

"بالکل ٹھیک ہے اماں جی...... برابر ہے۔"

"شکر ہے......" انہوں نے طویل سانس لی۔

"میں آج تمہارا پسندیدہ قورمہ گوشت بنا رہی ہوں۔ اور رحیم بھائی کو بھی جانے مت دینا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا۔

پھر میں نے محتاط انداز میں ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ ابھی کمرے کی طرف کیوں آئی تھیں۔؟ کوئی کام تھا......؟"

"کمرے کی طرف......؟" انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"نہیں تو...... میں ایک گھنٹے سے یہاں موجود ہوں...... میں تو ایک پل کے لئے بھی باہر نہیں نکلی۔"

"اچھا......" میرے منہ سے نکلا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔

"کیوں...... کیا ہوا......؟" انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔

"تم نے مجھے کہاں دیکھ لیا......؟ میں تو سالن بنانے میں مصروف ہوں۔ کہاں جاؤں گی۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔" میں نے سر کھجایا۔

پھر میں کچھ کہے بغیر ہی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"سنو......! رحیم بھائی کو جانے مت دینا...... ہاں......"

"اچھا...... تو یہ بات ہے۔" رحیم بابا نے پر معنی انداز میں سر ہلایا۔

ماں جی نے جو کچھ کہا تھا، وہ بیان کے طور پر میں نے رحیم بابا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

"لیکن رحیم بابا...... اس کا کیا مطلب ہوا......؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"ماں جی تو صاف انکار کر رہی ہیں، جبکہ وہ یہاں آئی تھیں۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو کہ وہ جھوٹ کیوں بولیں گی۔" رحیم بابا دھیرے سے مسکرائے۔

"دوسری بات یہ ہے کہ جو دروازے پر آیا تھا، اس کا چہرہ بھی تمہاری ماں جی سے کافی مختلف تھا، کیا تم نے غور نہیں کیا تھا؟"

"جی ہاں...... مجھے احساس ہے، ان کی یہ حالت میں اس سے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اس وقت بھی انہوں نے کسی جان لیوا کا ذکر کیا تھا!"

"مجھے یاد ہے......" انہوں نے سر ہلایا۔

"اور میں ایک نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔"

"وہ کیا رحیم بابا۔"

"یہ تمہاری ماں جی ہی تھیں......" رحیم بابا نے بتایا۔

"لیکن ان پر کوئی اپنا تسلط جما لیتا ہے، ان پر حاوی ہو کر انہیں اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔"

"اوہ......" میرے منہ سے نکلا۔

"یہ...... یہ بات ہے؟"

"ہاں......" وہ بولے۔

"اسی لئے تمہاری ماں جی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہیں......اور کیا کر رہی ہیں۔"

"اوہ میرے خدا......" میں کانپ اٹھا۔

"اس طرح تو وہ ماں جی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے...... یہ سب کیا ہے رحیم بابا......؟ کیا اب ہم دونوں کی باری ہے......؟ کیونکہ اس گھر سے پہلے ہی تین لاشیں اٹھ چکی ہیں، اور اب میں اور ماں جی رہ گئے ہیں۔"

"تم گھبراؤ نہیں......" رحیم بابا نے مجھے تسلی دی۔

"سب ٹھیک ہوجائے گا...... اگر اس شے کو نقصان پہنچانا ہوتا ...... تو اب تک نہ جانے کیا ہو چکا ہوتا۔"

"لیکن رحیم بابا...... کیا بھروسہ ہے......؟ کسی وقت بھی، کچھ بھی ہوسکتا ہے۔" میں نے اعتراض کیا۔

"دیکھو......!" وہ میری طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے۔

"تمہاری ماں جی کو اپنے قبضے میں کر لینے کا مقصد فی الحال اس کا صرف یہ ہے کہ وہ اپنے پیغامات تم تک پہنچا سکے۔"

"کیا مطلب......؟" میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"بات سمجھنے کی کوشش کرو......" وہ بولے۔

"اسے اگر کسی سے کچھ کہنا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ انسانی زبان کا سہارا لے گا۔ فی الحال وہ اپنے آپ کو جان لیوا کے نام سے صرف ظاہر کررہا ہے۔ وہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کی ہستی جیتی جاگتی موجود ہے...... البتہ وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔"

"لیکن اس کا کیا فائدہ......؟" میرے منہ سے نکلا۔

"وہ کیوں ایسا کررہا ہے......؟"

"یہ بات تو وہی بتا سکتا ہے۔" رحیم بابا بولے۔

"تمہارے باپ دادا اور دیگر عزیز واقارب کی موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کا کیا مقصد ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے۔"

"اس کا صرف ایک ہی مقصد ہے رحیم بابا۔" میں نے ہونٹ سکیڑے۔

"وہ ہم دونوں کو بھی مار ڈالے گا۔" ابھی وہ صرف لطف لے رہا ہے۔ ہمیں پریشان کر کے اس کا دل خوش ہوتا ہے...... کیا آپ نے کبھی بلی اور چوہے کے مابین تماشہ دیکھا ہے؟"

"کیسا تماشہ......؟"

"میں دھیرے سے ہنسا اور پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔

"بلی جب زیادہ بھوکی نہیں ہوتی اور چوہے کو پکڑ لیتی ہے تو اسے چیرنے پھاڑنے کے بجائے اس سے کھیلتی ہے...... اسے بھگاتی ہے اور پھر خود اس کے پیچھے بھاگتی ہے۔ پھر جب اس کھیل سے اس کا جی بھر جاتا ہے تو وہ اسے کھا جاتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے؟"

جواباً رحیم بابا خاموش تھے، میں نے ان کی طرف دیکھا اور پھر نپے تلے لہجے میں بولا۔

"تو اس وقت میرے باپ دادا کا دشمن وہی کھیل کھیل رہا ہے۔ اس نے میرے باپ کو ماں جی کے ہاتھوں مروایا تھا...... اور میں بے بسی سے سب کچھ دیکھتا رہ گیا...... میں...... میں کچھ بھی نہ کرسکا...... میرے باپ نے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑ دیا...... میری دو خوب صورت بہنوں کی لاشیں اس جھیل میں ملیں، کہ جس کو ان بے چاریوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا...... کوئی کچھ نہ کرسکا...... سب نے ہی اسے حادثے کا نام دے دیا ...... اور وہ دونوں دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ میرے باپ پر خنجر سے وار کیا گیا...... لیکن پولیس آج تک قاتل کو گرفتار نہیں کرسکی...... اس کی وجہ یہ ہے کہ قاتل نے میری ماں جی کے ذریعے انہیں قتل کروایا تھا...... اف...... یہ کتنا بڑا ظلم ہے...... لیکن اس ظلم کا جواب دینے والا کوئی نہیں ہے۔ مجھے...... انصاف دلانے والا کوئی نہیں ہے...... میں کسے پکاروں......؟ کسے آواز دوں......؟"

میں جذباتی انداز میں بولتا چلا گیا...... رحیم بابا میری شکل تک رہے تھے۔

پھر وہ اٹھے اور انہوں نے قدرے جھکتے ہوئے

میرے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

میری آنکھوں سے آنسو چھلک آئے تھے، اس وقت نہ جانے کیوں میرے سارے زخم ابھر کر سامنے آگئے تھے اور آج ان زخموں میں سخت تکلیف تھی۔

رحیم بابا نے میرا چہرہ اوپر اٹھایا اور شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"میری بات سنو میرے بچے..... میں جانتا ہوں کہ تم پر بہت ظلم ڈھائے گئے ہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے اس گھر کو گویا آگ میں پھونک دیا گیا..... میں اس داستان سے اچھی طرح واقف ہوں..... لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا..... اور وہ یہ کہ عروج کو ہمیشہ زوال ہوتا ہے اور ظلم کبھی نہ کبھی ضرور اپنے انجام سے دوچار ہوتا ہے، کیونکہ مظلوم کی آہ عرش کو بھی ہلا دیتی ہے۔"

"لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا....." میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیونکہ میں بہت بدنصیب ہوں..... بہت ہی بدنصیب اور کمزور انسان ہوں۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے میرے بیٹے....." انہوں نے میرا کاندھا ہلایا۔

"ت..... تم..... ہرگز کمزور نہیں ہو..... تم اگر زمین پر ٹھوکر مارو تو اس میں سے پانی کا چشمہ نکل آئے..... نصیب کو برا مت کہو..... تم ہمت کرو..... اور اپنا نصیب خود بناؤ۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ تم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہے ہوگے..... ہاں وہ وقت ضرور آئے گا۔"

"میں کیا کروں رحیم بابا....." میں نے پوچھا۔

"اب آپ ہی بتائیں.....!"

"ضرور بتاؤں گا....." انہوں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"لیکن سب سے پہلے تم اپنے دل سے ڈر نکال دو..... اور خود کو مضبوط کرلو..... اور تم نے خود کو کمزور سمجھا تو پھر ہر قدم پر ناکامی ہوگی..... پہلے یہ کام کرو..... پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ چونکے اور جلدی سے بولے۔

"ارے..... باتوں میں وقت کا خیال ہی نہیں رہا، مجھے واپس جانا ہے..... اچھا..... تو اب میں چلتا ہوں۔"

"آپ کھانا کھا کر جائیں گے..... ماں جی نے بھی تاکید کی ہے۔"

"نہیں.....! میں اب چلوں گا، ورنہ گڑبڑ ہوجائے گی..... ایسا نہ ہو کہ بی بی صاحبہ کو شک ہوجائے۔"

"اچھا تو پھر یہ بتائیں کہ آپ کب آئیں گے؟"

"جس دن قاسم میاں واپس آگئے، میں اسی دن آجاؤں گا..... ٹھیک ہے ناں.....؟ اب میں جارہا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

☆......☆......☆

ماں جی اس بات پر بہت خفا ہوئی تھیں کہ رحیم بابا کھانا کھائے بغیر ہی چلے گئے۔ خیر..... میں نے پھر انہیں سمجھا دیا تھا۔

دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سدو نازل ہوگیا..... ماں جی اس وقت آرام کر رہی تھیں۔

میں نے سدو سے کہا۔

"آؤ گھر میں ہی بیٹھتے ہیں۔"

"ابے بھائی..... گھر سے تو نکل کر آرہا ہوں....." اس نے منہ بنایا۔

"تم پھر ڈربے میں گھسیٹ رہے ہو۔"

"اس دھوپ میں کہاں دھکے کھاؤ گے۔" میں نے پوچھا۔

"چلو..... آج پھر چشمے پر چلتے ہیں....." اس نے کہا۔

"لیکن برائے مہربانی آج وہ ڈرامہ مت کرنا....."

"کون سا ڈرامہ.....؟" میں انجان بن گیا۔

ویسے میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"اب بھولے مت بنو....." اس نے میرے

کندھے پر ہاتھ مارا۔

"تم ہر دفعہ بہانہ بنا کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوتے ہو۔"

"اچھا....." میں ہنسا۔

"چلو.....اب نہیں بھاگوں گا۔"

"یار.....ایک بات بتاؤں....." سدو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں.....بولو....."

"بات دراصل یہ ہے کہ ایسی جگہوں پر نہانے کا مزہ ہی اور ہے.....یقین کرو.....یوں لگتا ہے جیسے وہ پانی روح میں اتر گیا ہو..... دماغ کی ساری نسیں کھل جاتی ہیں....."

"یار تم نے تو حد ہی کردی ہے۔" میں ہنس اٹھا۔

"میرا خیال ہے کہ اسٹریم لیتے ہوئے یہ حالت ہوتی ہے۔ اور تم چشمے کے پانی میں ڈبکیاں لگاتے ہو۔"

"ہاہاہا....." وہ بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔

"تم کافی اچھا بولنے لگے ہو.....اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے جانے کے بعد تم میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔"

"تم کہہ سکتے ہو....." میں مسکرایا۔

"کیونکہ تم میرے بچپن کے دوست ہو....."

"اچھا چھوڑو..... یہ بتاؤ کہ تمہارے ابا جی کے قاتل کا کچھ پتا لگا۔"

"نہیں....." میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوا....."

"بڑے افسوس کی بات ہے....." سدو نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"یہاں مارنا تو بہت آسان ہے، لیکن مارنے والے کو مارنا بہت مشکل ہے۔ ہر طرف بے انصافی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم ہے بڑے بڑے محکموں میں رشوت ستانی کا کاروبار عروج پر ہے۔ نہ جانے اس ملک کا کیا ہوگا تمہارے باپ کا کیا قصور تھا.....؟ لیکن آج وہ منوں مٹی کے نیچے ہے اور اسے مارنے والا یقیناً اس وقت کہیں مزے اڑا رہا ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے.....!" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"لیکن میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔"

"واقعی....." سدو نے سر ہلایا۔

"تم نے صبر ہی کرلیا، یہی بڑی بات ہے۔ آؤ اب چلیں۔"

راستے میں بھی اسی قسم کے موضوع پر باتیں ہوتی رہیں.....اور پھر ہم دونوں کافی مدت بعد ایک بار پھر چشمے کے قریب پہنچ گئے۔

یہاں کا منظر آج بھی وہی تھا۔ درختوں کے لمبے لمبے گھنے سائے اور ان سے چھن کے آنے والی دھوپ میں چشمے کا ابلتا ہوا پانی چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"میں تو اکثر یہاں آتا رہتا ہوں....." سدو نے بتایا۔

"کیونکہ مجھے یہاں بہت سکون ملتا ہے۔ اور سنو .....ایک دفعہ تو زبردست واقعہ ہوگیا....."

"وہ کیا.....؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں سے ذرا فاصلے پر خانہ بدوش آ کر آباد ہوگئے ہیں۔" اس نے ہنس کر بتایا۔

"تم کو تو میری عادت معلوم ہے کہ میں بغیر کپڑوں کے نہاتا ہوں۔ اتفاق سے اس دن ان خانہ بدوشوں کی چند لڑکیاں اس طرف نکل آئیں۔ میں اسی وقت نہا کر باہر نکلا تھا.....وہ بے چاریاں چیخیں مارتی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئیں۔"

یہ سن کر میری بھی ہنسی نکل گئی.....تھوڑی دیر بعد دونوں چشمے کے گہرے حصے میں اتر گئے۔

نہ جانے کیوں آج سدو میری طرف کافی غور سے دیکھ رہا تھا، میں خفیف سا ہوگیا تھا۔

"ایسے کیوں دیکھ رہے ہو یار....." میں نے اسے گھورا۔

وہ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔

"تم اب جوان ہوگئے ہو.....میرے منے۔"

"اور تم کون سا چھوٹے رہ گئے ہو....." میں بولا۔

”تم بھی تو جوان ہو بے شرم۔“

سدو ٹھٹھے مار کر ہنسا، پھر اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ میں اس جگہ اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں، البتہ میں نے اس سے کہا۔

”تم واقعی کافی بے غیرت ہوگئے ہو......“

”ارے مذاق کر رہا ہوں جانی......“ وہ بولا۔

”تم تو میرے بچپن کے دوست ہو۔ اگر تم سے بے تکلفی نہ ہوگی تو پھر کس سے ہوگی۔ ورنہ تم مجھے بچوں کو پڑھاتے ہوئے دیکھو گے تو پہچان نہ سکو گے...... سچ کہہ رہا ہوں۔“

میں نے سر ہلا دیا، عین اسی وقت میری نظر سامنے اٹھ گئی...... اور میں چونک اٹھا۔ درختوں کے درمیان ایک بار پھر وہی سیاہ ہیولہ دکھائی دیا تھا۔

حالانکہ کافی مدت بعد میں نے ادھر کا رخ کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ہیولہ اسی صورت میں سامنے موجود تھا۔

میں نے اسے اپنا وہم خیال کیا...... اور پھر سر جھٹک کر سدو کی طرف متوجہ ہوگیا۔

سدو مجھے بہ غور دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا......؟“

”آں......“ میں چونکا۔

”کچھ نہیں......!“

”جھوٹ مت بولو......!“ سدو نے کہا۔

”تمہارے چہرے کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے۔“

”وہی سایہ مجھے آج پھر دکھائی دے رہا ہے۔“

”کیا کہہ رہے ہو......؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”آخر یہ کیا ہے......؟ اور تمہیں ہی کیوں دکھائی دیتا ہے۔“

”خدا جانے......“ میرا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

میں نے اس بار کن انکھیوں سے درختوں کی جانب دیکھا، ہیولہ بدستور وہاں موجود تھا۔

مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی...... اسی وقت مجھے رحیم بابا کی باتیں یاد آنے لگیں انہوں نے کہا تھا کہ ڈر انسان کو کمزور کر دیتا ہے...... یہ ڈر...... دل سے نکالنا ہوگا...... اور اپنے آپ کو مضبوط کرنا ہوگا۔

دفعتاً ایک خیال کوندے کی طرح میرے زمین میں لپکا۔

”کہیں یہ وہی تو نہیں...... جو میرے خاندان کا قاتل ہے...... جس نے میرے سارے رشتے مجھ سے چھین لئے اور مجھے تنہا کر دیا...... باپ کا سایہ کتنا مضبوط ہوتا ہے...... وہ اپنی اولاد کو کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا...... لیکن آج وہ میری دنیا میں نہیں تھا...... اسے مجھ سے چھین لیا گیا۔“

نہ جانے کیوں میرے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی، میں نے ایک جھٹکے سے اس ہیولے کی طرف دیکھا۔ جس پر کالے رنگ کی چادر تنی ہوئی تھی اور اسی میں اس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔

”کیا ہوا شکیل......؟“ سدو میرے قریب آ گیا۔

”کچھ نہیں......“ میرا لہجہ زیرِ خند تھا۔

”یہ تمہیں دکھائی نہیں دے رہا، لیکن میں صاف طور پر اسے دیکھ رہا ہوں...... سدو...... یہ میرا دشمن ہے، میرے خاندان کا دشمن ہے اسی نے میرے پیاروں کو مجھ سے جدا کیا ہے۔“

”اچھا......“ سدو ہونقوں کی طرح سر ہلا کر بولا۔

اس غریب کو تو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے کہا۔

”آج میں ذرا اس سے معلوم کرتا ہوں کہ یہ کیا چاہتا ہے۔“

”کیسے معلوم کرو گے......؟“ سدو نے پوچھا تھا۔

”ایسے......!“ یہ کہہ کر میں چشمے کی گہرائی سے باہر نکل آیا، میں اس قدر جوش میں تھا کہ برہنہ حالت میں ہی اس سیاہ ہیولے کی طرف بڑھا۔

میرے قدم اس کی طرف اٹھ رہے تھے اور نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں میرے دل کی دھڑکنیں بے ربط ہو رہی تھیں، لیکن میں خود ہی اپنے آپ کو حوصلہ دے رہا تھا۔

ذرا ہی فاصلہ رہ گیا تھا کہ اچانک وہ ہیولہ غائب

ہو گیا...... درختوں کے درمیان وہ اب موجود نہیں تھا۔

میرے اٹھتے قدم رک گئے، میں نے ادھر ادھر دیکھا، لیکن پراسرار ہیولے کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

کچھ سوچ کر میں ذرا آگے بڑھ گیا، عین اسی وقت مجھے اپنی برہنگی کا احساس ہوگا، لیکن دیر ہو چکی تھی۔

چنانچہ سامنے سے آنے والی دونوں لڑکیوں کی زوردار چیخوں سے گویا درخت ہل گئے۔

وہ اچانک ہی سامنے آ گئی تھیں اور مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اچھل پڑی تھیں۔

میں بھی بوکھلا کر درختوں کی آڑ میں ہو گیا...... ان دونوں کے ہاتھوں میں مٹکے تھے، وہ یقیناً خانہ بدوش تھیں اور چشمے پر پانی بھرنے آئی تھیں۔

میں نے گردن نکال کر جھانکا، وہ اسی جگہ کھڑی ہوئی متوحش نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

ان میں ایک لڑکی کافی خوب صورت تھی، یوں جیسے چودھویں کا چاند جنگل میں اتر آیا ہو، مجھے اس وقت یہی تشبیہ سوجھی تھی۔

میں بلند آواز میں بولا۔

"تم دونوں ابھی واپس چلی جاؤ...... چشمے پر میرا دوست بھی موجود ہے...... وہ ابھی نہا رہا ہے۔"

"یہ کیا حرکت ہے جی......؟" خوبصورت کے ساتھ والی ہاتھ نچا کر بولا۔

"وہ ہمارے پینے کا پانی ہے، تم لوگ نہا کر اسے گندہ کرتے ہو؟"

"چشمے کا پانی گندا نہیں ہوتا......" میں نے اسے گھورا۔

"تم کو اتنا بھی معلوم نہیں ہے؟"

اب دونوں کی ہمت بڑھ چکی تھی، اسی لڑکی نے اپنی ساتھی کے کان میں کچھ کہا اور زور سے ہنس پڑی۔

خوب صورت لڑکی نے اس کے دو ہتھڑ رسید کیا تھا...... اور پھر واپسی کے لئے گھوم رہی تھیں کہ پہلی والی نے اس کا بازو تھام لیا۔

"تم کہاں جا رہی ہو......؟ رکو...... ہم پانی بھر کر ہی جائیں گے۔" وہ بولی تھی۔

"ہاں ہاں...... ضرور بھر لینا......" میں نے سر ہلا کر کہا۔

"لیکن ہمیں کپڑے پہننے کا موقع تو دو۔"

"ہم کیا کریں......؟" پہلی والی نے حیرت سے پوچھا۔

"ارے بھئی ذرا آگے پیچھے ہو جاؤ......" میرا لہجہ تیز ہو گیا۔

"تھوڑی دیر بعد ادھر آ جانا ہم لوگ بھی چلے جائیں گے۔"

"اچھا ٹھیک ہے!" پہلی بولی تھی۔

"ہم جا رہے ہیں آؤ شالا۔"

"شالا......" میں نے بے خیالی میں دہرا لیا۔

"نام تو اچھا ہے۔"

لڑکی جاتے جاتے پلٹی اور بولی۔

"تم نے کچھ کہا۔"

"نہیں...... اب جان بھی چھوڑ دو......" میں نے درخت کے عقب سے ہی آواز لگائی۔

"اگر اب تم نہیں گئیں تو میں......!"

"ہاں...... بولو...... کیا کرو گے......؟" وہ شاید تنک کر بولی تھی۔

"میں اسی حالت میں باہر نکل آؤں گا۔"

"چلو چندا......" شالا نامی لڑکی نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔

"تم تو ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہو...... چلو...... تھوڑی دیر بعد واپس آ جائیں گے۔"

اس کی آواز میں عجیب سی مٹھاس تھی میں نے جھانک کر دیکھا۔ اس کی نگاہ مجھ سے ٹکرائی اور پھر وہ چندا کو گھسیٹتی ہوئی وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ جلد ہی وہ دونوں درختوں کی آڑ میں اوجھل ہو گئیں۔

میں باہر نکل آیا، اب میں تیز رفتاری سے چشمے کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔

اور اب میرے ذہن میں اس ہیولے کی جگہ شالا کا سراپا گھوم رہا تھا..... نہ جانے کیوں؟

راستے میں خاموش دیکھ کر سدو نے پوچھ ہی لیا۔

"اب تو بتا دو کہ تم کہاں گئے تھے.....؟"

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"یار.....! میں تو اس کے تعاقب میں گیا تھا جو مجھے بار بار دکھائی دیتا ہے، لیکن وہاں پہنچ کر کچھ اور ہی نظر آ گیا....."

"اب اور کیا دیکھ لیا تم نے....." سدو نے حیرت سے پوچھا۔

"یار..... تمہاری آنکھوں میں خورد بین تو فٹ نہیں ہے.....؟ کیا کیا دیکھ لیتے ہو تم.....؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ..... جیسی تمہاری آنکھیں ہیں ویسی ہی میری بھی ہیں..... تم یہ بتاؤ کہ خانہ بدوشوں کی بستی وہاں سے کتنی دور ہے.....؟"

"کیوں.....؟ یہ کس خوشی میں پوچھ رہے ہو.....؟"

"یونہی.....!" میں نے کندھے اچکائے۔

"تم ضرور کچھ چھپا رہے ہو....." اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

پھر اس کے اصرار پر مجھے زبان کھولنی ہی پڑی۔

اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور بولا۔

"تو تم کو انہوں نے ننگا دیکھا.....؟"

"ہاں یار....." میں نے کہا۔

"اب مجھے کیا معلوم تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ میں تو غصے میں نکلا تھا..... کیونکہ مجھے وہاں جو اکثر دکھائی دیتا ہے ..... میں تو اس کے چکر میں باہر آیا تھا۔"

"ایک تو تمہارے ساتھ یہ بڑا مسئلہ ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"خیر..... یہ بتاؤ کہ اب تم خانہ بدوشوں کا کیوں پوچھ رہے ہو.....؟"

"یار..... شالا نامی لڑکی مجھے بہت اچھی لگی ہے۔ میں اس سے دوبارہ ملنا چاہتا ہوں.....!"

"اوہ.....!" سدو کے منہ سے نکلا۔

وہ میری طرف دیکھ کر رہ گیا تھا۔

گھر واپس آیا تو ماں جی کو شدت سے اپنا منتظر پایا۔

"تم..... تم کہاں چلے گئے تھے.....؟"

"سدو کے ساتھ تھا اماں جی....." میں نے گول مول جواب دیا۔

"ہم دونوں ذرا کھیل میں مصروف تھے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے کہ تم سدو کے ساتھ تھے۔" انہوں نے مجھے گھورا۔

"لیکن کھیل کون سا کھیل رہے تھے؟"

"جی....." میں سٹ پٹا گیا۔

"وہ..... اماں جی..... وہ.....!"

"بس رہنے دو....." انہوں نے ہاتھ اٹھا کر مجھے چپ کروایا۔

"تم ضرور جھیل کی طرف چلے گئے ہو گے..... کیوں.....؟"

"قسم لے لو اماں جی....." میں جھٹ سے بولا۔

"ہم جھیل پر نہیں گئے۔"

"جانا بھی نہیں ..... ہاں ..... میں نے کہہ دیا ہے..... اگر تم وہاں بھٹکے بھی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

"آپ بے فکر رہیں..... میں وہاں بھٹکتا بھی نہیں ہوں.....!" میں نے سر ہلا کر کہا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، وہ کچھ سوچ رہی تھیں..... پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے کہا۔

"میں نے محلے کی ایک عورت سے اپنے گھر کا ذکر چھیڑا ہے..... دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"کس سلسلے میں اماں جی....." میں نے پوچھا۔

"گھر کا ایک حصہ کرائے پر دے رہی ہوں....."

"اوہ..... اچھا.....!"

"ہاں.....!" یہی کرنا ہو گا..... تم اب صرف اپنی

پڑھائی پر توجہ دو۔ تاکہ اچھی نوکری مل سکے...... مجھے جلد سے جلد تمہاری شادی کرنی ہے، میں اپنی زندگی میں ہی اس گھر کی بہاریں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"یہ سب کچھ ضرور ہوگا اماں جی...... آپ فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔

☆......☆......☆

رات کے وقت نہ جانے کیوں مجھے نیند نہیں آرہی تھی...... میں کافی دیر تک آنکھیں بند کئے بستر پر پڑا رہا، اور پھر اکتا کر اٹھ بیٹھا۔

اماں جی اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھیں...... میں نے اٹھ کر چپل پہنی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

ٹھنڈی سی ہوا کے جھونکے نے میرا استقبال کیا تھا...... اس گھر میں تھا ہی کون......؟ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا...... ہو کا عالم تھا...... اس قدر خاموشی تھی کہ ہوا کی سرسراہٹ صاف طور پر گونج رہی تھی۔

میں نے ایک طویل سانس لی، نہ جانے کیوں شالا نامی لڑکی کا سراپا، میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ مجھے وہ منظر بھی یاد آیا جب میں برہنہ حالت میں ان دونوں کے سامنے آ گیا تھا۔

شالا میں ضرور کوئی خاص بات تھی، وہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی اور اب دل میں صرف یہی تمنا تھی کہ کسی بھی طرح اس سے مل بیٹھوں، خوب باتیں کروں اور...... جس قدر ممکن ہو...... اس کے ساتھ وقت گزاروں ...... لیکن یہ سب کچھ کس طرح ہو سکتا تھا......؟ ہاں...... یہ بات غور طلب تھی۔

"شکیل...... شکیل......" اچانک ایک آواز نے مجھے خیالوں کی دنیا سے چونکا دیا۔

میں نے فوراً ہی ادھر ادھر دیکھا، لیکن کوئی بھی تو نہ تھا...... اب میں نے کمرے کی طرف دیکھا کہ کہیں اماں جی نے نہ پکارا ہو...... لیکن دروازہ بھی خالی پڑا تھا۔

"شکیل...... سنو شکیل......!" ہوا کے دوش پر ایک بار پھر آواز ابھری۔

اب خوف مجھ پر طاری ہونے لگا، میں نے فوراً ہی اپنے ذہن کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی، کیونکہ مجھے رحیم بابا کی باتیں یاد آ گئی تھیں۔

میرے ساتھ اتنا کچھ ہو چکا تھا...... کہ اب ڈرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا...... بلکہ یہ ڈر مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے اپنے دل کو مضبوط کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"کون ہو تم...... سامنے آؤ......"

کوئی جواب نہیں ملا، میں چونکنے والے انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا، لیکن کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے پھر پکارا۔

"بولو...... جواب دو......"

ہوا کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز نہ ابھری۔

ہوا کے شور کے علاوہ کوئی اور آواز نہ ابھری۔

میں نے سوچا کہ دو قدم آگے بڑھوں، لیکن قدموں نے ساتھ نہ دیا حوصلہ پست سا ہو گیا تھا۔

عین اسی وقت تیز تیز سانسوں کی آواز سنائی دی، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت موٹا آدمی ہانپ رہا ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، اب مجھ میں سکت نہ رہی کہ میں اس ماحول میں اکیلا کھڑا رہ سکوں۔

چنانچہ میں بھاگ کر اندر آ گیا اور دروازہ بند کر لیا...... میں نے دیکھا، ماں جی بدستور سوئی ہوئی تھیں۔

بہرحال یہاں ان کے وجود کا سہارا کافی تھا، میں نے اپنے بستر کا رخ کیا اور دبک کر لیٹ گیا...... نہ جانے کب تک وہ پراسرار آوازیں بازگشت کی طرح میرے کانوں میں گونجتی رہیں اور پھر خود بہ خود ہی میری آنکھ لگ گئی۔

☆......☆......☆

دوسرے دن صبح ہی صبح رحیم بابا کی شکل دکھائی دی، ان کے عجیب تاثرات تھے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا بات ہے رحیم بابا......؟"

"بات تو خاص ہے بیٹا......" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔

"تمہارے ماموں آ گئے ہیں......!"

"اوہ......" میرے منہ سے نکلا۔

اماں جی اس وقت وہاں موجود نہیں تھیں...... وہ چائے بنانے میں مصروف تھیں۔

"ہاں......" وہ بولے۔

"وہ کل شام سے آئے ہوئے ہیں، لیکن انہوں نے ایک بار بھی تمہارے والے کمرے کی خبر نہیں لی، اور نہ ہی مجھ سے کچھ پوچھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ممانی نے ان کے کان بھر دیئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے ایسا کچھ کہا ہو کہ قاسم ماموں شاید اب ہم لوگوں سے رابطہ بھی نہ کریں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا......" وہ سر ہلا کر بولے۔

"کیونکہ اگر وہ عورت ایسا نہیں کرے گی تو خود اس کے لئے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن میں قاسم ماموں کو حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں......" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اب میرے دل میں یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ میں واپس ان کے گھر میں جاؤں...... لیکن میں یہ بھی نہ چاہوں گا کہ ان جیسا شخص بے وجہ کسی مشکل میں گرفتار ہو...... کیونکہ اسی گھر میں ان کی موت کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔"

"کیا میں قاسم میاں سے ذکر کروں......" رحیم بابا نے سادگی سے پوچھا۔

"ارے آپ یہ غضب مت کیجیے گا۔" میں چونک کر بولا۔

"اگر انہوں نے غصے میں آ کر آپ کو کچھ کہہ دیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا، اور میں پھر بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا...... کیونکہ میں نے ہی آپ کو حالات سے آگاہ کیا تھا۔"

"لیکن مجھے ہرگز افسوس نہیں ہوگا۔" وہ بولے۔

"اور نہ ہی میں تمہیں کوئی دوش دوں گا، میں نے اپنے مالک کا نمک کھایا ہے اور میں یہی چاہوں گا کہ قاسم میاں کو ان خطرات سے آگاہ کروں کہ جن کی انہیں خبر ہی نہیں ہے۔"

"آپ خود کو اس معاملے سے الگ رکھ کر میری مدد کریں...... مجھے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا......"

اسی وقت اماں جی دروازے سے اندر داخل ہوئیں، ان کے ہاتھوں میں ناشتے کی ٹرے تھی، رحیم بابا بول اٹھے۔

"ارے آپ نے یہ تکلیف کیوں کی......؟"

"اس لئے کہ آپ بھی شکیل کے ساتھ ہی ناشتہ کریں۔" وہ مسکرائیں۔

"یہ بھی بھوکا ہے...... اور شاید آپ بھی ناشتہ کر کے نہیں آئے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گئیں پھر اچانک ہی وہ دروازے کے قریب جا کر پلٹیں اور رحیم بابا کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ کر بولیں۔

"میرا بیٹا اپنے ماموں کے لئے بہت پریشان ہے...... آپ اس کی مدد ضرور کریں۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گئیں، میں رحیم بابا کی طرف حیرت سے دیکھ کر بولا۔

"یہ ماں جی کو اچانک کیا ہو جاتا ہے رحیم بابا......"

"ہاں......! میں دیکھ رہا ہوں......" وہ سر ہلا کر بولے۔

"یہ بعض اوقات اپنے آپ میں نہیں ہوتیں...... ارے بیٹا...... بہت سے معاملات ہیں، جن کو دیکھنا ہے اور ان کے ساتھ تیرا آزمانا ہے...... دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ایک طویل سانس لی۔

"کل رات کو مجھے میرے نام سے کئی بار کسی نے پکارا۔" میں نے رات کا واقعہ دہراتے ہوئے کہا۔

"یوں لگ رہا تھا جیسے ہوا کے دوش پر وہ آواز گونج رہی ہو۔"

"اچھا......" وہ قدرے فکرمند ہو گئے تھے۔
"جی ہاں......"
"ضرور تم ڈرے ہو گے......؟"
"کافی حد تک......" میں نے سر ہلایا۔
"بس یہی تمہیں اپنے دل سے نکالنا ہے......" وہ بولے۔
"کیونکہ ڈر کے ہوتے ہوئے کچھ نہیں ہوسکتا...... جہاں خوف آ گیا وہاں ہار ہو گئی۔"
اب میں نے انہیں چشمے والا واقعہ بھی بتا دیا، وہ سن کر بے ساختہ مسکرا دیئے اور بول اٹھے۔
"یہ...... یہی رویہ رکھو...... یوں جیسے وہ صرف ایک دھوکا ہو، ڈراوا ہو...... تم اس سے دور بھاگنے کے بجائے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرو۔"
"لیکن رحیم بابا وہ ہے کون......؟ اور کیا چاہتا ہے......؟" میں نے پوچھا۔
"جس طرح وہ مجھے جگہ جگہ دکھائی دے رہا ہے اور مجھے آوازیں دے کر پکار رہا ہے، اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسلسل مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے......"
"ہاں...... لیکن تم ان سب باتوں کو نظرانداز کرتے رہو......" وہ بولے۔
"اگر تم نے انہیں خود پر حاوی کر لیا تو پھر کچھ بھی نہیں ہوسکے گا۔"
"تو کیا...... یہ وہی ہے جس نے اماں جی کا روپ دھار کر میرے باپ کو مارا تھا۔ اور ان کی جان لی تھی؟"
"ہاں...... شاید یہ وہی ہے......" رحیم بابا نے سر ہلایا۔
"اور تمہاری اماں جی کے مطابق اس کا نام جان لیوا ہے۔"
"تو پھر وہ میری بھی جان لے سکتا ہے......" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔
"اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی اس کے رحم و کرم پر ہوں۔"
"میں اس بارے میں تم سے بعد میں بات کروں گا......" وہ بولے۔
"فی الحال جو مسئلہ درپیش ہے، وہ تمہارے ماموں کا ہے...... ان کے لئے کیا کرنا ہے؟"
"یہ بات بھی ٹھیک ہے......" میں نے سر ہلایا۔
"آپ مجھے یہ بتائیں کہ وقار نامی آدمی کا گھر کہاں ہے......؟ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

☆......☆......☆

شام کے وقت میں ایک خوب صورت سی کوٹھی کے سامنے موجود تھا، یہ کوٹھی اسی وقار کی ملکیت تھی، جو ممانی کے ساتھ مل کر قاسم ماموں کے خاتمے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔
میں نے کچھ سوچ کر دروازے پر لگی ہوئی بیل بجا دی۔ تھوڑی ہی دیر بعد قدموں کی آواز ابھری اور پھر کسی نے دروازہ کھول دیا۔
ایک دراز عمر کی موٹی سی عورت مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"مجھے وقار صاحب سے ملنا ہے۔" میں جلدی سے بولا۔
"کیا نوکری چاہئے......؟" قدرے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔
"جی نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلایا۔
"بہت ضروری کام ہے......"
"بھلا تمہیں اس سے کیا کام ہوسکتا ہے۔"
"یہ میں ان ہی کو بتا سکتا ہوں......" میں بھی اکڑتے ہوئے بولا۔
"کیا آپ مجھے ان سے ملوا سکتی ہیں......؟"
"اچھا...... ذرا رکو۔"
یہ کہہ کر اس عورت نے دروازہ بند کر لیا، جلد ہی دروازہ دوبارہ کھلا تھا اور ایک مردانہ چہرہ دکھائی دیا۔
میں نے غور سے اسے دیکھا، مجھے یقین تھا کہ اس شخص کا سراپا اور خدوخال قاسم ماموں کے گھر میں دیکھ چکا ہوں۔
یہ سو فیصد وہی تھا، جو رات میں چوری چھپے قاسم ماموں کے گھر آیا کرتا تھا۔

میں اسے پہچان چکا تھا۔

”کون ہو تم......؟“ وہ غور سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”مجھ سے کیا کام ہے تمہیں......؟“

”مجھے سحر صاحبہ نے بھیجا ہے...... میں نے ممانی کا نام لیا اور ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔“

”کیسا پیغام......؟“ وہ چونک کر بولا۔

”آپ آج وہاں نہیں جائیے گا......“ میں آہستہ سے بولا۔

”کیونکہ قاسم صاحب آچکے ہیں۔“

”اوہ......“ اس کے منہ سے نکلا۔

”ٹھیک ہے...... لیکن تم......؟“

”میں ان کے مالی رحیم بابا کا بیٹا ہوں......“ میں نے جھٹ سے کہا۔

”اور میں اس بات سے واقف ہوں کہ آپ وہاں آتے ہیں۔“

”اچھا......“ اس کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ قدرے سخت لہجے میں بولا۔

”لیکن اگر تم نے یہ بات کسی اور کو بتائی تو اچھا نہ ہوگا۔“

”آپ فکر مت کریں......“ میں مسکرایا۔

”کیونکہ میں سحر صاحبہ کا وفادار ہوں...... اور وہ میرا ہر طرح سے خیال رکھتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے......“ یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا نوٹ نکالا اور اسے میری طرف بڑھا کر بولا۔

”اس ملاقات کو اپنی حد تک رکھنا...... تم کافی کام کے معلوم ہوتے ہو...... یہ رکھ لو۔“

میں نے فوراً ہی نوٹ ہاتھ میں پکڑ کر اسے بڑے ادب سے سلام کیا اور بولا۔

”ٹھیک ہے صاحب...... میں چلتا ہوں۔“

اس نے سر ہلا کر دروازہ بند کر لیا...... میں نے ہاتھ سے اپنی جیب کو ٹٹولا اور اس میں رکھی ہوئی چیز کو چھپا کر مطمئن انداز میں گھوم گیا۔

پھر میں وہاں رکا نہیں تھا، البتہ تھوڑی دور جا کر میں نے جیب سے اس چیز کو نکال لیا۔

یہ ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈ تھا، اب میرا رخ قاسم ماموں کے آفس کی طرف تھا۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری تھا۔

قاسم ماموں اپنے آفس میں موجود تھے، مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر شدید غصہ اور نفرت کے آثار پھیل گئے۔

”چلے جاؤ شکیل......“ وہ بلند آواز میں بولے۔

”اس سے پہلے کہ میرے منہ سے غلط الفاظ نکل جائیں...... تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں آپ کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا ماموں......“ میری آواز میں دکھ تھا۔

”لیکن اس سے پہلے میں آپ کو کچھ سنانا چاہتا ہوں...... کیونکہ میں کچھ بتا نہیں سکتا...... البتہ سنا ضرور سکتا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا...... میری اور وقار کی آوازیں گونجنے لگیں۔

قاسم ماموں کے چہرے پر اب حیرت کے تاثرات تھے۔ ٹیپ کی ہوئی گفتگو ختم ہوئی تو ان کے منہ سے نکلا۔

”یہ...... یہ کیا ہے......؟“

”میں ممانی صاحبہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا......“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”لیکن وقار نامی یہ شخص اس سانپ کی طرح ہے جسے آپ نے اپنی آستین میں پال رکھا ہے...... میں نہیں جانتا کہ میرے اور اماں جی کے بارے میں آپ کو کیا کچھ کہا گیا...... اور نہ ہی ماں جاننا چاہتا ہوں...... البتہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں جس صبح کو گھر سے نکالا گیا ہوں...... اس سے بیشتر گزرنے والی رات کو میں نے وقار کو...... آپ کے کمرے میں دیکھ لیا تھا۔“

”شکیل......“ قاسم ماموں کی آواز میں لغزش تھی۔

"ہاں ماموں......" میں غم زدہ لہجے میں بولا۔

"مجھے اس بات کا دکھ نہیں ہے کہ ممانی صاحبہ نے ہمیں وہاں سے نکال دیا، بلکہ دکھ اس بات کا ہے کہ آپ جیسے انسان کو نہ صرف دھوکہ دیا جارہا ہے، بلکہ آپ کو راستے سے ہٹا دینے کی سازش بھی تیار کی جارہی ہے......"

"کیا مطلب......؟" وہ چونکے۔

جواباً میں نے سحر ممانی اور وقار کے درمیان ہونے والی گفتگو ان کے سامنے دہرادی۔ ان کا چہرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، ایک رنگ آرہا تھا تو دوسرا جارہا تھا۔

نہ جانے کیوں مجھے ان پر ترس آنے لگا، میں نے آخر میں کہا۔

"یقین کریں کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کے علم میں لائے بغیر ہی اس معاملے کو دیکھ لیتا...... کیونکہ گزرے ہوئے وقت نے جو کچھ مجھے دکھایا ہے...... اس نے میرے اعصاب کافی مضبوط کردیئے ہیں...... مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا گیا...... اور اب میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔"

"ایسا مت کہو شکیل......" وہ تڑپ اٹھے۔

"تمہاری ماں ہے، میں ہوں...... ہم لوگ تو ہیں تمہارے پاس...... تم تنہا نہیں ہو، اس عورت نے مجھے ورغلا کر وقتی طور پر ضرور تم سے دور کردیا تھا، لیکن اب میری آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا ہے۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں...... اس نے تم پر الزام لگایا تھا کہ رات کے سناٹے میں تم نے اس کمرے میں گھسنے کی کوشش کی تھی اور......"

وہ بولتے بولتے رک گئے۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور بولا۔

"ممانی نے اپنی سوچ کے مطابق ہی کام کیا تھا...... خیر...... جو ہوا سو ہوا...... اب آپ صرف اور صرف اپنی جان کی پرواہ کریں...... اور دشمنوں سے خود کو محفوظ کریں۔"

"میں...... میں کیا کروں...... تم ہی بتاؤ...... یہ حالات دیکھ کر میرا ذہن ماؤف سا ہورہا ہے، جس عورت کو میں نے دنیا بھر کی خوشیاں سمیٹ کردیں...... اپنا آپ اس پر نچھاور کردیا...... اس نے مجھے یہ صلہ دیا......؟ اف...... میں کیا کروں......؟"

"آپ پریشان نہ ہوں......" میں نے انہیں حوصلہ دیا۔

"پنجرہ تو آپ کے پاس ہے، بس ان دونوں پنچھیوں کو اس میں بند کرنا باقی ہے۔"

"پنجرہ...... ؟ کیا مطلب......؟" قاسم ماموں نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔

"آپ کے گھر کا وہ کمرہ ہی ان دونوں کے لئے پنجرہ ثابت ہوگا۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں آپ کو بتاتا ہوں کہ...... کرنا کیا ہے......"

میں نے جو منصوبہ ترتیب دیا تھا، اس کے بارے میں مجھے رحیم بابا سے گاہے بگاہے معلوم ہوتا رہا...... کیونکہ وہ اکثر ہمارے گھر پر آجایا کرتے تھے۔

اس دوران اماں جی نے آدھا مکان کرائے پر اٹھادیا تھا، اباجی والے حصے میں اب کرائے دار آچکے تھے اور وہ حصہ آباد ہوگیا تھا۔

دونوں حصوں کے درمیان جو خلاء تھا، اس دروازے کو پاٹ دیا گیا تھا اور اس دیوار کی وجہ سے ہمارا گھر اب دو حصوں میں منقسم ہوگیا تھا۔

رحیم بابا بھی اب ہمارے ساتھ شریک تھے، چنانچہ اسی ہفتے میں ایک دن شام کے وقت وہ قاسم ماموں کے ساتھ گھر پر آگئے۔

انہیں دیکھ کر اماں جی سارے گلے شکوے بھول گئیں...... بہن اور بھائی اپنے مقدس رشتے کا پاس رکھتے ہوئے گلے ملے...... دونوں ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

قاسم ماموں نے ممانی صاحبہ کے سلوک اور اپنی بے اعتنائی کی معافی بھی مانگی تھی۔

اماں جی کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ قاسم ماموں اور رحیم بابا آج گھر میں ہی رکیں گے۔

وہ فوراً ہی کھانے پکانے کی فکر میں مبتلا ہو کر کچن کی طرف چلی گئیں اب میں قاسم ماموں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"جی ماموں...... کیا حال چال ہیں......؟"

"پتا نہیں......" انہوں نے مزاحیہ انداز میں کندھے اچکائے۔

"کیونکہ میں آج شہر سے باہر گیا ہوا ہوں...... بھئی...... کاروباری سلسلے میں......"

"اوہ...... گڈ......" میں مسکرایا۔

"یعنی آج رات کافی اہم ہے...... اور شاید انجام خیز بھی۔"

"ہاں......" انہوں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

انہوں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"میں نے سارا انتظام کر دیا ہے...... اور مجھے یقین ہے کہ وہ آج ضرور وہاں آئے گا...... کیونکہ میں نے اس دوران سحر کو بالکل موقع نہیں دیا کہ وہ تنہا کہیں جا سکے...... میں پورے ہفتے کسی سائے کی طرح اس کے ساتھ رہا ہوں۔"

"یہ آپ نے بہت اچھا کیا......" میرے منہ سے نکلا۔

"رات کے وقت ہم یہاں سے نکلیں گے......!"

انہوں نے بتایا۔

"میں نے اپنے ایک ذمہ دار دوست کو سب کچھ بتایا ہے وہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک اہم عہدے پر فائز ہے...... ظاہر ہے کہ ہمیں ایسے معاملات کے لئے ٹھوس ثبوت کے ساتھ ساتھ گواہ کی بھی ضرورت ہے۔"

"بالکل ٹھیک......"

"ویسے سحر مجھے پکنک کے پروگرام کے لئے اکساتی رہی ہے......" انہوں نے بتایا۔

"میں نے تو صاف منع کر دیا مجھے یقین ہے کہ اسی پکنک میں کچھ گڑبڑ کا امکان ہے...... ہو سکتا ہے کہ وہاں وقار خود بھی موجود ہو۔"

"ممکن ہے ماموں......" میں نے سر ہلایا۔

"اور کچھ بعید نہیں کہ وہ لوگ اسی پروگرام میں آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔"

"ہاں......" وہ بولے۔

"اگر تم نے میری آنکھیں نہ کھولی ہوتیں تو شاید مجھے کسی گہری کھائی میں دھکیل کر گمنامی کی موت مار دیا جاتا......"

☆......☆......☆

آدھی رات کے وقت قاسم ماموں کی کار ویران سڑک پر رواں دواں تھی۔ ساتھ والی سیٹ پر ان کا دوست براجمان تھا، جبکہ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

ان کے دوست کا نام ریحان احمد تھا، اور وہ پولیس کے محکمے سے تعلق رکھتا تھا، چونکہ آدھی رات ہو رہی تھی، اس لئے کچھ جگہوں پر پولیس کی گاڑیوں نے ہمیں روکا، لیکن ریحان احمد کی بدولت فوراً ہی ہماری کار اپنی منزل پر رواں دواں ہو گئی تھی۔

پھر قاسم ماموں کے گھر سے ذرا فاصلے پر کار کو روک دیا گیا تھا، سب سے پہلے ریحان صاحب اترے، ان کے پیچھے میں اور قاسم ماموں بھی باہر نکل آئے۔

صدر دروازے کے قریب پہنچ کر قاسم ماموں نے اسے دھکا دیا، وہ آہستگی کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ انہوں نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولے۔

"یہ رحیم بابا کا کام ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وقار اندر موجود ہے۔"

"جی......!" میں نے اتنا ہی کہا تھا۔

تینوں اندر داخل ہو گئے، چاروں طرف تاریکی اور نیم تاریکی کا راج تھا...... اور چاروں طرف کا ماحول سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔

عین اسی وقت ایک سایہ ہماری طرف بڑھا، یہ سایہ اچانک ہی نمودار ہوا تھا، ریحان احمد نے فوراً ہی اپنا پسٹل نکال لیا، لیکن اسی وقت سایہ بول اٹھا۔

"میں رحیم ہوں...... آپ لوگوں کا انتظار

کررہا تھا۔"

"اوہ......" قاسم ماموں کے منہ سے نکلا پھر وہ بولے۔

"کیا وہ اندر موجود ہے؟"

"جی ہاں صاحب......" رحیم بابا نے جواب دیا۔

"وہ مردود کافی دیر پہلے ہی یہاں آچکا ہے۔"

"ٹھیک ہے رحیم بابا......" قاسم ماموں نے مدھم آواز میں کہا۔

"آج کا کام ختم ہوگیا...... اب آپ آرام کریں۔"

"جی بہتر......" وہ بولے اور پھر فوراً ہی ایک طرف چل دیئے۔

اب ہمارے قدم گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے پورچ سے ہوتے ہوئے ہم برآمدے میں داخل ہوگئے، جلد ہی قاسم ماموں کا کمرہ ہمارے سامنے تھا۔

ایسے میں ریحان احمد نے سرگوشی میں پوچھا۔

"قاسم...... یہی کمرہ ہے؟"

"ہاں......" انہوں نے سر ہلایا۔

"اس کا کوئی اور دروازہ تو نہیں ہے......؟" ریحان نے پوچھا۔

"نہیں......!"

"بس...... ٹھیک ہے......!" ریحان احمد نے ہاتھ کے اشارے سے اطمینان کا اظہار کیا اور پھر قاسم ماموں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

کوئی جواب نہ ملا تو قاسم ماموں نے ایک بار پھر دروازے کو جھنجھوڑ ڈالا۔

تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ سنائی دی۔

"کون ہے......؟" یہ سحر ممانی کی آواز تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نیند میں ڈوبی ہوں...... لہجے سے خمار جھلک رہا تھا میں ان کی ذہانت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

"دروازہ کھولو سحر......" ماموں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"میں ہوں......"

"آ...... آپ......" ان کی گویا آواز ہی پھٹ پڑی۔

"آپ تو...... شہر سے باہر گئے تھے......"

"ہاں...... لیکن جس کام سے گیا تھا وہ ہو نہ سکا...... جلدی دروازہ کھولو۔"

"جی...... میں کھولتی ہوں......" ممانی کی آواز میں صاف لغزش تھی۔

"ذرا رکیں......"

پھر شاید وہ واپس پلٹی تھیں قاسم ماموں نے پلٹ کر ہم دونوں کی طرف دیکھا، ریحان صاحب نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا تھا۔

تھوڑی دیر اور گزری، لیکن دروازہ نہیں کھلا تھا، اب قاسم ماموں نے دوبارہ دستک دے ڈالی اور بلند آواز میں بولے۔

"کیا ہوا سحر...... کیا دوبارہ سو گئیں......؟"

کوئی جواب نہیں ملا، اتنی دیر میں تیز قدموں کی چاپ ابھری اور پھر ملازم نصیر اور اس کی بیوی کی شکلیں دکھائی دیں۔

ہمیں دیکھ کر ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے نصیر نے بوکھلاہٹ میں کہا۔

"صاحب...... آپ......؟"

"ہاں...... میں...... کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" وہ اس پر الٹ پڑے۔

"جی...... جی...... نہیں...... اعتراض کیوں ہوگا بھلا......!" وہ جلدی سے بولا۔

"ہماری کیا مجال کہ کوئی اعتراض کریں۔"

"تو پھر......؟"

اسی وقت نصیر کی بیوی آگے بڑھی۔

"صاحب...... آپ آج کہیں اور سو جائیں...... میم صاحب نہیں اٹھیں گی۔"

"کیوں......؟"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"رات کو دوائی کھا کر سوئی ہیں۔"

"اوہ......" قاسم ماموں نے اسے گھورا۔

"خوب......دوا ڈاکٹر سے لی تھی؟"

"جی ہاں......" وہ پٹاخ سے بولی۔

"میں بھی ساتھ گئی تھی۔"

"اچھا......"

"جی ہاں......" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"آپ لوگ دوسرے کمرے میں آجائیں...... میم صاحب سے صبح مل لیجیے گا۔"

"ہاں......بالکل......" نصیر نے لقمہ دیا۔

"آپ ڈرائنگ روم میں آجائیں۔ میں کھانا بھی لگا دیتا ہوں۔"

"اچھا......تم کھانا لگاؤ......" قاسم ماموں بھی موڈ میں تھے، میں ذرا تمہاری میم صاحب کی طبیعت پوچھ کر آتا ہوں......جاؤ۔"

ان دونوں نے بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بادل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہوگئے۔

ریحان احمد نے معنی خیز نگاہوں سے قاسم ماموں کی طرف دیکھا قاسم ماموں نے اس بار زوردار انداز ہ دوازہ پیٹ ڈالا۔

"سحر......" دروازہ کھولو......" وہ دہاڑے۔

"ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔"

فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور ممانی کی متوحش شکل دکھائی دی، مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے کا رنگ مزید پھیکا پڑ گیا۔

قاسم ماموں نے انہیں دھکا دیا اور کمرے میں داخل ہوگئے۔

قصہ مختصر یہ کہ وقار رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اس کے سمیت سحر ممانی کو جو ذلت اور خفت اٹھانی پڑی اسے بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔

نصیر اور اس کی بیوی بھی ان دونوں کے ساتھ شامل تھے...... قاسم ماموں نے ان سب کے ساتھ صرف اتنا کیا کہ انہیں اسی وقت گھر سے بے دخل کر دیا تھا۔

اس کے علاوہ اور کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوئی تھی، قاسم ماموں نے سب کے سامنے ممانی صاحبہ کو طلاق دے دی تھی۔

سحر ممانی کے ساتھ ساتھ وقار کا بھی بہت برا حال تھا ان دونوں کی کیفیت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں...... گویا زمین پھٹے اور دونوں اس میں سما جائیں...... ریحان احمد نے کہا بھی تھا کہ کم از کم وقار کو جیل کی ہوا کھلانی چاہیے...... لیکن قاسم ماموں نے منع کر دیا......اور پھر بولے۔

"ان لوگوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ میں ان سب کو اپنی زندگی سے نکال رہا ہوں......مزید کوئی اور سزا دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں نے ان لوگوں کو اہمیت دے دی...... لیکن میں ایسا نہیں کروں گا...... میں نے انہیں مکھن میں سے بال کی طرح نکال پھینکا ہے......اور مجھے امید ہے کہ یہ لوگ بھی مجھے اپنی صورت کبھی نہیں دکھائیں گے۔"

چاروں ہارے ہوئے جواریوں کی طرح سر جھکائے ہوئے وہاں سے رخصت ہوگئے اسی وقت میری نظر رحیم بابا پڑی۔

وہ ایک کونے میں غمگین انداز میں کھڑے تھے۔

☆......☆......☆

قاسم ماموں کے بے حد اصرار کے باوجود میں ان کے گھر واپس نہیں گیا تھا، اماں جی کو جب حالات کا علم ہوا تو وہ سکتے میں آگئیں۔

قاسم ماموں اس وقت حویلی میں ہی موجود تھے اور ان کی کوشش تھی کہ وہ مجھے اور اماں جی کو اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔

لیکن میں پہلے ہی اماں جی کو سمجھا چکا تھا چنانچہ وہ بولیں۔

"قاسم......تم ہماری فکر مت کرو......تم یہاں

ملنے آؤ...... ہم بھی ضرور آئیں گے لیکن اب ہم دونوں یہاں سے کہیں نہیں جاسکتے۔"

"باجی...... اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔" قاسم ماموں بولے۔

"میں ہمیشہ اس بات پر نادم رہوں گا کہ سحر کے کہنے پر میں نے آپ لوگوں سے کنارہ کشی کرلی تھی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے قاسم......" اماں جی نے سمجھایا۔

"ہمارے دل بالکل صاف ہیں، بلکہ مجھے تو خوشی ہے کہ وہاں جانے اور پھر وہاں سے نکلنے میں حقیقت کا پتا چل گیا خدانہ کرے اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچتا تو ہمیں بہت دکھ ہوتا...... اب تم جلد سے جلد شادی کرلو اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرو......"

"شادی......" ماموں کے منہ سے نکلا۔

"ہاں بھئی......" اماں جی مسکرائیں۔

"جب سحر اس موٹے سے شادی کا کھیل رچا سکتی ہے، تو تم کیوں اپنی زندگی برباد کرو......؟ تمہیں بھی پورا اختیار ہے کہ ایک اچھی زندگی کی ابتدا کرو۔"

"بات تو ٹھیک ہے آپ کی......" قاسم ماموں بولے۔

"لیکن اب عورت زات سے میرا بھروسہ ہی اٹھ گیا ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو......" اماں جی نے انہیں ڈانٹا۔

"دنیا میں اگر سب ایک جیسے ہوجائیں تو دنیا یا تو جنت کہلائے گی یا پھر جہنم...... ساری عورتیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں...... اب تم جاؤ اور جلدی سے اپنے لئے کوئی اچھی سی لڑکی ڈھونڈ نکالو...... ورنہ پھر میں تلاش کروں گی اور تمہیں اسی سے شادی کرنی ہوگی...... میں تمہیں اس کام کے لئے ایک ہفتے کا ٹائم دے رہی ہوں۔اس مدت میں اگر تم نے کوئی لڑکی پسند نہ کی تو پھر میں میدان میں اتر جاؤں گی۔"

اور پھر واقعی قاسم ماموں کسی لڑکی کی تلاش میں سرگرداں ہوگئے...... اماں جی کی باتوں نے ان پر بھرپور اثر کیا تھا اور یہ ایک خوش آئند بات تھی۔

میں کافی دنوں سے نوٹ کررہا تھا کہ اب اماں جی پر کسی قسم کا کوئی "دورہ" نہیں پڑرہا تھا...... ورنہ ہر دوسرے دن وہ کسی "جان لیوا" کا کوئی نہ کوئی پیغام سنا رہی ہوتی تھیں۔

اس دوران رحیم بابا کا بھی آنا جانا لگا ہوا تھا......

سحر ممانی کے معاملے سے فارغ ہوتے ہی مجھے شالا یاد آگئی۔

وہی شالا...... جو مجھے چشمے کے قرب وجوار میں ملی تھی...... اور پھر اس کا وجود میرے ذہن سے چپک کررہ گیا تھا...... اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش اب بھی میرے دل میں جاگ رہی تھی...... اور اب تو اس میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔

چنانچہ ایک دن میں اپنے دوست یعنی سدو کے پاس جا پہنچا...... میں اس سے پہلے بھی شالا کے بارے میں بات کرچکا تھا، اس نے ایک بار پھر میری خواہش سنی تو فوراً بول اٹھا۔

"ارے یار...... تم نے دل بھی دیا تو کہاں دیا...... جنگل میں...... واہ......"

"جنگل میں نہیں...... لڑکی کو دیا ہے......" میں نے تصحیح کی۔

"رہتی تو وہ جنگل میں ہے نا......"

"تو کیا ہوا......؟" میں نے کہا۔

"میں اسے اماں جی سے ملاؤں گا، اور پھر شادی کرکے گھر لے آؤں گا...... یوں بھی اماں جی جلد سے جلد میری شادی کرنا چاہتی ہیں۔"

"ہوں......" اس نے سر ہلایا۔

"لیکن اگر انہوں نے اسے دیکھ کر انکار کردیا...... تو کیا ہوگا......؟"

"اسے تم نے نہیں دیکھا......" میں بولا۔

"ورنہ تم ایسی بات نہ کرتے...... یقین کرو کہ میں نے ابھی تک اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔"

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔''

''ہاں...... یوں سمجھ لو کہ کوئلے کی کان میں ہیرا ہے...... اور جب اسے نکال کر تراشہ جائے گا تو اس کی چمک دمک کا کیا عالم ہوگا۔''

''میں سمجھ گیا...... لیکن میرے دوست...... وہ لوگ خانہ بدوش ہیں، نگری نگری پھرنا ان کا کام ہے...... اور پھر نہ جانے وہ لوگ کس دماغ کے ہوں...... ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہو۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو......؟'' میں نے غور سے اسے دیکھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمارا وہاں جانا مناسب نہیں ہے!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ان کا علاقہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلایا۔

''لیکن پھر میں کیا کروں......؟ مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے...... بات کرنی ہے۔''

''ہوں......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''ایک ترکیب ہے۔''

''وہ کیا......؟'' میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''تم صبح سویرے میرے ساتھ چشمے پر چلو...... میری معلومات کے مطابق اس وقت وہاں لڑکیاں پانی بھرنے آتی ہیں...... مجھے امید ہے کہ شالا سے تمہاری ملاقات ہوجائے گی۔''

☆......☆......☆

اور پھر اماں جی سے ایک ضروری کام کا بہانہ کرکے میں صبح سویرے ہی گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ سدو کو جگانے میں کافی دقت کا سامنا ہوا، لیکن بہرحال یہ معاملہ بھی طے ہوا...... وہ بے چارہ ناشتے کے بغیر ہی میری خاطر گھر سے باہر آگیا تھا۔

''چلو...... تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوجائے۔'' سدو بولا۔

''لیکن واپسی میں کالے بھائی کی حلوہ پوری سے ناشتہ کریں گے۔''

''ضرور......'' میں مسکرایا۔

''ناشتہ میری طرف سے ہوگا۔''

''نہیں......'' وہ جلدی سے بولا۔

''ناشتہ میں دوں گا کیونکہ کل ہی ٹیوشن کی فیس ملی ہے...... اس کی تم فکر مت کرو۔''

''میں بھی اب لینڈ لارڈ ہوں......'' میں نے مذاقاً کہا۔

''اماں جی نے مکان کرائے پر دے دیا ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے سر ہلایا۔

''جب کرایہ ملے تو اس دن میری دعوت کردینا۔''

''ٹھیک ہے......!'' میں نے حامی بھرلی۔

اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں جلد ہی چشمے کے قریب پہنچ گئے۔ جنگل کے اس حصے میں بھی جنگلی پرندوں کی آواز اور چہچہاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔

صبح کا حسین منظر آنکھوں کے سامنے تھا، اور میں نے دور سے ہی بے تابی کے عالم میں ادھر ادھر نظریں دوڑانا شروع کردیں۔

''یہ آنکھیں...... بڑی بے چینی سے شالا کو ڈھونڈ رہی تھیں...... یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس دن کی طرح آج بھی اچانک میرے سامنے آجائے گی۔''

ابھی چشمہ دکھائی نہیں دے رہا تھا، لیکن ہوا کے دوش پر نسوانی قہقہوں اور ہنسی کی آوازیں کانوں سے ٹکرانے لگیں۔

سدو نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

''دیکھا بیٹا...... میری بات کتنی پکی ہوتی ہے...... لڑکیاں وہاں پانی بھرنے آچکی ہیں......''

''مانتا ہوں استاد......'' میں نے تسلیم کیا۔

''لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم ان کی ٹوہ میں کیوں رہتے ہو......؟ جبکہ تم پہلے ہی کسی سے محبت کا چکر چلا رہے ہو۔''

www.urdusoftbooks.com

"ارے یار...... یہ بات نہیں ہے......" سدو نے کہا۔

"مجھے تو واقعی اپنی ستارہ کے علاوہ کوئی لڑکی اچھی نہیں لگتی...... تم مانو یا نہ مانو...... لیکن میری ستارہ کی ٹکر پر کوئی نہیں ہے۔"

"اچھا......؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ہاں......" وہ مسکرایا۔

"لیکن میرے لئے...... ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں خوب صورت دکھائی نہ دے، لیکن میں نے تو محبت کی ہے اور خوب صورتی دراصل محبت میں ہوتی ہے...... کسی انسان میں نہیں۔"

"فلسفی ہوگئے ہو۔"

"یہ بھی محبت کا کمال ہے...... ورنہ میں اور ٹیوشن...... توبہ کرو...... محبت کسی کو بنا دیتی ہے اور کسی کو بگاڑ دیتی ہے۔"

"تم بات گول کرگئے۔" میں نے یاد دلایا۔

"نہیں...... بات تو خود ہی گھوم گئی...... بات یہ ہے کہ ان ہی خانہ بدوشوں میں سے کچھ لڑکے اپنے علاقے میں آتے ہیں۔"

"کیوں......؟"

"بھئی وہ بھی کھیلتے ہیں......" اس نے بتایا۔

"ان ہی میں سے دیان نامی ایک لڑکے سے میری کافی اچھی ہائے ہیلو ہوگئی ہے اس کے ذریعے مجھے کافی معلومات حاصل ہوئی ہیں۔"

"اوہ...... تو یہ بات ہے......!"

"ہاں......" سدو بولا۔

"وہ ذرا مختلف قسم کا ذہن رکھتا ہے...... عام خانہ بدوشوں سے کافی مختلف ہے۔ وہ اپنی طرز زندگی کو بدلنے کا خواہاں ہے...... وہ کچھ کرنا چاہتا ہے...... اس کا زیادہ تر وقت اپنے علاقے میں ہی گزرتا ہے۔"

"اچھا...... اس سے مجھے ملوانا۔"

"ضرور......" سدو بولا۔

"لو بھئی...... یہاں تو کافی لڑکیاں موجود ہیں...... تم اپنی والی کو ڈھونڈو۔"

میں نے بھی وہیں رک کر ایک درخت کی آڑ سے جھانکا، ذرا ہی فاصلے پر چشمہ موجود تھا، اور کئی لڑکیاں ہاتھوں میں گھڑے اور مٹکے لئے ہوئے دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ پانی بھرنے کے ساتھ ساتھ آپس میں خوش گپیوں میں بھی مصروف تھیں۔

مجھے ان میں شالا دکھائی نہیں دی، البتہ دوسری لڑکی چندا ضرور موجود تھی، میری بے چینی میں اضافہ ہوگیا۔

میں نے خالی خالی آنکھوں سے سدو کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا......؟"

"وہ...... ان میں نہیں ہے......" میرے منہ سے نکلا۔

"ہت تیرے کی......" وہ جھلا کر بولا۔

"قسمت ہی خراب ہے...... بولو...... اب کیا کرنا ہے......؟"

"میں کیا بتاؤں......!"

"تو پھر کس سے پوچھوں......؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"ان لڑکیوں سے؟"

"تم تو بات پکڑ لیتے ہو......" میں جھلا گیا۔

"ارے میرا یہ مطلب ہے کہ اب میں کیا کروں......؟ جب وہی نہیں ہے تو پھر کیا ہوسکتا ہے۔"

"ویسے میرا آئیڈیا اچھا ہے......" سدو نے کچھ سوچ کر کہا۔

"کون سا......؟" میں چونکا۔

"آؤ...... ان لڑکیوں سے پوچھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر سدو نے میرا ہاتھ پکڑا اور پھر جھٹ سے ان لڑکیوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

لڑکیوں نے حیرت سے ہمیں دیکھا...... پانی بھرنے والے ہاتھ رک گئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک

لڑکی نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم دونوں......؟"

"انسان......" سدو نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔

"جنگل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں انسانوں کا داخلہ منع ہے۔"

"وہ تو ہم بھی ہیں......" لڑکی نے منہ بنایا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو......؟"

میں نے غور کیا کہ چندا مجھے گھور رہی تھی، ادھر سدو کی زبان کو لگام ہی نہیں لگ رہی تھی۔

"ہم کسی کو تلاش کر رہے ہیں......؟"

"کسے......؟" لڑکی نے اسے گھورا۔

"کیا نام ہے بھئی اس کا......؟" سدو نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"بتا دوں......؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"ہاں بھئی......" اس نے سر ہلایا۔

"میڈم پوچھ رہی ہیں۔"

"دیکھو......!" اسی لڑکی نے سخت لہجے میں کہا۔

"اگر تم لوگ کسی غلط ارادے سے آئے ہو تو کسی خام خیالی میں مت رہنا......ہم سب مل کر تم دونوں کی چٹنی بنا دیں گے۔"

"اور میں چٹنی ہرگز نہیں کھا سکتا......" سدو نے سر ہلایا۔

"کیونکہ مجھے چٹنی سے نفرت ہے۔ گھر میں بنتی ہے تو میں گھر سے باہر ہوتا ہوں......خیر بات یہ ہے کہ ہمارا کوئی بھی غلط ارادہ ہرگز نہیں ہے......میں تو بہت نیک کام کے ارادے سے یہاں آیا ہوں......"

"کون سا کام......؟" لڑکی پوچھ بیٹھی۔

"میرے اس دوست کا دل جنگل میں کہیں کھو گیا ہے......" سدو نے میری طرف اشارہ کیا۔

"میں وہ ڈھونڈنے آیا ہوں......"

"کیا مطلب ہوا......؟" لڑکی نے اسے گھورا۔

"تم کیا میرا انٹرویو لے کر مجھے نوکری دینے والی ہو......؟" سدو جھلا گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، میں بول پڑا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں شالا سے دوستی کرنا چاہتا ہوں......"

"شالا......؟" لڑکی حیرت سے بولی۔

"کون شالا......؟"

"وہ جانتی ہے......" میں نے چندا کی طرف اشارہ کیا۔

"ایک دن میں یہاں آیا تھا، تو وہ اس کے ساتھ تھی۔"

"میرے ساتھ لیلیٰ تھی......" چندا خود ہی بول اٹھی۔

"تم وہی ہو نا، جو اس دن......"

"ہاں......ہاں......" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

"میں بالکل وہی ہوں...... اور تم چندا ہو نا......؟"

"ہاں......" چندا نے مجھے غور سے دیکھا۔

"تمہیں میرا نام بھی یاد ہے......؟"

"ہاں......" میں نے کہا۔

"کیونکہ شالا نے تمہیں اسی نام سے پکارا تھا۔"

"لیکن میں تو اس دن لیلیٰ کے ساتھ تھی۔" چندا نے جواب دیا۔

"اور نہ ہی میں کسی شالا سے واقف ہوں......"

"اچھا......لیلیٰ کون ہے......؟" میں نے پوچھا۔

"یہ رہی......" اس نے فوراً ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا، یہ ایک موٹی سی کالی رنگت والی لڑکی تھی، جو کسی بھی صورت میں شالا نہیں ہو سکتی تھی۔

"نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ لیلیٰ نہیں بلکہ شالا تھی۔"

"لیکن اس نام کی کوئی لڑکی ہماری بستی میں نہیں۔" اس لڑکی نے دخل دیا، جو پہلے سدو سے مخاطب تھی۔

”تمہیں ضرور کوئی دھوکا ہوا ہے......“

”یہ سن کر میں حیران رہ گیا۔

ان دونوں کے لہجوں میں جو سچائی تھی اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا...... ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہیں۔

تو پھر......؟ کیا میں نے وہ خواب دیکھا تھا......؟ لیکن جاگتے میں خواب کون دیکھ سکتا ہے...... میں سوچ میں ڈوب گیا۔

سدو نے مجھے ٹہوکا دے کر چونکا دیا تھا۔

”اب کیا کریں......؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”یہ تو معاملہ ہی الٹا دکھائی دے رہا ہے۔“

میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی اور چندا سے مخاطب ہو گیا۔

”تمہیں یاد تو ہے نا کہ میری تم سے ملاقات ہو چکی ہے......؟“

”ہاں بابو......“ وہ قدرے شرماتے ہوئے مسکرائی۔

”تم ملے ہی اس طرح تھے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔“

یہ سن کر لیلیٰ نامی لڑکی نے اپنا دوپٹہ منہ پر ڈال لیا، شاید وہ اپنی ہنسی کو روکنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی تھی۔

میری الجھن میں اضافہ ہو گیا...... چندا کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ اس دن یہ لڑکی تھی...... جبکہ میں نے لیلیٰ کے بجائے شالا کو دیکھا تھا۔

چندا نے تو باقاعدہ شالا کو نام لے کر مخاطب کیا تھا، یہ بات یاد آتے ہی میں چونک اٹھا اور بولا۔

”لیکن چندا...... تم نے تو اسے شالا کہہ کر پکارا تھا...... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

چندا ہنسی اور بولی۔ ”میں نے کوئی نشہ کیا ہوگا، میں بھری ہوئی سگریٹ پیتی ہوں......“

ساری لڑکیاں ہنس پڑیں، سدو سے رہا نہ گیا۔

”ارے...... تم لوگ کیوں میرے دوست کا مذاق اڑا رہی ہو...... یہ بے چارہ بہت پریشان ہے۔“

”تمہارا دوست بات ہی ایسی کر رہا ہے......“ چندا بولی۔

”ہم کیا کریں......؟ ایسی کوئی لڑکی ہماری بستی میں ہرگز نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنا مٹکا بھرنے میں مصروف ہو گئی، دوسری لڑکیوں نے بھی اس کی پیروی کی تھی۔

سدو نے مجھے کندھے سے پکڑا اور دوسری طرف گھوم گیا...... چند قدم چلنے کے بعد اس نے کہا۔

”کیوں مذاق کا نشانہ بن رہے ہو......؟ اور وہ بھی ان جاہل جھپٹ لڑکیوں سے......؟“

”ارے یار سدو...... سمجھنے کی کوشش کرو...... میں شالا سے ملا ہوں، میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ حسین و جمیل چہرہ اور اس کا سراپا دیکھا ہے۔“

”میں مانتا ہوں...... لیکن بستی کی یہ لڑکیاں تو صاف منع کر رہی ہیں......“

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”ٹھہرو......“ سدو کچھ سوچ کر بولا۔

”ایک ترکیب میرے ذہن میں آ رہی ہے۔“

”وہ کیا......؟“

”ابھی تم یہاں سے چلو......“ سدو نے مجھے سمجھایا۔

”میں آج شام میں تمہیں دیان سے ملوا دیتا ہوں...... ہوسکتا ہے کہ وہ تمہاری کوئی مدد کر سکے۔“

”اچھا......“ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں......!“ سدو نے کہا۔

”ہوسکتا ہے کہ اسے شالا نامی لڑکی کا علم ہو...... اور...... یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لڑکیاں ہمیں بے وقوف بنا رہی ہوں۔“

میں اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا، بولا کچھ نہیں۔

☆......☆......☆

وعدے کے مطابق سدو نے کالے کی لذیذ حلوہ پوری سے میری ”تواضع“ کی تھی، لیکن میں زیادہ نہ کھا سکا...... خانہ بدوش لڑکیوں نے مجھے شدید الجھن میں

www.urdusoftbooks.com

ڈال دیا تھا۔

سدو نے میری کیفیت بھانپ لی تھی، چنانچہ وہ بول اٹھا۔

"ارے میری جان...... کیوں فکر کرتے ہو......؟ میں تمہیں تمہاری شالا سے ملوا کر ہی دم لوں گا...... تم پریشان نہ ہو......!"

"یار میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"تم حلوہ پوری کھاؤ...... ابھی سے اتنے پریشان ہو جاؤ گے تو آگے کیا کرو گے۔ عشق کی منزل تو بہت کٹھن ہوتی ہے ...... یہ رکاوٹیں اور الجھنیں تو محبت کی معراج ہیں۔ اگر یہ آسانی سے حاصل ہو جائے تو کیا خاک مزہ......؟"

"تم پھر فلسفہ بگھارنے لگے......" میں نے اسے گھورا۔

"یہ فلسفہ نہیں بلکہ حقیقت ہے......" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"میں ایک آوارہ اور اوباش انسان تھا، لیکن جب مجھے محبت ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو یکسر بدل ڈالا میں اب بھی اپنے دوستوں سے ملتا ہوں، لیکن کسی غلط ایکٹی وٹی میں ہرگز نہیں ہوں...... اب میں یہ برائی سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں...... تو کیا یہ سب اتنا آسان ہے ...... ہرگز نہیں...... کیونکہ خود کو بدلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔"

"ہاں...... یہ تو ہے......" میں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"بس ...... تو پھر خود کو مضبوط کرو...... اور اس مشکل راستے پر چلنے کے لئے کمر باندھ لو...... کیا تمہیں اس لڑکی سے واقعی محبت ہو گئی ہے......؟"

"ہاں...... کاش تم نے بھی شالا کو دیکھا ہوتا......"

"دیکھ لوں گا......" اس نے سر ہلایا۔

"ضرور دیکھوں گا...... ابھی تو تم پیٹ بھر کر ناشتہ کرو...... چلو......"

☆......☆......☆

گھر میں داخل ہوا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی، اماں جی کافی پریشان دکھائی دیں۔

"کیا ہوا اماں جی......؟" مجھ سے رہا نہ گیا۔

"کیا بات ہے......؟"

"کرائے دار جا رہے ہیں...... ؟" انہوں نے بتایا۔

"جا رہے ہیں...... ؟ کہاں...... ؟" میں نے پوچھا۔

"گھر خالی کر کے جا رہے ہیں......" اماں جی بولیں۔

"فراست علی آئے تھے، اور مجھے پیغام سنا گئے ہیں کہ وہ اسی مہینے میں مکان خالی کر دیں گے کیونکہ یہاں رہنا ان کے بس کی بات نہیں ہے...... انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ بیٹیوں والے ہیں...... خدا نہ کرے کوئی مسئلہ ہو گیا تو کون ذمہ دار ہو گا۔"

"آخر ہوا کیا ہے ماں جی......؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ایسا کیوں بول رہے ہیں؟"

کرائے دار کا نام فراست علی تھا، اور میں سرسری طور پر ہی ان سے ملا تھا...... مجھے یہ تو بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کے ساتھ اور کتنے افراد ہیں۔

اماں جی نے ایک محلے کی عورت کے توسط سے خود ہی سارے معاملات نمٹائے تھے۔

میں نے پوچھا تھا۔ ماں جی نے کہا۔ "لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا...... بس یہ کہہ گئے کہ ان باتوں کو رہنے دیں...... ہمیں ہر صورت میں یہ مکان خالی کرنا ہے۔"

"کمال ہے......" میں بڑبڑایا۔

"ایسی کون سی بات ہے جو وہ بتانا نہیں چاہتے کیا آپ ان کے گھر گئی تھیں؟"

"نہیں......"

"آپ کو وہاں جانا چاہئے......" میں نے کہا۔

"گھر میں اور لوگ بھی ہوں گے...... آپ ان

سے معلوم کریں کہ وہ لوگ کیوں یہ گھر چھوڑنا چاہتے ہیں......؟"

"بات یہ ہے کہ میں ابھی تک ان کے یہاں نہیں گئی ہوں......" اماں جی بولیں۔

"اور اب جاؤں گی تو وہ لوگ سوچیں گے کہ میں مطلب سے آئی ہوں۔"

"تو کیا ہوا...... بات تو واضح ہو جائے گی......" میں نے جواب دیا۔

"نہیں...... میں وہاں نہیں جاؤں گی، البتہ مجھے اس سلسلے میں روحی سے بات کرنی پڑے گی۔"

"یہ روحی کون ہے......؟"

"جس نے انہیں ہمارا گھر دلوایا تھا......" وہ بولیں۔

"میں اس کے گھر جاؤں گی اور پھر وہی ان لوگوں سے اگلوائے گی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے......" میں نے سر ہلایا۔

"آپ ان سے بھی مل لیں......"

"ہاں...... ذرا کھانا بنالوں...... پھر جاتی ہوں......"

یہ کہہ کر وہ کچن میں چلی گئیں...... میرا ذہن ایک بار پھر شالا کی طرف چلا گیا...... چند ہی لمحوں کی وہ ملاقات میرے لئے گویا سوہان روح بن گئی تھی۔ کیونکہ اس کے ساتھ جو لڑکی دکھائی دی تھی...... وہ خود اس بات سے انکاری تھی کہ وہ شالا نامی کسی لڑکی سے واقف نہیں ہے۔

حد تو یہ تھی کہ کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا...... جبکہ خود چندا اس سے باتیں کر رہی تھی ...... آخر یہ کیا تھا...... اگر چندا کسی شالا کو نہیں جانتی تھی تو پھر اس نے شالا کا نام کیوں پکارا تھا......؟

میں اس معاملے میں جتنا سوچ رہا تھا...... اتنا ہی الجھتا جا رہا تھا...... آخر کار میں نے گھبرا کر اپنے سر کو جھٹک دیا...... فی الحال اس بارے میں سوچنا فضول تھا...... دیان سے ملنے کے بعد ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکلنے کی امید تھی...... اسی سلسلے میں مجھے اب سدو کا انتظار کرنا تھا، کیونکہ وہی میری ملاقات دیان سے کرواتا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد اماں جی روحی کے پاس چلی گئی تھیں...... میں اس وقت گھر میں اکیلا تھا۔

میں نے وقت گزاری کے لئے ایک موٹا سا ناول اپنی شیلف سے نکال لیا کتابیں پڑھنے کا شوق مجھے بچپن سے ہی تھا، اور اس شوق کو اسکول والوں نے بیدار کیا تھا...... اسکول کی لائبریری سے ہمیں ہر طرح کی کتابیں پڑھنے اور گھر لے جانے کی اجازت تھی...... لیکن گھر لے جا کر پڑھنے کی صورت میں اس کتاب کی انٹری کروانی پڑتی تھی...... بہر حال میں اپنے ساتھ ہی کتابیں لے کر آجایا کرتا تھا۔

یوں یہ شوق پروان چڑھتا گیا...... اب میں اکثر اچھے اور معیاری ناولز خرید لیتا تھا...... میں نے کتاب کھولی اور کہانی میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی، یوں لگا جیسے کوئی دروازے کے قریب آ کر کھڑا ہو۔

میں نے کتاب سے نظریں ہٹائیں اور دروازے کی طرف دیکھا، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے اسے اپنا وہم خیال کیا اور دوبارہ کتاب پر میری توجہ مرکوز ہو گئی...... لیکن تھوڑی دیر بعد یہ تسلسل پھر ٹوٹ گیا۔

اس بار کسی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔

مجھے یاد تھا کہ اماں جی کے جانے کے فوراً بعد ہی میں نے بیرونی دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند کیا تھا، پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اندر داخل ہو کر اس کمرے تک پہنچ سکے۔

لیکن اس دستک کی آواز نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں صدر دروازہ کھلا نہ رہ گیا ہو...... ممکن تھا کہ میں بے دھیانی میں ایسا کر بیٹھا ہوں۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ پھر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اس بار میں اٹھ کھڑا ہوا کتاب میں نے

بستر پر رکھ دی تھی۔

"کون ہے......؟" میں نے قریب جا کر پوچھا۔

کوئی جواب نہیں ملا، البتہ پھر سے دستک دی گئی تھی، اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا، میں نے بلند آواز میں کہا۔

"کون ہو......؟ منہ سے تو بولو۔"

"تم ڈرو گے تو نہیں......؟" ایک انجانی بھرائی ہوئی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

نہ جانے کیوں میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے......اس بھاری سی آواز میں ایسا ہی کچھ اثر تھا۔

میں نے اپنی ہمت جمع کی اور کہا۔

"نہیں......"

"تم جھوٹ بول رہے ہو......" آواز آئی۔

"مجھے یقین ہے کہ تم ڈر جاؤ گے۔"

"مجھے چھوڑو......تم اپنا نام بتاؤ۔" میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں وہی ہوں......" کہا گیا۔

"جو برس ہا برس سے تمہارے باپ دادا سے جنگ لڑتا ہوا آ رہا ہے......میں وہی ہوں......جس نے تمہارے ان آباؤ اجداد کو شکست دی اور انہیں اپنے انجام سے دوچار کیا......میں......میں جان لیوا ہوں......"

"جان......لیوا......؟" میرے منہ سے نکلا۔

پھر میں نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا......میرے سامنے وہی کالے لبادے والا ہیولا موجود تھا، جو مجھے جنگل میں دکھائی دیتا تھا۔

اب بھی اس کے چہرے پر چادر پھیلی ہوئی تھی اور میں اس کی شکل دیکھنے سے محروم تھا۔

اچانک ہی کالے لبادے سے دو ہاتھ برآمد ہوئے اور انہوں نے میری گردن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

خوف کے مارے میرے حلق سے ایک زوردار چیخ بلند ہو گئی۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا شکیل بیٹا......؟" اماں جی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔ انہوں نے میرے جسم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا......اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نیند سے جاگا ہوں......اور اس نیند کے ٹوٹنے کی وجہ بھی اماں جی تھیں جو مجھ پر جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا ہوا میرے بچے......؟ تم میری بری طرح چلا رہے تھے......کیا تم نے کوئی خواب دیکھا ہے......؟ کوئی ڈراؤنا خواب......؟"

"خواب......؟" میں بڑبڑایا۔

پھر میں نے ادھر ادھر دیکھا، میں اس وقت بستر پر تھا۔

"خواب ہی دیکھا ہوگا......" اماں جی میرے قریب بیٹھ گئیں۔

"اچھا ہوا کہ میں واپس آ گئی اور تمہیں نیند سے جگا دیا۔"

میں نے ایک طویل سانس لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"جی اماں......شاید میں خواب ہی دیکھ رہا تھا۔"

"تم دوپہر میں تو سوتے نہیں ہو، پھر آج کیسے بستر پر لیٹ گئے......اور آج تو دروازہ بھی کھلا پڑا تھا...... گھر میں کوئی چور اچکا گھس آتا تو کیا ہوتا......؟"

"ہمارے گھر میں آنے کے بعد وہ بے چارہ بھی پریشان ہی ہو جاتا......" میں طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

"جیسے ہمارے کرائے دار مکان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

"تو کیا ہمارا گھر آسیب زدہ ہے......؟" اماں جی نے مجھے گھورا۔

"ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو......؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں...... اماں جی......" میں نے طویل سانس لی۔

"خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کہ اس عورت نے کیا کہا......؟"

"وہ آج ان لوگوں کے پاس جائے گی اور پھر کل مجھے بتا دے گی......" انہوں نے کہا۔

پھر انہوں نے غور سے مجھے دیکھا اور بولیں۔ "تم

اپنے گھر کو برا کیوں کہہ رہے ہو......؟"

"اماں جی ...... یہاں اس کا راج ہے ...... جو خود کو جان لیوا کہتا ہے......" میرے منہ سے نکل گیا۔

"جان لیوا......؟" انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"یہ کون ہے بھلا......؟"

"یہ وہی ہے جس کی کہانیاں آپ نے بھی مجھے سنائی تھیں...... اس خاندان کے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے والا خود کو جان لیوا کہتا ہے...... اور اب وہ میری تاک میں ہے۔"

یہ سن کر اماں جی خوف زدہ ہوگئیں...... انہوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا اور روہانسی آواز میں بولیں۔

"یہ تو کیا کہہ رہا ہے میرے بچے...... خدا کے لئے ایسی باتیں مت کر......"

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں...... میری آنکھوں میں بھی نمی اتر آئی تھی...... اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنی زبان کیوں کھولی...... بقول رحیم بابا کے، وہ نادیدہ ہستی بعض اوقات اماں جی پر مسلط ہوجاتی تھی...... لیکن درحقیقت تو وہ میری ماں تھی...... مجھ سے محبت کرنے والی...... مجھ پر اپنی جان نچھاور کرنے والی مہربان ہستی...... اسے ہرگز علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہیں اور کیا کہہ رہی ہیں۔

اس لئے بہتر تو یہ تھا کہ میں ان معاملات کو اماں جی سے چھپائے رکھنے کی کوشش کروں۔

بہرحال آج اس خواب نے مجھ پر ظاہر کردیا تھا کہ میرے باپ دادا کا دشمن اب میری تاک میں ہے...... لیکن۔

وہ مجھ سے کھیل کیوں رہا ہے...... اگر وہ اب مجھے ختم کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے کیا مسئلہ ہے...... وہ تو آن کی آن میں میرا صفایا کرسکتا ہے...... پھر وہ اس کہانی کو طول کیوں دے رہا ہے۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور اماں جی کو اپنے گلے سے لگا کر بولا۔

"ماں جی......! آپ فکر نہ کریں...... سب ٹھیک ہوجائے گا...... بالکل ٹھیک ہوجائے گا......"

☆......☆......☆

شام کے وقت دیان سے ملاقات ہوگئی، قد کاٹھ میں لمبا چوڑا اور تیکھے نقوش والا یہ لڑکا شکل و صورت سے کافی بردبار اور سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا...... وہ مجھ سے کافی لپک کر ملا تھا۔

تینوں چائے کے ہوٹل میں جا پہنچے، ایک میز کے گرد گھیرا ڈالنے کے بعد سدو نے فوراً ہی دودھ پتی چائے کا آرڈر دے ڈالا، پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"ہاں بھئی شکیل صاحب...... اب تم دیان سے اپنا مدعا بیان کرو۔"

"کوئی خاص بات ہے......؟" دیان نے میری طرف دیکھا۔

اس کا انداز اپنائیت بھرا تھا۔

"میرے لئے تو بہت ہی خاص ہے......" میں نے ایک طویل سانس لی۔

"کیونکہ زندگی میں پہلی بار یہ موقع مجھے ملا ہے۔"

"کھل کر بتاؤ دوست......" دیان نے سر ہلایا۔

"اگر میرے لائق کوئی کام ہوا تو میں ضرور کروں گا۔"

"میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اس کا تعلق تمہاری بستی سے ہے۔"

"اوہ...... اچھا...... تو پھر بتاؤ......"

اتنی دیر میں چائے آگئی...... میں نے کپ اٹھا کر ایک بھرپور چسکی لی اور بولا۔

"تمہاری بستی میں شالا نامی ایک لڑکی ہے...... میں اس سے ملنا چاہتا ہوں......"

"شالا......؟" دیان نے آہستہ سے دہرایا۔

پھر یوں لگا جیسے وہ اپنے ذہن پر زور دے رہا ہو...... تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... میرے علم میں تو ہرگز اس نام کی کوئی

لڑکی نہیں ہے۔"

"اچھا......" میرے منہ سے نکلا۔

مجھے چندا کی بات یاد آ گئی...... اس نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔

"ہاں......" وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"اور اگر میرے علم میں نہیں ہے تو پھر یہ لڑکی وہاں ہو بھی نہیں سکتی...... کیونکہ میں بستی میں ہر دل عزیز شخصیت رکھتا ہوں...... خاص طور پر لڑکیاں تو مجھ پر جان نچھاور کیے رکھتی ہیں...... سب ہی مجھ سے واقف ہیں اور میں خود بھی سب کو جانتا ہوں...... لیکن یہ نام میرے لئے اجنبی ہے......"

"مجھے حیرت ہے......" میں بڑبڑایا۔

"کیا مطلب......؟"

"مطلب یہ ہے کہ میں اس لڑکی سے مل چکا ہوں......" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"اور اسے اپنا دل دے بیٹھا ہوں......"

"اوہ...... تو یہ بات ہے......" دیان نے سر ہلایا۔

"ہاں بھائی......" سدو نے دخل دیا۔

"یہ مسئلہ تو حاتم طائی کے سوال کی طرح ہے یعنی ایک بار دیکھا ہے...... اور بار بار دیکھنے کی چاہت میں خون خشک ہوا جا رہا ہے۔"

میں نے سدو کو گھور کر دیکھا تو فوراً ہی اس نے اپنے دانتوں کی نمائش کر دی اور عاجزانہ انداز میں بولا۔

"ارے میرے یار...... میں تو مذاق کر رہا تھا...... پہلی نظر کی ہونے والی محبت کے بارے میں مجھ سے زیادہ اور کون جانے گا...... میں تو خود ہی اس مرض میں مبتلا ہوں......"

"خیر......" دیان بولا۔

"میں دیکھتا ہوں...... ویسے میری معلومات کے مطابق اس نام کی کوئی لڑکی بستی میں موجود نہیں ہے۔"

"لیکن میں اس سے مل چکا ہوں...... اور اس وقت چندا اس کے ساتھ تھی۔" میں نے بتایا۔

چندا کے نام پر وہ چونک اٹھا۔

"اوہ...... وہ تو بہت نٹ کھٹ لڑکی ہے...... اس نے ضرور کوئی شرارت کی ہوگی میرا خیال ہے کہ اس لڑکی کا کچھ اور نام ہوگا...... اور اس وقت چندا نے تم سے غلط بیانی کی ہوگی۔"

"لیکن اس نے تو باقاعدہ نام سے پکارا تھا......" میں نے اعتراض کیا۔

"ٹھیک ہے......" دیان نے سر ہلایا۔

"اگر یہ بات ہے تو اس کا بھی حل موجود ہے۔"

"وہ کیا......؟" میں نے اسے امید بھری نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے چائے کا کپ اٹھایا اور اسے ہونٹوں سے لگا کر ایک چسکی بھرنے کے بعد بولا۔

"میں تمہیں بستی میں لے چلوں گا...... تم خود اسے ڈھونڈ لینا...... کیا خیال ہے......؟"

اندھا کیا چاہے...... دو آنکھیں...... چنانچہ میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی وقت سدو بول اٹھا۔

"کہیں ایسا نہ ہو کہ شکیل کو کوئی پریشانی ہو۔ وہاں نہ جانے کیا ہو...... وہ بستی تو اس کے لئے بالکل نئی جگہ ہوگی۔"

"کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا......" دیان نے کہا۔

"کیونکہ میں بستی کے سردار کا بھانجا ہوں...... وہ میرے ماموں ہیں۔"

"اوہ......"

"ہاں......"

"میں بھی ساتھ چل سکتا ہوں۔" سدو نے پوچھا۔

"فی الحال میں شکیل کو ساتھ لے جاؤں گا۔" دیان نے جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے...... لیکن اکیلے میں شکیل ذرا توجہ سے اپنا کام کر سکتا ہے...... اگر تم چلنا چاہو تو بعد میں کسی وقت ساتھ چل سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے حامی بھر لی۔

"میں ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں......"

☆......☆......☆

واپسی میں سدو کا منہ پھولا ہوا تھا...... اس بات کو دیان نے بھی محسوس کرلیا تھا چنانچہ اس نے کہا۔

"کیا تم بھی ہمارے ساتھ جانا چاہتے ہو......؟"

"ہاں......" سدو فوراً بولا۔

"لیکن تم دونوں نے ہی مجھے کاٹ دیا ہے...... اب میں کیا کروں......؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے......" دیان بولا۔

"دراصل وہاں غیر کا جانا ممنوع ہے...... بستی کے لوگوں کے علاوہ کوئی اور وہاں قدم نہیں رکھ سکتا...... کیونکہ اس صورت میں بستی والے فوراً ہی پوچھ گچھ اور پھر مار کٹائی پر اتر آتے ہیں۔"

"ہوں...... تو پھر تم شکیل کو کیسے لے کر جاؤ گے۔" سدو نے پوچھا۔

"میں ایک بندے کا معاملہ سنبھال سکتا ہوں......" دیان بولا۔

"شکیل کو وہاں لے جانا اور پھر خیریت کے ساتھ وہاں سے واپس لے کر آنا میرا کام ہے۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو...... وہاں شکیل کو لے جانے سے پہلے میں ساری بات سمجھا دوں گا...... اور تم بالکل فکر مت کرنا...... جیسے یہ تمہارا جگری دوست ہے، بالکل اسی طرح یہ اب مجھے بھی اتنا ہی عزیز ہے...... کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا...... یہ میرا وعدہ ہے۔"

یہ سن کر سدو نے کہا۔

"ٹھیک ہے ...... اب یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی...... ورنہ میں اس بات کے حق میں نہیں تھا کہ یہ اکیلا وہاں جائے۔"

"بے فکر رہو......" دیان نے اسے تسلی دی۔

پھر وہ میری طرف گھوما اور بولا۔

"تم مجھے اپنا گھر دکھا دو...... کل صبح نو بجے میں تمہیں لینے آؤں گا...... تم میرے ساتھ چلنا...... ویسے آج میں بھی وہاں جا کر شالا کا کھوج لگاتا ہوں......"

میری محبت کا شاخسانہ ابھی لماں جی سے قطعی پوشیدہ تھا چنانچہ مجھے کالج کا بہانہ کر کے صبح سویرے نکلنا پڑا۔

دیان وقت اور وعدے کا پابند ثابت ہوا ٹھیک نو بجے وہ گلی کے کونے پر میرا منتظر تھا۔

عادت کے مطابق وہ مجھ سے گلے ملا اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

"نہیں صاحب...... شالا نامی کوئی لڑکی ہماری بستی میں موجود نہیں ہے۔"

"اوہ......" میرے منہ سے نکلا۔

"کمال ہے......"

"میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں......" دیان نے سر ہلایا۔

"میرا خیال ہے کہ چندا نے اس لڑکی کا غلط نام لیا ہوگا۔"

"لیکن اس نے ایسا کیوں کیا......؟" میں نے کہا۔

"وہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور وہ بھی کچھ ہی دیر کی تھی...... چندا کو کیا پتا کہ شالا میرے دل میں بس جائے گی۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا......" دیان نے ماتھے پر ہاتھ مارا پھر اس نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تم ساتھ تو چلو...... کچھ نہ کچھ تو سامنے آجائے گا...... ویسے کیا تم بتا سکتے ہو کہ شالا کے نقش ونگار کیسے تھے......؟"

"بہت حسین...... بہت خوب صورت تھی وہ......" میں نے جواب دیا۔

"لمبا قد...... چاند جیسی رنگت...... لمبے اور قدرے سنہرے بال...... بڑی بڑی آنکھیں...... اس کے داہنے گال پر سرخ رنگ کا تل بھی تھا۔"

یہ حلیہ سن کر نہ جانے کیوں دیان بے ساختہ مسکرا دیا میں اس مسکراہٹ کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔

"یہ تو تم......" دیان بولتے بولتے رک گیا۔

"ہاں کہو......" میں نے ٹوکا۔

"کیا کہہ رہے تھے......؟"

"کچھ نہیں......" دیان بولا۔

"ایسا نہ ہو کہ تم برا مان جاؤ...... یا تمہاری دل شکنی ہو۔"

"میں برا نہیں مانوں گا...... تم بتاؤ......"

"بتانے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ تم خود دیکھ لو......" دیان مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں بستی میں جا کر تمہیں ایک چیز دکھاؤں گا......"

"کیا چیز......؟" میں الجھ سا گیا تھا۔

"بس یہ اب وہیں معلوم ہوگا......" دیان بدستور مسکرا رہا تھا۔

میں اس مسکراہٹ کو کوئی معنی نہ دے سکا اور پھر پورے راستے اس نے مجھ سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی...... البتہ اس نے مجھے ضرور الجھن میں ڈال دیا تھا۔

بستی میں داخل ہوا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں گھاس پھوس کی جھونپڑیوں سے گویا ایک شہر آباد تھا...... میں اس طرف پہلی بار آیا تھا۔

ان جھونپڑیوں کو دور سے دیکھ کر ہی میں نے دیان سے پوچھا تھا۔

"تم لوگ تو خانہ بدوش ہو...... پھر اتنی محنت سے کیوں یہ گھر بنائے ہیں......؟"

"کیا کہنا چاہتے ہو......؟"

"مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کے متعلق تو یہ بات مشہور ہے کہ خانہ بدوشوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا...... آج یہاں اور کل کہیں اور......"

"ہاں بالکل......" اس نے حامی بھر لی۔

"لیکن ہم لوگ کہیں بھی جا کر وہاں رہنے کی مدت کی پرواہ نہیں کرتے...... اور ظاہر ہے کہ رہنے کے لئے چھت بہت ضروری ہے۔"

"یہ بات تو ہے......" میں نے سر ہلایا۔

"اسی لئے یہ محنت ضروری ہے...... کل کہیں اور ڈیرہ ڈالیں گے تو وہاں بھی جھونپڑیاں بنائیں گے۔"

"اچھا......"

"ہاں...... ویسے دیکھا جائے تو انسان بذات خود ایک خانہ بدوش ہے...... شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو کہ جو ایک ہی جگہ ساری زندگی گزار دے...... کوئی کہیں چلا جاتا ہے تو کوئی کہیں...... حد تو یہ ہے کہ لوگ اپنا شہر اور ملک بھی بدل لیتے ہیں...... کیا انہیں خانہ بدوش نہیں کہیں گے۔"

"تم پر بھی سدو کا اثر ہو گیا ہے......" میں مسکرایا۔

جواباً وہ بھی ہنس کر خاموش ہو گیا تھا...... بستی میں داخل ہونے کے بعد اس نے کہا۔

"آؤ...... سب سے پہلے میں تمہیں اپنے ماموں سے ملواؤں گا۔"

"ماموں......؟"

"ہاں...... وہ بستی کے سردار ہیں......" دیان آہستہ سے بولا۔

"جب ان کا سر پر ہاتھ ہوگا تو بستی میں تمہیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"اچھا......" میرے منہ سے نکلا۔

بستی میں کافی رونق دکھائی دے رہی تھی، بچے بوڑھے، عورتیں اور جوان لڑکیاں ادھر سے ادھر جاتے ہوئے نظر آئیں۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ ہر کوئی مجھے گھور رہا ہے...... لیکن دیان کی موجودگی میں کوئی بھی مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا...... البتہ کئی لوگوں کو میں نے دیان سے سلام دعا کرتے ہوئے دیکھا۔

واقعی دیان یہاں کسی اہمیت کا حامل تھا، اس نے اپنے متعلق دروغ گوئی سے کام نہیں لیا تھا۔

دیان مجھے ساتھ لئے ہوئے آگے بڑھتا رہا پھر ایک بڑے سے جھونپڑے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔

اس جھونپڑے کے دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا...... جو کہ ہوا سے لہرا رہا تھا۔

دیان قدرے بدلے ہوئے لہجے میں اور اجنبی زبان میں بابلند آواز کہا۔

"ابدار...... ابدار...... گاموس......"

(جاری ہے)



خبیث روح

محمد رضوان قیوم۔راولپنڈی

وقتی فائدہ کے لئے نوجوان حسینہ نے بغیر سوچے سمجھے عامل سے نافہم وعدہ کرلیا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ ناقابل یقین مصیبت میں گھر چکی تھی مگر اب کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا اور اس طرح اس کی زندگی داؤ پر لگ گئی۔

دل دہلاتی اور جسم وجان پر لرزا طاری کرتی خوفناک دہشت ناک لرزیدہ لرزیدہ کہانی

قارئین کرام! یہ کہانی ایک ایسے بوڑھے شخص تیجا کی ہے جو اپنی جوانی کے زمانے میں بھارت کے شہر شاہ جہاں پور میں تقسیم سے پہلے گھروں کی لیپا پوتی یعنی سفیدی کرنے والے پیشے سے وابستہ تھا۔ تیجا نے مجھے یہ کہانی 1980ء میں اس وقت سنائی جب وہ اتفاق سے میرے گھر میں سفیدی کرنے آیا تھا۔

دراصل اس بوڑھے شخص تیجا نے میرے گھر میں موجود ٹیبل پر ڈراؤنی کہانیوں کے کچھ شمارے دیکھے تھے۔ تو اس نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ ''باؤجی! آپ کو ''ڈراؤنی کہانیاں پڑھنے کا شوق ہے؟''

میں نے جواباً کہا تھا...... ''ڈراؤنی کہانیاں پڑھتا ہی نہیں بلکہ لکھتا بھی ہوں۔'' اس پر اس بوڑھے شخص نے کہا۔

''میں آپ کو اپنی زندگی میں بیتی، اپنی

آنکھوں دیکھی، ایسی مافوق الفطرت سچی کہانی سناؤں گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے اور آپ جب یہ کہانی اپنے پڑھنے والوں کے لئے لکھیں گے تو وہ اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔"

میں نے اس سفیدی والے سے کہا تھا۔ "تم کسی اتوار کے روز میرے گھر آ کر مجھے اپنی آپ بیتی سنانا۔"

اس نے حامی بھر لی تھی اور پھر وہ ایک اتوار صبح کے وقت میرے گھر آیا تھا۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر اس نے اپنی کہانی یوں بیان کی تھی۔

میرا نام تمیز الدین ہے لیکن یہ بگڑ کر تیجا پڑ گیا ہے ہم جدی پشتی سفیدی کرنے والے پیشے سے وابستہ ہیں۔ میرے مرحوم باپ کا نام شبراتی تھا وہ اپنے زمانے کا بڑا مشہور چونا ماسٹر یعنی سفید کرنے والا تھا۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جا کر سفیدی کیا کرتا تھا بعض دفعہ اس کے بہت سے گاہک اپنے گھروں، کوٹھیوں میں سفیدی، چونا کے ساتھ رنگ وغیرہ اکٹھا کروالیا کرتے تھے۔ اس لئے میرے باپ نے ایک ہندو رنگ ساز جس کا نام تلواری رام تھا، کو اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا یہ نوجوان اپنے کام میں بڑا یکتا اور تیز کام کرنے والا مشہور تھا۔ خاص طور پر اس کی یہ بات بڑی قابل تعریف تھی کہ اس کے ہاتھ کے کئے گئے رنگ میں صفائی کے علاوہ چمک بہت اچھی ہوتی تھی یہ مختلف رنگوں میں صفائی کے تال میل سے ایسے ایسے ڈیزائن بنایا کرتا تھا کہ دیکھنے والے بے اختیار اس کی تعریف ضرور کیا کرتے تھے۔

میرے باپ نے شاہ جہاں پور کی ایک مارکیٹ میں چھوٹی سی دکان کھولی ہوئی تھی جس کے بورڈ پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں قلعی کرنے والے، رنگ ساز اور لیپا پوتی کرنے والے کی سہولت موجود ہے۔ ماشاء اللہ دکان اچھی چلا کرتی تھی میرے باپ نے مجھے تلواری رام کے ساتھ رنگ وروغن کا کام سیکھنے اور اس کی مدد کے لئے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا، میری عمر ابھی اس وقت بہ مشکل سولہ سال ہوگی۔ اس زمانے میں سفیدی کرنے والے مزدور کو ڈھائی روپے روز ملا کرتے تھے۔

ایک دن ہماری دکان میں ایک لرزتا، ہانپتا بوڑھا شخص پرانی سی سائیکل پر آیا اور اس نے ابا کے بارے میں پوچھا، میں نے اسے بتایا کہ وہ نماز پڑھنے گئے ہوئے ہیں آتے ہی ہوں گے...... اس نے کہا چلو میں تھوڑی دیر انتظار کر لیتا ہوں۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا۔ "بیٹا، میری مالکن نے اپنے گھر کی سفیدی اور گھر کے دروازوں اور کھڑکیوں کو پینٹ کروانا ہے۔ تم ذرا ہمارے ساتھ چل کر کام دیکھ لو کہ چونا اور رنگ پر کتنا خرچا آئے گا اور کام میں کتنے دن لگیں گے؟"

ابھی وہ مجھ سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ اس دوران ابا نماز پڑھ کر آ گئے۔ اس بوڑھے کو وہ اتفاق سے جانتے بھی تھے علیک سلیک کے بعد انہوں نے اس بوڑھے سے کہا۔

"تمہاری مالکن بہت عرصہ بعد اپنے مکان میں سفیدی اور پینٹ کروا رہی ہیں، خیریت تو ہے؟"

اس پر اس بوڑھے نے بتایا کہ "بمبئی سے مالکن کی بڑی بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آ رہی ہیں، گھر کی حالت بہت خراب ہے، اس کے در و دیوار بہت میلے اور پیاسے ہیں۔"

ابا نے مجھے اپنے ساتھ لیتے ہوئے اس بوڑھے کو کہا۔ "تم اپنی سائیکل پر گھر پہنچو ہم پیچھے آتے ہیں۔"

ہم جب تانگے پر بیٹھ کر اپنی منزل پر پہنچے تو لمبائی میں تین منزلہ اونچا ایک حویلی نما مکان ہمارے سامنے تھا جبکہ در و دیوار انتہائی بے رونق، بے رنگ تھے۔ جگہ جگہ سے پلستر جھڑا ہوا تھا۔ بہر حال جب ہم اس گھر میں داخل ہوئے تو وہاں عجیب سی نحوست، سیلن اور پراسراریت کا ماحول پایا۔ نچلی منزل جہاں سے ڈیوڑھی شروع ہوتی تھی وہ بالکل ویران، آدم بیزار خالی تھی۔ اسے پار کیا تو ہمارے سامنے اوپری منزل کی جانب جاتی سیڑھیوں کا طویل سلسلہ تھا، ہم اس پر قدم بہ قدم چڑھتے ہوئے دوسری منزل کے پہلے کمرے تک پہنچے تو وہ خالی تھا۔

"لگتا ہے کہ یہاں لوگ نہیں رہتے؟" ابا نے اس بوڑھے سے خود ہی سوال کیا۔

"ہاں! بس اس گھر کی مکانیت صرف دو افراد مالکن اور مجھ پر مشتمل ہے۔"

"تو کوئی کرایہ دار کیوں نہیں رکھ لیتے؟"

"وہ جی کئی دفعہ اسے کرایہ پر چڑھانے کی کوشش کی لیکن پتا نہیں کوئی اس مکان میں کوئی کرایہ دار فیملی آنے کو تیار نہیں ہوتی، میرا خیال ہے کہ اس مکان کی ہوا نکل گئی ہے۔" اس بوڑھے نے بڑا چونکا دینے والا جواب دیا تھا۔

"بری ہوا سے تمہارا کیا مراد ہے؟" ابا نے اس سے حیرانگی سے پوچھا تھا لیکن وہ چپ رہا تھا...... پھر ایک کمرہ آیا تھا، وہ بھی خالی تھا۔

جب ہم تیسرے بڑے کمرے میں پہنچے تھے تو وہاں خاصا اندھیرا تھا اور کونے میں لگی چارپائی پر ایک اچھی خاصی عمر کی بڑھیا بیٹھی ہوئی تھی ہم نے اسے بغور دیکھا یقیناً اس کی عمر اس وقت 90 برس کے لپیٹے میں ہوگی۔ برف جیسے سفید بال اور اس پر جھریوں زدہ چہرے پر پلکیں بھی اجلی روئی کی مانند تھیں۔

"مالکن، یہ سفیدی کرنے والے شبراتی ماسٹر آگئے ہیں۔" اس بوڑھے نے معمول کے لہجے سے ہٹ کر کہا۔

"اچھا منوں بابا، ذرا باورچی خانے سے موم بتی لے آؤ، وہ لائٹ چلی گئی ہے پھر ان سے بات کرتی ہوں۔" اس بوڑھی عورت نے آہستگی سے کہا۔ (لائٹ در حقیقت ہندوستان میں بجلی کو کہتے ہیں)

وہ بوڑھا موم بتی لے آیا، اسے جلایا تو اس کی روشنی میں اور بھی پراسرار لگنے لگی تھی۔ جب میں دیوار پر اس کا سایہ دیکھا تو سچی بات ہے، مجھے خوف آنے لگا تھا۔ بہر حال تھوڑی بر دبعد بجلی آگئی تھی۔ سب کچھ نارمل ہو گیا تھا۔

میں اور ابا سارے گھر کے کام اخراجات اور کام کی مدت تکمیل کا حساب لگانا چاہتے تھے۔

"آپ نے گھر کی حالت تو دیکھ لی ہے۔ کتنی گندی ہے۔ برسوں ہوگئے ہیں اس کی چھت، دیواروں، کھڑکیوں، دروازوں کو چونا اور رنگ وروغن کو دیکھتے ہوئے۔"

"ہاں بیگم صاحبہ! نظر آرہا ہے۔ لیکن میں نے گھر کی حالت سرسری دیکھ لی ہے۔ یہ باباجی مجھے اوپر نیچے سے صحیح معنوں میں آپ کو بتلا سکوں...... کہ اس کی سفیدی اور پینٹ میں کتنا عرصہ لگے گا اور رہی بات مزدوری کی تو وہ آپ جو چاہیں گی، لے لوں گا۔"

"نہیں بھائی! ہم کسی کا حق نہیں مارتے۔" اس بڑھیا نے فوراً ہی ابا کی بات کاٹی تھی۔

"تم اس کی پرواہ نہ کرو ہم تمہیں تمہارا پورا حق دیں گے۔"

ابا نے مجھے کہا۔ "بیٹا تم بیگم صاحبہ کے پاس ٹھہرو، میں ذرا کام دیکھتا ہوں۔"

حالانکہ میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا لیکن کیونکہ یہ ابا کا حکم تھا لہٰذا میں نے اس کی تعمیل کی تھی در حقیقت میرے ابا بہت سخت مزاج کے تھے وہ ہمیں جو حکم دیتے تھے اس کی تعمیل ہمارے لئے اولین فریضہ ہوتی تھی۔

میں اس بڑھیا کے پاس بیٹھا رہا تھا اور میں نے اس کے پاس تھوڑی دیر بیٹھنے سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اخلاق کی بہت اچھی ہونے کے ساتھ اتنی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کی قوت گویائی اور سماعت اچھی حالت میں تھی اور پھر رفتہ رفتہ میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ابا اس بوڑھے کے ساتھ کام دیکھ کر آگئے تو انہوں نے اس بوڑھی عورت کو کہا۔

"بیگم صاحبہ! گھر کے در و دیوار کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے ان کی سفیدی اور پینٹ کے کام میں کم از کم مہینہ بھر لگے گا لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ پہلے دیواروں وغیرہ پر جو جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا ہے، اسے ٹھیک کروالیں اس سے سفیدی اور پینٹ اچھا ہوگا۔ ویسے

آپ کی مرضی، جیسا آپ کہیں گی ویسا ہی کروں گا...... اور ہاں، یہ منوں بھائی کی ٹانگیں چلتے ہوئے لرزتی ہیں، کون پلستر وغیرہ کے لئے مستری مزدور لائے گا کون ان سے کام لے گا......؟ آپ ایسا کریں مجھے مستری کی دیہاڑی علیحدہ دے دیں، میں اپنی نگرانی میں آپ کا یہ کام کروادوں گا۔ اگر آپ کو مجھ پر اعتبار ہوتو......؟'' ابا نے انہیں اپنا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''ارے بیٹا اعتبار کی بات نہ کرنا تم میرے بیٹے کی طرح ہو، روپے پیسے کی کون سی بات ہے، ایسا کرو، منوں بھائی نے راج مزدوری کے لئے جتنے پیسے لینا چاہو، لے لو اور میرا یہ کام کروادو۔ یہ مجھ بڑھیا پر تمہارا احسان ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ! آپ ہماری ماں کی جگہ ہیں، میں آپ کا یہ کام کروادوں گا، ویسے میں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ پلستر صرف نیچے زیادہ اکھڑا ہوا ہے، ایک دو دن کا کام ہے۔''

ابا جی نے پلستر والا کام بہت اچھا اور سستا کروایا تھا...... اور پھر جو پیسے اس بڑھیا اماں جی سے بوڑھے منوں بابا کے ذریعے گھر کی مرمت پلستر وغیرہ کے واسطے لئے تھے اس میں سے آدھے سے زیادہ بچا کر جب واپس کئے تھے تو اماں جی بہت خوش ہوئی تھیں۔

ابا نے تیسرے دن مجھے اور تکواری رام کو اپنے ساتھ کام میں لگا لیا تھا۔ طے یہ ہوا تھا کہ نچلی منزل سے سفیدی اور پینٹ کا کام شروع کیا جائے، میں پہلے پوٹین بھرتا اور دیواروں کو صاف کرتا، پھر ابا دیواروں پر سفیدی کرتے اور سب سے آخر میں تکواری رام پینٹ کرتا۔

کام بڑی تیزی سے جاری تھا کہ...... ایک روز اچانک کام کے دوران ابا سیڑھی پھسل جانے سے گر گئے تھے، ان کی کمر میں کچھ ایسی چوٹ آئی تھی کہ وہ کام کے قابل نہیں رہے تھے اور انہوں نے اپنی جگہ ایک ہندو کام کرنے کے لئے بلا لیا تھا جو چونے کی کوچی پھیرنے لگا تھا۔

ایک روز کام کے دوران مدھو سنگھ نے مجھ سے کہا تھا۔ ''یار مجھے سمجھ نہیں آتی کہ...... اتنے بڑے گھر میں صرف دو بوڑھے رہتے ہیں یہ گھر بڑا پراسرار ہے مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے اس مکان کی اوپر والی خالی منزل میں بھی کوئی رہتا ہے۔''

''تو یہ بات کس بنیاد پر کہہ رہا ہے؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

اس نے جواباً کہا تھا کہ ''میں نے خود اپنے کانوں سے آج صبح اوپر کسی کے چلنے کی آہٹ سنی ہے۔''

''اوہ یہ، تیرا وہم ہوگا، اچھا خیر اگر ایسا ہی ہے تو میں یہ راز منوں بابا سے جاننے کی کوشش کروں گا۔'' میں تکواری رام کے جواب میں یہ کہا تھا۔

شام ہوئی یہ تو ہم نے دیہاڑی کا کام ختم کیا تھا اور اپنے گھر کے کپڑے پہننے کے علاوہ رنگ اور چونے سے برش اور کوچیوں کو صاف کیا اسی دوران میں جب منوں بابا میرے پاس آئے تو میں باتوں باتوں میں ان سے پوچھا۔

''آپ یہاں اتنے بڑے گھر میں دو ہی انسان رہتے ہیں یا کوئی تیسرا بھی ہے؟''

انہوں نے نحیف سا غصہ اپنے ماتھے کے شکنوں میں نمایاں کیا...... اور مجھے قدرے ڈانٹتے ہوئے بولے۔ ''بیٹا، اپنے کام سے کام رکھو تمہیں ہماری ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا پھر انہوں نے مجھے یہ تاکید بھی کی کہ تم نے کبھی کسی قیمت پر اوپری منزل کی چھت پر نہیں جانا اور ہاں، جب پہلی دو منزلوں کا کام ختم ہو جائے تو تمہیں کم از کم دو دن پہلے مجھے اس کے بارے میں بتلانا ہوگا۔

مجھے ان کی منطق بالکل بھی سمجھ میں نہ آئی تھی...... اور میں جب کام سے فارغ ہو کر گھر گیا تو وہاں میں نے چارپائی پر لیٹے، چوٹوں سے کراہتے ابا کو کہا۔ ''مجھے اس گھر میں خوف آتا ہے لہٰذا میں آئندہ ادھر کام کرنے نہیں جاؤں گا۔''

ابا نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔ ''ارے کم

بخت، میں نے اس مکان کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے زبان دی ہوئی ہے، بے وقوف عقل کے کچے، میں نے یہ کام تلواری رام سے ٹھیکے پر کروانا ہے اگرچہ کہ وہ دیہاڑی پر کام کر رہا ہے لیکن میں اس سے اپنا حساب مکا چکا ہوں لہٰذا ہمیں کیا کہ وہاں کوئی اوپری سایہ ہے یا وہاں کوئی تیسرا بھی ہے بس تو اپنی بچگانہ فطرت اور ڈر کو پرے ڈال اور کل صبح اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کام پر جا اور ہاں یہ بات بھول کر آئندہ ان کے سامنے نہ کرنا ورنہ وہ دونوں بدک کے بھاگ جائیں گے۔"

دو دن بعد میں نے منوں بابا سے کہا تھا کہ مجھے چونا گھولنے کے لئے بڑا ڈرم چاہئے اسی دن اتفاق سے شاہ جہاں پور کے بازاروں میں کسی وجہ سے تمام دکانیں بند تھیں۔

منوں بابا نے کہا...... "بڑا ڈرم ہمارے پاس موجود ہے لیکن وہ سب سے اوپر والی چھت کے اسٹور میں ہے اور وہ اتنا وزنی اور سامان میں پھنسا ہے کہ اسے نکالنے کے لئے کم از کم چار آدمی درکار ہوں گے کیونکہ پہلے گودام سے دوسرا سامان نکالنا پڑے گا۔"

"تو پھر کیا پروگرام ہے؟" میں نے ڈرتے ہوئے کہا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیں خود ہی یہ کہا تھا کہ اوپری منزل میں کسی قیمت پر انہیں بتلائے بغیر نہیں جانا۔

منوں بابا نے ایک لمحے کچھ سوچا اور پھر گہرا سانس اپنے اندر کھینچتے ہوئے بولے۔" تم تینوں میری مدد کے لئے اوپر آؤ۔"

وہ آگے آگے اور ہم ڈرتے ڈرتے ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے جب ہم اوپری منزل کی حدود کی آخری سیڑھی پر پہنچے تو ہمیں انہوں نے ایک جھٹکے سے روکتے ہوئے کہا۔" اوپر ذرا احتیاط سے آنا وہ دراصل چھت پر چھوٹی بی بی رہتی ہیں۔"

"وہ چھت پر ہی رہتی ہیں؟" تلواری رام کے منہ سے بے ساختی یہ سوال نکلا تھا۔

"تم یہاں مزدوری کرنے نہیں ہشاید ہمیں کھوجنے آئے ہو؟"

"معافی چاہتا ہوں بزرگو!" تلواری نے فوراً معافی مانگی تھی۔

جب ہم تینوں چھت پر پہنچے تھے تو وہاں یہ منظر دیکھا...... کہ ایک دبلی پتلی عورت جو کہ شکل وصورت سے حسین ناک نقشہ کی مالک تھی اس کا قد بھی بڑا اچھا تھا وہ بڑی خاموشی سے لیکن بے چینی کے عالم میں چھت پر ٹہلنے والے انداز میں مسلسل یوں چکر لگائے جا رہی تھی جیسے کوئی پھرکی والی موٹر اس کے پاؤں میں لگی ہوئی ہو اس کی آنکھیں مسلسل اس طرح گھوم رہی تھیں جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ ہم نے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی تھی اور منوں بابا کے ساتھ اسٹور کے اندر گھس گئے تھے اور وہاں سے پہلے وہ سامان نکالنا شروع کیا تھا جس میں ڈرم پھنسا ہوا تھا۔

منوں بابا، تلواری رام اور مدھو سنگھ اسٹور کے اندر تھے جبکہ میں باہر تھا اور بہانے بہانے سے اس عورت کی جانب دیکھ رہا تھا وہ یقیناً بڑی پراسرار لگ رہی تھی وہ ایسی کیوں تھی یہ سوال میرے لئے تجسس کا باعث بن رہا تھا۔ لیکن سچی بات ہے میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں منوں بابا سے اس پراسرار عورت کے بارے میں پوچھوں ...... اور پھر مجھے بعد میں بھی ایسا موقع نہیں ملا تھا۔

مدھو سنگھ، ابا کی جگہ سارا کام اور حساب کتاب دیکھ رہا تھا، وہ کیونکہ ابا کا ہم عمر اور پرانا دوست تھا اس لئے جیسا وہ کہتا ویسا ہی مجھے اور تلواری رام کو ماننا پڑتا تھا دوسری جانب منوں بابا بھی جو ہماری مزدوری بن رہی تھی وہ بغیر حجت کے ہمیں دے رہے تھے جب کے ابا کی کمر میں خلاف توقع زخم ہو گئے تھے اور پھر ایک دن بوڑھی مالکن اماں نے مجھے خصوصی طور پر دوسری منزل پر اپنے پاس بلا کر کہا تھا

"بیٹا تمیز الدین! مجھے تو آج ہی تلواری رام نے بتلایا ہے کہ تمہارے ابا جو سیڑھی پھسلنے کی وجہ سے گرے تھے اب ان کی حالت بہت بری ہو گئی ہے اس

نگوڑے منوں بابا نے مجھے کچھ بتلایا تک نہیں۔ بیٹا ہمیں معاف کرنا ہم تو پہلے ہی اپنی زندگی کے ایک عذاب جیسے امتحان میں مبتلا ہیں۔ خدا ہمیں موت بھی آسانی سے نہیں دیتا۔"

"جی آپ تو بہت محبت کرنے والی بزرگ خاتون ہیں، اللہ آپ کو طویل زندگی دے۔" میں نے کہا۔

"زندگی کی خوشیاں سمیٹنے کی عمر تو تمہاری ہے بیٹا، خدا تمہیں لمبی اور صحت والی زندگی دے، میرا کیا ہے بیٹا برسوں سے اس گھر کے اس کونے میں پڑی بیٹی کی صحت اور اپنی موت کی دعا مانگ رہی ہوں۔ خدا میری بیٹی پر رحم فرمائے دعا کرو اس بے قصور کی سزا کسی طرح ختم ہوجائے۔"

انہوں نے جب اپنے منہ سے یہ الفاظ ادا کئے تھے کہ ...... "خدا میری بے قصور بیٹی کی سزا ختم کردے۔" تو میرے کان کھڑے ہوگئے تھے اور پھر میں نے ہمت کرکے پوچھا تھا۔ "آپ کی بے قصور بیٹی کی سزا والی بات سے کیا مراد ہے؟"

میرے سوال پر اماں نے تو پہلے چپ لگالی تھی...... اور پھر انہوں نے بات ٹالتے ہوئے مجھے کہا تھا۔ "تم ابا کا علاج صحیح طریقے سے اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے کرواؤ اور تم اس کے لئے خرچے کی فکر نہ کرنا بلکہ تم ایسا کرو کہ مشہور گورے ڈاکٹر ڈیلفنل سے ابا کا علاج کراؤ وہ بدر پور میں بیٹھتا ہے وہاں جانے کے لئے موٹر گاڑی کا بندوبست ہم کروادیں گے۔"

اور پھر انہوں نے منوں بابا کو حکم دیا تھا کہ وہ میرے ابا کے اچھے علاج کے لئے فوری اقدامات کریں اور ان کے حکم کے مطابق منوں بابا نے ابا کو خصوصی طور پر کرائے کی موٹر گاڑی میں بدر پور لے جا کر ڈاکٹر ڈیلفنل کو دکھایا تھا جو بڑا تجربہ کار اور وچیج گو تھا، اس نے مجھے اور منوں بابا کو ایک طرف لے جا کر صاف صاف بتلادیا تھا کہ سیڑھی سے گرنے کی وجہ سے بابا کی کمر کے دومہرے مکمل طور پر ٹوٹ چکے ہیں اب ان کا علاج کوئی نہیں صرف موت کا انتظار ہے لہٰذا میں صرف اتنا ہی کرسکتا ہوں کہ ان کے لئے درد کش دوائیں تجویز کردوں۔"

ڈاکٹر کی اس بات سے مجھے بڑی ذہنی اذیت ہوئی تھی اور پھر اپنے گھر کا کام ختم ہونے، ہمارا تعلق ختم ہوجانے کے باوجود مالکن اماں نے صرف میرے دل کی تسلی کے لئے شہر در شہر اچھے ڈاکٹر، حکیموں سے ابا کا مہنگا ترین علاج کروایا لیکن ڈاکٹر ڈیلفنل کا کہا سچ ثابت ہوا کہ...... ابا کا علاج صرف موت ہی تھی۔

ابا مرگئے...... ان کے مرتے ہی ایسا لگا جیسے ہماری زندگی کے سمندر میں مدوجزر آگیا ہو، میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، ساری ذمہ داری مجھ پر آ گئی تھی۔

زندگی میں آگے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آرہا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ پریشانی وقتی ثابت ہوئی...... ہوا یوں کہ ابا کی فوتگی کے چند روز بعد اماں مالکن صاحبہ! منوں بابا کے ساتھ موٹر گاڑی میں بیٹھ کر ہمارے گھر آئیں تھیں اور ہماری بہت ہی زیادہ مالی مدد کی تھی وہ جانے سے پہلے میری ماں سے معافی مانگتے ہوئے بولی تھیں۔ "ہم تمہارے خاوند کے قاتل ہیں۔ کاش ہم ماسٹر شبراتی کو اپنے گھر چونے اور پینٹ کے لئے نہ بلواتے۔" انہوں نے بار بار روتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی تھی۔

"بیٹا مجھ دکھی بڑھیا کو معاف کردینا کہ ہمارے گھر میں تمہارے نیک باپ کی بلاوجہ موت ہوئی۔"

"نہیں اماں! اس میں آپ کا کیا دوش ہے۔ ان کی موت آئی ہوئی تھی آ گئی اور ویسے بھی ان کی موت تو حادثاتی طور پر سیڑھی سے پھسلنے کی وجہ سے ہوئی۔"

"نہیں بیٹا! سچ پوچھو تو تمہارے باپ کو ایک نادیدہ مخلوق نے ہم سے دشمنی میں دھکا دیا ہوگا۔"

"اماں جی! یہ جو آپ کافی دنوں سے عجیب سی باتیں کررہی ہیں، میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی کیا

آپ کے گھر میں کوئی اوپری مخلوق ہے؟ اور آپ یہ کیوں کہتی ہیں کہ خدا ہمیں موت دے دے اور میں نے آپ کے گھر کی تیسری منزل پر ایک پریشان حال، بے چین عورت دیکھی ہے آخر ماجرہ کیا ہے؟"

مالکن اماں میرا سوال سن کر ایک ٹھنڈی سانس لینے کے بعد بولیں۔" بیٹا تمیز الدین دراصل ہمارے گھر کی خوشیوں کا قاتل کوئی ایک نہیں کئی کردار ہیں لیکن میں تمہیں اس گھر کی بربادی کی کہانی اپنی زبانی نہیں سنا سکتی، اس کی کچھ وجوہات ہیں۔"

میں نے پوچھا۔" ایسی کون سی وجوہات ہیں جو آپ اپنے گھر کی کہانی سنانے سے گریزاں ہیں؟"

"بس بیٹا کچھ عمروں اور ناطوں کا فرق اور تقدس والی مجبوری ہے جو تمہیں تمہارے دل کے اندر اٹھنے والے سوالات کا جواب نہیں دے سکتی ہم ایسا کرو میرے گھر کی کہانی اور اپنے باپ کی موت کا کارن منوں بابا سے سن لینا۔"

"منوں بابا نے مجھے ایک بار ایسا سوال کرنے پر ڈانٹ دیا تھا وہ تو مجھے کچھ نہیں بتلائیں گے۔" میں نے فوراً ہی کہا۔

" بیٹا میں منوں بابا سے کہوں گی کہ تمہارے تجسس کو ختم کر دے کیونکہ اب وقت کا تقاضہ کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ تمہیں اس گھر کی حقیقت بتا دی جائے کیونکہ میرا ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ تمہیں اس گھر کی بھیانک کہانی نہ سنائی جائے جہاں تمہارے ابا کی موت ہوئی تم کل صبح آنا، منوں بابا تمہارے دل میں اٹھنے والے سوالات کا جواب ایک کہانی کی صورت میں دیں گے۔"

دوسری دن صبح کے وقت میں مالکن اماں کے گھر پہنچ گیا تھا انہوں نے مجھے بیٹھا کر منوں بابا کو آواز دی تھی وہ آئے تو انہوں نے مجھے کہا۔

"تمیز الدین تم ایسا کرو میرے ساتھ چھت پر آؤ لیکن پہلے تم مالکن کے ساتھ چائے پانی کر لو۔"

چائے پینے کے بعد منوں بابا نے مجھے اوپر سیڑھیوں کی جانب آ جانے کا اشارہ کیا تھا اور میں جب ان کے ساتھ چھت پر پہنچا تو وہاں اس عورت کو اسی طرح بے چین، مسلسل ٹہلتے دیکھا تھا۔ اس کے چلتے قدموں میں ایک لمحے کے لئے بھی توقف نہ تھا۔ میری نگاہیں اس عورت کے خط الحواس سراپے کا طواف کر رہی تھیں کہ منوں بابا نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرواتے ہوئے کہا تھا۔

" پہلے تو میں تم سے اس گزشتہ رویے کی معافی مانگتا ہوں جب میں نے تمہیں ڈانٹا تھا...... کہ تم ہماری ذاتی زندگی میں دخل نہ دو۔"

میں نے کہا۔" منوں بابا آپ میرے لئے قابل احترام ہیں، آپ اس بات پر پشیمان نہ ہوں۔"

منوں بابا کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولے۔" میں کبھی، کسی قیمت پر اس گھر کے تاریک گوشوں سے پردہ نہ اٹھاتا لیکن مالکن کے حکم نے مجھے اپنی زبان کھولنے پر مجبور کر دیا ہے۔ بیٹا! تم جو یہ سناٹے سے بھرا پراسرار گھر اور اس ٹہلتی خاموش لڑکی کو دیکھ رہے ہو بخدا پہلے ایسی نہ تھی یہ تو بہت شوخ چنچل، ایم اے پاس پڑھی لکھی باشعور لڑکی تھی اور اس گھر میں تو خوشیاں رقص کرتی تھیں اس لڑکی کا نام رانی ہے یہ اپنی بڑی بہن پروین کے بعد دوسرے نمبر پر تھی ان دونوں سے پہلے ان کے باپ سیٹھ اسماعیل اولادیں پیدا ہو کر جوانی کی حدود کو چھونے سے پہلے ہی راہ عدم ہو گئی تھیں۔ بہرحال اس گھر میں تین بھائی رہا کرتے تھے ان تین بھائیوں میں اس کا باپ سیٹھ اسماعیل سب سے بڑا تھا دوسرا چھوٹا بھائی مختار کے بیٹے طفیل سے اور رانی کی منگنی حکیم الدین کے بیٹے رؤف سے ہوئی تھی تینوں بھائیوں اور بھاوجوں میں اتفاق بہت تھا یہی وجہ تھی کہ تینوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کی شادیاں آپس میں کر لیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

پروین نے جب ایف اے کیا تو اس کی شادی طفیل سے ہو گئی جبکہ رانی کی شادی اس لئے رکی ہوئی تھی کہ اس کا منگیتر رؤف انگلینڈ میں پڑھ رہا تھا...... اسی دوران مختار یعنی پروین کے سسر کو بمبئی میں اچھا مکان مل

گیا تھا لہٰذا پروین کو وہاں جانا پڑا تھا۔ ادھر رانی نے بھی اپنی تعلیم کو جاری رکھا تھا وہ ایم اے کرنے کے بعد کسی کالج میں لیکچرار بننا چاہتی تھی رؤف اس سے بہت محبت کرتا تھا وہ دیارِ غیر (انگلینڈ) سے اس کو نہ صرف محبت نامے بلکہ تحائف بھی بھیجتا تھا۔ رانی اپنے چچاؤں اور باپ کی چہیتی اور مرکزِ نگاہ تھی۔

اس گھر کے تمام باسی انتہائی سکھی اور خوشگوار زندگیاں گزار رہے تھے اور پھر اس خاندان کی بربادی کا آغاز کچھ اس طرح ہوا تھا...... کہ ایک دن رانی کی بہن پروین کا خط بمبئی سے آیا کہ وہ شاہ جہاں پور آنا چاہتی ہے دراصل اس کے ہاں اولاد نہیں ہو رہی تھی اس نے پچھلے تین سالوں میں بہت سے ٹوٹکے ڈاکٹری، حکیمی علاج کیے تھے لیکن سب سے بے فائدہ رہا تھا اولاد ہونے کی سبیل نظر نہیں آ رہی تھی دوسری جانب اس کی ساس اور خاوند طعنے تشنے دے رہے تھے پروین نے خفیہ طور پر لکھے اس خط میں لکھا تھا کہ "میرا خاوند میری بے اولادی کے باعث سوتن لانا چاہتا ہے مجھے کسی نے مشورہ دیا ہے کہ شاہ جہاں پور میں ایک کرسچن تعویز گنڈے کرنے والا ہے میں اس سے ملوں وہ اولاد کے مسئلے کے بارے میں بہت مشہور ہے، اس کے علاج سے کافی لوگوں کو فائدہ حاصل ہوا ہے میں اس غرض سے گھر آنا چاہتی ہوں۔"

پروین جب شاہ جہاں پور اپنے گھر آئی تو اس کے گھر والوں نے ابتدائی طور پر اس کرسچن عامل کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو انہیں پتہ چلا کہ اس عامل کے عمل کے باعث بے اولاد جوڑوں کے ہاں بچے ہوئے ہیں۔

پروین کے ماں باپ نے اپنی بیٹی کو اجازت دے دی تھی کہ وہ مذکورہ کرسچن عامل کے پاس چلی جائے۔ طے یہ ہوا تھا کہ پروین کے ساتھ اماں جائیں گی لیکن اس روز اتفاق سے اماں بیمار ہو گئی تھیں سو ان کی جگہ پروین نے رانی کو کہا تھا کہ تم میرے ساتھ چلو۔

پروین اور رانی جب اس کرسچن عامل کے پاس پہنچی تھیں تو وہاں جو ل پڑیں کہ...... ان کی نگاہوں کے سامنے اللہ معاف کرے بدشکل چیچک زدہ کالی سیاہ رنگت والا ادھیڑ عمر کا آدمی موجود تھا وہ شکل وصورت سے عورت پرست قسم کا لگ رہا تھا اس نے پروین کو کہا کہ...... وہ اسے ایسا موثر ٹوٹکا بتائے گا جس کی بدولت اس کے ہاں اولاد ضرور پیدا ہو گی اور وہ بھی جڑواں لیکن اس کی قیمت اسے پیسے میں نہیں کسی اور صورت میں دینی ہو گی۔

پروین نے پریشانی کے عالم میں پوچھا تھا کیا قیمت؟

اس بدشکل کرسچن عامل نے رانی کے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اولاد ہونے کی صورت میں اس لڑکی کی شادی مجھ سے کر دی جائے۔"

پروین اس وقت اپنی غرض میں اتنی محو تھی کہ اس نے عامل کی اس بات کا دھیان نہ دیا تھا دوسری جانب رانی نے اس بات کو عامل کا مذاق سمجھتے ہوئے کہا تھا۔ "ہاں میں تم سے شادی کر لوں گی تو بس میری بہن کی ماں بننے کی تمنا پوری کر دے۔"

عامل نے پروین کو ٹوٹکا بتاتے ہوئے کہا تھا۔ "میری اس شرط کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، اس سال خداوند نے چاہا تو تیری کوکھ سے دو خوبصورت لڑکے پیدا ہوں گے یہ میری طرف سے گارنٹی ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر پروین نے اپنے پرس سے اس زمانے کا لحاظ سے سو روپے جب کرسچن عامل کو دیئے تو اس نے اسے واپس کر دیئے اور پھر رانی کی طرف عاشقانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھ سے شادی والے اپنے وعدے پر قائم رہنا۔" پروین جو ٹوٹکا لینے کے بعد عامل کی جانب سے دو بیٹوں کی خوش خبری سن کر پاگل ہو رہی تھی اس نے عامل کے منہ سے نکلے ہوئے رانی کے بارے میں الفاظ پر ذرا برابر بھی غور نہ کیا۔

اور پھر ٹھیک دس ماہ بعد واقعی پروین کے ہاں دو خوب صورت جڑواں بیٹوں نے جنم لیا...... اور وہ

اپنے سسرال، خاوند اور خاندان میں سرخرو ہوگئی تھی۔

وہ جب اپنے دونوں نومولودلڑکوں کو لے کر شاہ جہاں پور آئی تھی تو سیٹھ اسماعیل اور پروین نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کرنچن عامل کو اس وقت کے لحاظ سے ہزار روپے اور کچھ تحائف دیں گے اس کام کے لئے وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے تھے ہم جب اس کرنچن عامل کے گھر پہنچے تھے تو وہاں اس نے بڑے دلیرانہ انداز میں کہا تھا۔

''مجھے یہ سب نہیں چاہئے مجھے تو رانی سے شادی کرنی ہے وہ تو مجھ سے وعدہ کر کے گئی تھی۔''

سیٹھ صاحب، پروین اور مجھے اس کے منہ سے یہ الفاظ سن کر شدید غصہ آیا تھا۔

''منہ سنبھال کر بات کر بے غیرت۔'' سیٹھ صاحب نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اس نے بڑے آرام سے جواباً کہا۔''آپ مجھے یہ الفاظ نہ کہیں، میں نے تو اپنے کام کا معاوضہ مانگا ہے اور ویسے بھی تمہاری بیٹی نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا پوچھ لو یہ سامنے کھڑی ہے۔''

''کیا بکواس کررہے ہو؟'' پروین نے اسے لتاڑتے ہوئے کہا۔''ذلیل انسان، میری بہن کی چچا کے بیٹے سے منگنی ہوگئی ہے۔'' اور پھر پروین نے اپنی برداشت کے دائرے سے نکلتے ہوئے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اور اسماعیل صاحب نے اس کو بہت مار لگائی۔

''تمہیں میری بے عزتی بہت مہنگی پڑے گی، دیکھنا میں تم لوگوں کا کیا حال کرتا ہوں۔'' کرنچن عامل نے اپنا خون آلودہ چہرہ صاف کرتے ہوئے ہمیں یہ دھمکی دی تھی۔ ہم نے پولیس میں رپورٹ بھی کی تھی لیکن تھانے والوں نے اپنی مٹھی گرم کر کے اسے فارغ کردیا تھا۔

وہ عامل بہت جنونی انسان تھا۔ اس نے پھر یہ کیا کہ ایک روز بھرے بازار میں رانی کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا۔''تو مجھ سے وعدے کے مطابق شادی کرلے تو میرے دل کو بھاگئی ہے اور اگر تو نے مجھ سے شادی نہ کی تو یاد رکھ میں تجھے کسی مرد کے قابل نہ چھوڑوں گا دنیا تجھ پر تھوکے گی۔'' وہاں موجود دکانداروں نے اس کی خوب پٹائی کی تھی تو وہ چلا گیا تھا۔

ادھر رانی کی بہت بدنامی ہوگئی تھی۔ اس نے انگلینڈ رؤف کو خط لکھا تھا کہ''خدا کے لئے سب کچھ چھوڑ کے فوراً آؤ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آگیا ہے۔''

رؤف فوراً ہی انگلینڈ سے آگیا تھا۔ وہ بڑے دل والا، پڑھا لکھا اور شریف انسان تھا۔ اس نے تمام حالات جاننے کے باوجود رانی اور رؤف کے گھر والوں نے طے کیا تھا کہ شادی کے فوراً بعد رانی انگلینڈ چلی جائے گی ان کے اس اقدام سے رانی اس منحوس کرنچن سے دور ہوجائے گی۔

رانی کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی لیکن رؤف جب رات کو دلہن کے کمرے میں گیا تو اس نے گھونگھٹ اٹھاتے ہی اسے بوسہ محبت دینے کے بجائے اپنی ناک پر رومال رکھ لیا تھا۔

رانی نے حیرت سے پوچھا۔''کیا بات ہے؟ کیا میں دلہن نہیں کوئی بھنگن ہوں جو آپ نے اس طرح اپنی ناک پر رومال رکھ لیا ہے؟''

رؤف خاموشی سے اسے دیکھتا رہا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔

رانی نے تنگ آکر اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا تھا۔''کیا بات ہے تم یکدم جھٹکے سے میرے وجود سے علیحدہ کیوں ہوگئے ہو؟''

اب رؤف نے آہستہ سے لب کھولتے ہوئے کہا تھا۔''مجھے تمہارے وجود سے عجیب سی بدبو آرہی ہے۔''

''یہ تم کیا بکواس کررہے ہو؟'' رانی نے روتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں رانی تمہارے بدن سے......''

رانی تو جیسے جنون میں آگئی تھی اس نے رؤف

کو جھنجھوڑا اور چلاتے ہوئے کہا تھا۔ "دیکھو میں گلاب اور ابٹن جیسی خوشبوؤں سے نہائی ہوں تم کیسی پاگلوں جیسی بات کررہے ہو؟" وہ بری طرح چیخنے چلانے لگی تھی۔

رانی کیونکہ اسی گھر میں بیاہ کر اسی گھر کے دوسرے پورشن میں آ گئی تھی اس لئے اس کی چیخ و پکار نے رانی اور رؤف دونوں کے گھر والوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

سب لوگ حجلہ عروسی کے دروازے پر بہت پریشان کن انداز میں پہنچے تھے۔ جہاں عذاب پڑا ہوا تھا۔ بڑی بیگم اور سیٹھ اسماعیل نے گھبرا کر رؤف سے پوچھا تھا کہ "آج تمہاری خوشیوں والی سہاگ رات ہے پھر یہ کیا ماجرہ ہے؟"

اس پر رؤف نے بہت مایوس کن انداز میں کہا تھا۔ "رانی کے جسم سے بہت بری بدبو آ رہی ہے۔"

"بیٹا، تم کتنی بھونڈی اور عجیب بات کررہے ہو؟ دیوانے ہوگئے ہو کیا؟" رؤف کی ماں نے اسے غصے اور ڈانٹتے ہوئے کہا تھا۔

"میں کوئی دیوانہ نہیں ہوں، میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ رانی کے وجود سے بدبو آ رہی ہے۔"

رؤف کی یہ بات سن کر بڑی مالکن نے جنونی حالت میں سب کو دھکا دیا تھا اور آگے بڑھ کر پاگلوں کی طرح رانی کے جسم کو اپنی ناک لگا کر سونگھتے ہوئے بولی تھیں۔

"ارے بے وقوف...... اس کے جسم سے تو حنا، ابٹن، گلاب اور دیگر چیزوں کی خوشبو آ رہی ہے ......رؤف......! تم نے کیوں اپنی سہاگ رات کو تماشہ بنا کر رکھ دیا ہے؟"

"نہیں، نہیں، میں سچ کہہ رہا ہوں۔" رؤف اب بھی اپنی بات پر قائم تھا۔

"اچھا بیٹی تم ایسا کرو کہ میرے کمرے میں چل کر سو جاؤ اور رؤف مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم بیمار ہو تم بھی آج رات علیحدہ سو جاؤ صبح کچھ فیصلہ کریں گے۔"

صبح ہوئی تو دونوں والے دن گھر کے تمام افراد یعنی سسرال اور میکے والے افسردگی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

اس رات رؤف کو بزرگوں نے سمجھا بجھا کر رانی کے کمرے میں بھیجا۔ رانی کے جسم پر کئی قیمتی خوشبو اور عطریات کی بوتلیں انڈیلی گئیں پورا کمرہ دلکش خوشبوؤں سے مہک گیا تھا سب کو امید تھی کہ بگڑی بات بن جائے گی لیکن اس بار بھی رؤف کو رانی بدبو سے بھرا گٹر لگی تھی۔ اس نے بہت مجبوری والی کیفیت میں رانی سے رخ موڑ کر کہا تھا۔

"میں تمہیں دل سے اپنی بیوی مانتا ہوں، یہ جو کچھ بھی تمہارے ساتھ ہورہا ہے اس کے باوجود مجھے تم سے محبت ہے لیکن میں تمہیں زوجیت کا حق نہیں دے سکتا اور نہ تمہارے ماتھے پر طلاق کا کلنک لگاؤں گا۔" یہ کہہ کر رؤف کمرے سے یوں نکلا تھا جیسے رانی کے دل سے نکلا ہو۔

رانی تو بیاہی، ان بیاہی سی ہوگئی تھی۔ اردگرد کی عورتیں اور باتیں بنانے والے اسے آدھی دلہن کا طعنہ دیا کرتے تھے۔ ان حالات کے باعث سیٹھ اسماعیل اور عبدالحکیم کی لڑائی ہوگئی رؤف واپس انگلینڈ چلا گیا۔ خوشیوں بھرے گھر میں اداسی نے ڈیرے ڈال لئے۔

پروین اور اس کے شوہر نے رانی کو جگہ جگہ ڈاکٹروں، حکیموں اور مولویوں تعویذ گنڈے والوں کو دکھایا سب نے مشترکہ طور پر یہی جواب دیا تھا کہ رؤف کے دماغ میں شاید کوئی جادو کردیا ہے ورنہ تو رانی بظاہر میڈیکلی طور پر ٹھیک ہے البتہ ایک کالے علم کرنے والے نے یہ بتایا تھا کہ رانی پر اس کرسچن عامل نے کچھ ایسا عمل کروادیا ہے کہ جو بھی مرد اس کے قریب جائے گا وہ اس کے جسم سے نکلنے والی بو سے نفرت کرے گا اور یہ بدبو صرف اس کے قریب جانے والے مرد کو ہی محسوس ہوگی۔

رانی اب سارا وقت اس دن کو کوستی اور پروین سے لڑتی رہتی کہ "کاش میں تمہارے ساتھ اس حرام

زادے عورت پرست عامل کے پاس نہ جاتی اور اس سے مذاق میں یہ نہ کہتی کہ میں تجھ سے شادی کروں گی کاش، میں اس کے منہ پر اسی لمحے تھپڑ رسید کر دیتی۔"

رانی کے حالات دن بدن بدتر ہونے لگے تھے۔ رؤف اپنی تعلیم وغیرہ مکمل کر کے مکمل طور پر انگلینڈ میں سیٹ ہو گیا تھا لیکن اس نے رانی کو نہ تو طلاق دی تھی نا ہی اپنے پاس بلایا تھا۔ اب رانی تقریباً روزانہ اسے خط لکھتی تھی کہ "رؤف مجھے تم سے شدید محبت ہے دیکھو میرے وجود سے اب بدبو نہیں آتی۔ خدا کے لئے لوٹ آؤ لیکن اسے وہاں سے کوئی جواب نہ آتا تھا۔ بالآخر وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی تھی۔

اور پھر ایک روز رانی نے شدید مایوسی اور پریشانی کے عالم میں یہ شرمناک حرکت کی تھی کہ "اس نے محلے کے ایک بچے کو بلا کر اپنا جسم چیک کرنے کی خاطر اسے اپنا وجود دکھایا اور سنگھایا تھا...... لیکن اس بچے نے بھی شدید گھبراہٹ کے عالم میں یہ کہا تھا۔

"باجی...... مجھے تمہارے بدن سے مرے ہوئے چوہوں کی بو آ رہی ہے۔"

پھر ایک دن یہ ہوا کہ رانی گھر سے غائب ہو گئی، اسے بہت تلاش کیا اور پولیس میں رپورٹ درج کروائی تو پتا چلا کہ وہ اس کرسچن عامل کے گھر چلی گئی تھی اور اس کو قتل کرنے کے لئے تیز چھری سے اس پر وار کئے تھے رانی کو پولیس نے عامل پر حملہ کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا تھا جبکہ شدید زخمی عامل نے چوتھے روز یہ کہہ کر دم توڑ دیا تھا کہ "رانی...... تو نے مجھ سے شادی نہیں کی تو وعدہ خلاف ہے دیکھ تو اب ساری زندگی کسی مرد کی قربت کو ترسے گی جو بھی مرد تیرے قریب آئے گا وہ تجھے دھتکارے گا تو اور تیرے گھر والے ساری زندگی مصائب کا شکار رہیں گے تم موت مانگو گے تو وہ بھی تمہارا مذاق اڑا کر چلی جائے گی اور میں مرنے کے بعد بھی تمہارے گھر کے درودیواروں میں بس کر بدروح کی شکل میں تمہیں بے سکون کرتا رہوں گا۔"

"بس بیٹا! یہ سب کہہ کر وہ عیسائی عامل مر گیا اس کے ساتھ ہی سیٹھ اسماعیل بیٹی کے صدمے میں مر گئے تھے رانی کو عدالت نے عامل کے چال چلن میں خراب سے واقف ہونے کے بعد اس کے قتل کے جرم میں سزائے موت کے بجائے دس سال کی سزا سنائی تھی وہ جیل کی سزا میں ہی پاگل ہو گئی تھی چچا حکیم اور ان کا کنبہ اس منحوس مکان سے چلے گئے تھے۔

اب اس گھر میں بڑی مالکن اور رانی بی بی ہیں اور بیٹا...... ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا ہم اگرچہ تمہارے ابا کی بے وقت موت کے ذمہ دار تو نہیں ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ گھر اس کا باعث بنا۔ وہ خبیث عامل تو مر گیا لیکن اس کی روح اب بھی اس گھر کے درودیوار میں ہمارا سکون اور خوشیوں کو برباد کرنے کے لئے ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اس کی بھٹکتی روح جب کبھی بھی نظر آتی ہے کہ اس گھر کو سجایا جا رہا ہے یا اس کی خوشیوں کا کوئی سامان ہو رہا ہے تو وہ کسی حیلے بہانے اسے پامال کر دیتی ہے اس روز جب تمہارے ابا تم اور تلواری رام چونے اور پینٹ کا کام کر رہے تھے تو میں بڑی مالکن کے کمرے میں موجود ان کی معمول کی دوائی بنا رہا تھا تو اچانک میرے ہاتھ سے دوائی کی شیشی بے اختیار گر کر ٹوٹ گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی مجھے درودیوار میں جو اسرار محسوس ہوا تھا یہ سب کچھ بس میں محسوس کرتا ہوں اور سمجھ جاتا ہوں کہ...... اس خبیث عامل کی روح کوئی شیطانی حرکت کرنا چاہ رہی ہے بس اسی لمحے نیچے سے تمہارے ابا کی سیڑھی گرنے کی آواز آئی تھی۔ ظالم کرسچن عامل کی روح اپنا کام کر چکی تھی۔"

منوں بابا نے یہ کہانی مکمل کرنے کے بعد مجھ سے کہا تھا...... "بیٹا...... میری تم سے استدعا ہے کہ تم نیچے اتر کر اب کہیں رکنا نہیں سیدھے اپنے گھر جانا...... اور کبھی اس طرف لوٹ کر نہ آنا۔" میں نے اس گھر سے نکلتے ہوئے جب آخری بار بے چین ٹہلتے رانی کو دیکھا تو...... وہ اپنے بازوؤں کو مسلسل سونگھے جا رہی تھی۔



نیا گھر

نیناخان-کراچی

رات کے بارہ بجے جب خوب صورت لڑکی کی نظر سامنے اسٹور پر پڑی تو وہ انتہائی خوفزدہ انداز میں چیخنے لگی مگر اس وقت اس کی آواز دوسروں کو سنائی نہ دی اس کی سانسیں رک گئیں اور پھر......

کیا عقلمند لوگوں کا کہنا ٹھیک ہے کہ نیا گھر دیکھ بھال کر لیں، حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

یہ بات آج سے چھ سال پرانی ہے۔ جب میرے سب سے چھوٹے ماموں واحد خان کی شادی کے لئے لڑکیاں تلاش کی جانے لگیں اور کافی لڑکیوں کی سلیکشن کے بعد آخرکار ایک مناسب لڑکی پسند آ ہی گئی۔ سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے کچھ ڈیمانڈز بھی تھیں ماموں کی کہ لڑکی آج کے ماحول سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ شریف خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ آج کل کے ماحول سے مطابقت نہ رکھنا اب کافی مشکل ہے۔ بہرحال ماموں کی مرضی کے عین مطابق لڑکی پسند آ ہی گئی اور فوراً ہی رشتہ بھی طے ہو گیا۔ اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ ماموں کو گھر میں کونسا کمرہ دیا جائے۔ کیونکہ سب ہی ماموں کی شادی ہو چکی تھی اور گھر کے تمام کمرے پورشن سمیت ماموں ممانی کے پاس تھے جن میں وہ اپنے بچوں کے ساتھ مقیم تھے۔

اور فیملی بھی دن بدن بڑھتی ہی جا رہی تھی اس لئے چھوٹے ماموں کے لئے الگ سے پورشن بنانا مشکل ہوگیا تھا۔ گراؤنڈ فلور میں ڈرائنگ روم تھا اور ساتھ والا کمرہ نانی کا تھا۔ امی کیونکہ نانی کی اکلوتی بیٹی اور چھ بھائیوں کی اکلوتی بڑی بہن تھیں جس کی وجہ ہم سب بہن بھائی نانی ماموں سے بہت کلوز تھے اور دوستوں کی طرح رہتے ہیں۔ تمام ممانیوں کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات ہیں۔ اس لئے نانی کے گھر کے ہر پروگرام میں ہم پہلے سے ہی رکنے چلے جاتے اور خوب انجوائے کرتے ماموں ممانیوں اور کزن کے ساتھ۔

جب ماموں کی شادی کے دن نزدیک آئے تو بڑے ماموں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نا وہ ایک بڑا گھر خریدلیں جس میں تمام بھائی آرام سے مل کر رہیں۔ لیکن نانی پرانا گھر چھوڑ کر نئے گھر میں جانے کے لئے قطعی راضی نہیں تھیں۔ کیونکہ اس گھر سے نانا کی یادیں جڑی تھیں وہ شادی ہوکر اسی گھر میں آئی تھیں تمام ماموں نانی کو راضی کرنا چاہتے تھے مگر نانی کسی بھی قیمت پر راضی ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں دوسری طرف واحد ماموں کی شادی ایک مسئلہ بن کررہ گئی تھی پہلے لڑکی بڑی مشکل سے ملی اب گھر کا مسئلہ کھڑا ہوگیا تھا۔

آخر کار امی کی مدد سے بڑے ماموں نے نانی کو راضی کر ہی لیا۔ بات یوں طے ہوئی کہ تین ماموں نانی کے ساتھ پرانے گھر میں رہیں گے اور تین بھائی الگ گھر میں شفٹ ہوجائیں گے۔ اور اسی گھر میں واحد ماموں کی شادی بھی کریں گے بڑے ماموں ایک بزنس مین ہیں اپنے بزنس کے سلسلے میں کبھی ملک سے باہر تو کبھی شہر سے باہر جاتے آتے رہتے ہیں۔ کام کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے وہاں اپنے دوستوں سے گھر خریدنے کی بات کی کہ اپنے ایریا کے قریب کے ایریا میں ہی کوئی گھر خریدنا چاہتے ہیں۔ تو ان کے ایک دوست نے جھٹ سے کہا۔

”یار میں بھی تو اپنا گھر فروخت کر رہا ہوں اور میرے گھر کا ایریا تمہارے گھر سے قریب ہے پیدل بھی آیا جایا سکتا ہے پھر تو تم سب بھائیوں کے پاس بائیک ہے گاڑی ہے کیا پروبلم ہے کراچی چل کر میرا گھر دیکھ لو اور اگر پسند آجائے تو لے لو۔“

دوست کی بات سنتے ہی ماموں نے بس اسٹاپ نزدیک ہونے کی وجہ سے گھر کی لوکیشن کا پوچھ کر ٹوکن منی اسی وقت دوست کو دے دی اور گھر کے پیپرز اپنے نام کروانے کا بھی کہہ دیا ساتھ ہی چھوٹے ماموں کو کال کر کے دوست کے گھر سے چابی لے کر گھر کا کلر کروانے کا کہہ دیا۔ بڑے ماموں کے آنے سے پہلے ہی چھوٹے ماموں اس نئے گھر میں کلر کروا چکے تھے ساتھ ہی تھوڑا بہت سیٹ بھی کروا دیا تھا۔

بڑے ماموں کے آتے ہی بڑے ماموں کی فیملی کے ساتھ ہی دوسرے نمبر کے ماموں سعید خان اپنی بیوی بچوں کے ساتھ نئے گھر کے سیکنڈ فلور پر شفٹ ہوگئے تھے جبکہ فرسٹ فلور پر بڑے ماموں اور واحد ماموں کے کمرے تھے۔ گراؤنڈ فلور پر کچن لاؤنج ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ روم کے ساتھ والا روم بڑے ماموں کے بڑے بیٹے حسن کا تھا۔ گھر پرانی طرز کا بنا ہوا تھا انٹرنس ایک پتلی سی گلی نما تھی اسی کے ساتھ ہی فریج رکھا ہوا تھا۔ لاؤنج میں ہی بیٹھک بنا رکھی تھی دری چادر بچھا کر وہاں کھانا کھاتے تھے۔ سامنے ہی کچن اور کچن کے ساتھ اٹیچڈ باتھ تھا۔ بیٹھک کے ساتھ دو کمرے ایک ڈرائنگ روم اور دوسرا حسن کا روم تھا روم کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں سیڑھیوں کے پہلے اسٹیپس کے ساتھ ہی سامنے ایک اسٹور بنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے اسٹیپس تھے پھر دو کمرے جس میں ایک بڑے ماموں اور دوسرے میں واحد ماموں رہتے تھے اسٹور کے ساتھ ہی اٹیچڈ باتھ بھی بنا ہوا تھا۔

اب اس نئے گھر میں شفٹ ہوتے ہی واحد ماموں کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور ساتھ ہی

بڑے ماموں نے سیٹ ہونے کے بعد ہماری اور نانی ماموؤں کی دعوت کی تاکہ ہم سب گھر بھی دیکھ لیں اور واحد ماموں کی شادی کی تیاری بھی مل کر ممانیوں کے ساتھ کریں۔ دعوت کا سن کر کہ نئے گھر میں دعوت ہے تو امی اور میں مارکیٹ سے نئے گھر میں سجانے کے لئے گفٹ کے طور پر وال کلاک لے کر آئے۔ امی اکلوتی بہن ہیں جس کی وجہ سے تمام بھائی بہت اہمیت دیتے ہیں اور ہر پروگرام میں پہلے سے انہیں بلایا جاتا ہے اور بہت سے کاموں کی ذمہ داریاں بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔

بہر حال جب ہم سب ماموں کے نئے گھر میں پہنچے تو کزنز کے ساتھ مل کر گھر دیکھنے لگے بڑے ماموں اور دوسرے نمبر کے ماموں کے بچوں سے بہت دوستی بھی ہے اب جب گراؤنڈ فلور دیکھنے کے بعد اوپر پورشن میں جانے کے لئے سیڑھیوں کے پہلے اسٹیپس پر قدم رکھتے ہی اوپر اسٹور جس کا لوہے کا گیٹ تھا جب اس اسٹور پر میری نظر پڑی تو مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا۔ بچپن سے ہی میرا سکس سنس بہت شارپ ہے۔ میں نے اس خوف کو اگنور کر دیا اور ہم سب ہنسی مذاق کرتے ہوئے فرسٹ اور سیکنڈ فلور پر گئے۔ سیکنڈ فلور پر بھی دو کمرے ایک کھلا صحن تھا اور کچن ایک کمرے میں دوسرے نمبر کے ماموں ان کی بیوی اور چھوٹا بیٹا قاسم رہتے جبکہ دوسرے کمرے میں بڑی بیٹی اقراء کا تھا ہم صحن میں ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسی مذاق میں مصروف ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی نجانے کیوں مجھے اس اسٹور سے عجیب سے احساس کا خیال آ رہا تھا کزنز سے ہٹ کر میں جب اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔

"عظمیٰ پتا نہیں کیوں مجھے اس اسٹور سے خوف محسوس ہوا بار بار اس کا خیال آ رہا ہے۔"

میری بات سن کر ہنستے ہوئے اس نے کہا۔

"آپی یہ سب تمہارا وہم ہے۔ تم خیالوں میں کچھ اچھی چیزیں لاؤ۔ ایسی ہی چیزوں کے بارے میں سوچنا بس۔"

بہن کی بات سن کر میں مسکرا کر چپ ہو گئی کیونکہ بار بار ہم سب بھی اوپر جاتے تو کبھی نیچے آتے اور پتا نہیں کیوں میری نظریں اس اسٹور کے گیٹ پر ٹھہر رہی تھیں اور اس کے سامنے سے گزرنے پر میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ میں گراؤنڈ فلور میں بیٹھی تھی کہ عظمیٰ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

"آپی تم ٹھیک کہہ رہی تھیں بار بار اوپر پورشن میں آنا جانا کرنے پر جب میں نے بھی غور کیا تو اسٹور کا گیٹ دیکھ کر مجھے بھی خوف سا محسوس ہوا عجیب سی وحشت آ رہی ہے گیٹ دیکھ کر۔"

میں نے اسے فوراً کہا۔ "عظمیٰ ہم تو یہاں سے چلے جائیں گے بس اس بات کا ذکر کسی کزن سے مت کرنا۔ ان لوگوں کو تو رہنا ہے یہاں فضول میں ڈر نہ جائیں اور حسن تو خوب مذاق بنائے گا چپ رہنا......"

میری بات سن کر عظمیٰ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم سبھی بہن بھائی اور ابو امی نماز پڑھنے کے پابند ہیں۔ اور گھر میں ذکر وغیرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے چھٹی حس تیز ہو گئی ہو۔ بہر حال رات میں دعوت کا کھانا کھا کر ہم اپنے گھر واپس آ گئے۔ لیکن اکثر ماموں کی شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں جانا آنا لگا ہی رہتا تھا۔ اب وہ دن آ ہی گیا جب ماموں کی شادی کے دن قریب آ گئے اور ہم سب وہاں رکنے کے لئے چلے گئے۔

جس دن ہم اس گھر میں پہنچے تو رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بڑی ممانی اپنے پورشن میں سب کو شادی کے سوٹ وغیرہ دکھانے لگیں۔

بڑے ماموں نے کہا۔ "نینا بیٹا آج چائے تم بناؤ۔" وہاں سب چائے کے حد درجہ شوقین ہیں تینوں ٹائم کھانے کے بعد چائے لازمی پی جاتی شام میں الگ اور اس کے علاوہ بھی آنے جانے والوں کے ساتھ چائے پینے کا سلسلہ چلتا رہتا۔

اب میں بڑے ماموں کی بات سن کر اوکے کر کے گراؤنڈ فلور پر آ گئی۔ گزرنا مجھے اسٹور کے

سامنے سے ہی تھا سب تو اوپر پورشن میں تھے اور مجھے اکیلے نیچے چائے بنانے آنا تھا۔ میں چند اسٹیپس اتر کر اسٹور کے سامنے کھڑی ہوگئی اسے دیکھنے لگی تو میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے، خوف محسوس ہوا، میں فوراً ہی دوسرے اسٹیپس سے اتر کر نیچے کچن میں آ کر چائے بنانے لگی اور انتظار کرنے لگی کہ جلدی سے چائے بن جائے۔

اللہ اللہ کر کے چائے تیار ہوئی تو میں سب کے لئے چائے ٹرے میں سجا کر اوپر جانے لگی پہلے سیڑھی کے اسٹیپ پر قدم رکھتے ہی میری نظر سامنے اسٹور پر گئی اور میں وہیں ساکت کھڑی اسے دیکھنے لگی پھر بہت ہمت کر کے چائے لے کر روم میں پہنچی تو کچھ جان میں جان آئی۔

اس وقت رات کے تقریباً 12 بجے ہوں گے اور ہم سب چائے پی رہے تھے کہ سب کو چینی کم لگی اور مجھے پھر سے سب کے کہنے پر چینی لینے بھیجا گیا۔ میں بھی اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں ہوں۔ ڈر محسوس ہونا ایک فطری عمل ہے مگر ایک اشرف المخلوقات میں سے ہونے کی وجہ سے ڈر پر قابو پانا ہی عقلمندی ہے۔ میں ڈر کو خود پر حاوی نہیں کرتی۔ مگر سچ تو یہ تھا کہ میں خوف محسوس کر رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظر اس اسٹور کے بند گیٹ پر ٹھہر رہی تھی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

چینی لینے کی غرض سے میں کچن میں آ کر واپس اوپر جانے کے لئے پہلے اسٹیپ پر قدم رکھا تو میری نظر پھر سے اسٹور کے بند گیٹ پر ٹھہر گئی میں اوپر جانے کے لئے قدم بڑھانا ہی چاہتی تھی کہ میرے قدم آگے نہ بڑھے میں پسینے سے شرابور ہو چکی تھی اور میری نظر اب بھی اسٹور کے گیٹ پر ساکت تھی۔ میری ہارٹ بیٹ تیز ہو چکی تھی میں پورے فلور پر اکیلی تھی۔

میرے پیٹ میں اچانک ایک عجیب سا درد اٹھا اس درد کی نوعیت کو سمجھ پانا بہت مشکل تھا۔ اچانک میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا اور میں چکرا کر گر گئی۔ میں گری سیڑھیوں پر گی جب مجھے ہوش آیا تو میں کمرے میں تھی اور میرے ارد گرد امی ماموں ممانیاں کزنز وغیرہ موجود تھے۔ جب سب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا تمہیں تم بے ہوش کیسے ہو گئیں۔

میں نے بس اتنا کہا۔ ”پیٹ میں درد اٹھا اور چکر آیا تو میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔“

امی نے کہا۔ ”اندرونی کمزوری سے کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے۔“ اور اس طرح بات آئی گئی ہو گئی۔

پھر تو مجھے بھی ایک ضد سی ہو گئی تھی کہ میں ضرورت سے زیادہ اب اس اسٹور کے سامنے سے گزروں گی اور اسے گھوروں گی۔ پھر شادی کی تیاریاں تو چل ہی رہی تھیں مایوں مہندی بارات ولیمے کی رسمیں ہم نے خوب انجوائے کی۔ نئی ممانی کے ساتھ بھی اچھی دوستی ہو گئی تھی تمام رسموں سے فارغ ہو کر ہم اپنے گھر آ گئے۔ مجھے بہت حیرانی تھی اس بات پر کہ کبھی خود سے کزنز وغیرہ نے ایسی کوئی بات ڈسکس نہیں کی اس لئے میں نے بھی کبھی کسی سے کچھ ڈسکس نہیں کیا۔

وقت گزر رہا تھا ہم سب آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ حسن تو اس اسٹور سے سامان نکالتا اور رکھتا رہتا تھا وہ ایک قرآن حافظ لڑکا ہے شاید جب ہی اسے خوف محسوس نہ ہوتا ہو۔

دوسرے نمبر کے سعید ماموں نے اپنے چھوٹے بیٹے قاسم کا عقیقہ کیا تو ہم ایک دن پہلے ہی پہنچ گئے کافی رات گئے گانے گائے اور انجوائے کیا۔ نانی بھی وہیں تھیں میں اور عظمٰی اقراء کے ساتھ اس کے روم میں سونا چاہتے تھے۔

نانی نے کہا۔ ”تم سب میرے ساتھ یہاں گراؤنڈ فلور میں سو جاؤ۔“

اب مجبوراً نانی کی بات ماننی پڑی، امی تو حسن کے روم میں چھوٹی بہنوں کے ساتھ سو گئیں، میں اور عظمٰی کچن کے ساتھ جہاں دری چادر بچھی تھی میں لیٹ گئی پھر نانی بھی وہیں لیٹ گئیں، پھر نانی ان کے برابر میں عظمٰی لیٹ گئی لیٹ نائٹ ہم سونے کے لئے

لیٹے تھے تقریباً تیسرا پہر تھا کہ ابھی آنکھیں بمشکل بند کی ہوں گی کہ کچن کی چھت سے موٹے موٹے پتھر گرنے لگے۔

میں جھٹ سے کھڑی ہوئی اور لائٹ آن کی تو عظمیٰ ڈر گئی نانی سے میں نے کہا۔ ''اتنے موٹے موٹے بڑے پتھر کون پھینک رہا ہے گرنے اور پھینکنے میں فرق ہوتا ہے نانی۔''

تو نانی کہنے لگیں۔ ''اوپر ڈک بنا ہوا ہے کچن کی چھت میں اکثر کبوتر پتھر پھینکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نانی کبوتر اتنی رات کو جاگتے ہیں؟ اور اتنے موٹے بڑے پتھر ان کے پنجوں میں کیا آسکتے ہیں۔''

عظمیٰ کہنے لگی۔ ''بھئی میں یہاں نہیں سوؤں گی میں امی کے پاس امی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔''

رہ گئی میں بے چاری تو نانی نے ڈانٹ کر اپنے پاس ہی سلایا اور میں اسی جگہ کچن کے ساتھ ہی لیٹی جہاں سے پتھر گر رہے تھے۔ میں ساری رات نہ سو سکی۔ اب عقیقے کا پروگرام تھا سب اگلے دن اسی کی تیاری میں مصروف تھے۔ میں شاور لینے کے لئے اقراء کے پورشن کے اٹیچڈ باتھ میں جانے کے لئے ویٹ کر رہی تھی جیسے ہی نانی شاور لے کر نکلیں تو میں جانے لگی۔ تو تیسرے نمبر کے ماموں کی بیٹی نے آکر مجھے سے کہا۔

''آپی آپ فرسٹ فلور کے باتھ روم میں چلی جائیں مجھے یہاں نہانے دیں۔''

میں نے کہا۔ ''معظمہ تم جاؤ وہاں میں کب سے ویٹ کر رہی تھی میں تو جا رہی ہوں شاور لینے۔''

معظمہ نے مجھے بتایا کہ ''سب سے نیچے گراؤنڈ فلور کا باتھ روم خالی ہوتا تو میں وہاں چلی جاتی مگر فرسٹ فلور کے باتھ روم میں نہیں جاؤں گی مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔''

معظمہ کی اس بات پر میں چونک گئی کیونکہ تین ماموؤں کی فیملیز سے آج تک مجھے اس طرح کی کوئی بات سننے کو نہیں ملی پہلی بار ایسی بات سن کر میں حیران رہ گئی معظمہ چونکہ تیسرے نمبر کے ماموں کی بیٹی تھی وہ لوگ تو پرانے گھر میں ہی رہتے تھے۔ میں نے اس سے فوراً پوچھا۔

''معظمہ تمہیں ڈر کیوں لگتا ہے فرسٹ فلور کے باتھ روم میں شاور لینے سے۔ کچھ بات ہے کیا؟''

میرے پوچھنے پر معظمہ نے بتایا۔ ''آپی میں یہاں رکنے کے لئے آئی ہوئی تھی تو شاور لینے کے لئے فرسٹ فلور کے باتھ روم میں چلی گئی میں شاور لے رہی تھی کہ میں نے صابن یوز کر کے صابن دانی میں رکھا جب مجھے دوبارہ صابن کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں نے دیکھا صابن تو صابن دانی میں ہے ہی نہیں میں نے ہر طرف صابن دیکھا مگر صابن مل کر نہ دیا اور میں تو خوف زدہ سی ہوگئی میں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ ابھی تو میں نے صابن رکھا ہے اچانک سے صابن کہاں غائب ہوگیا۔

میں پریشان ہو رہی تھی کہ کسی نے میرا نام لیا۔ معظمہ یہ رہا صابن اور زور سے کسی نے صابن میری طرف پھینکا۔ میں انتہائی ڈر گئی جلدی سے کپڑے پہن کر باہر آگئی میں نے اقراء آپی کو بتایا یہاں تو کوئی یقین نہیں کر رہا اور سب مذاق اڑا رہے ہیں۔

''آپی پلیز! آپ وہاں چلی جائیں میں یہاں جا رہی ہوں نہانے۔''

معظمہ تو چلی گئی نہانے کے لئے اور پھر مجھ پر ڈانٹ پڑی کہ باہر ٹینٹ سج گیا ہے اور کچھ مہمان بھی آنے شروع ہوگئے ہیں۔ جلدی جاؤ نہانے اور تیار ہو جاؤ۔'' کیونکہ ایک وہی باتھ روم تھا اور اسی اسٹور کے برابر میں تھا معظمہ مجھے پوری طرح سے ڈرا چکی تھی۔

مگر اپنی عادت سے مجبور میں بھی تھی اسی لئے اسی باتھ روم میں شاور لینے چلی گئی اور خوف کو خود پر حاوی ہونے نہیں دیا پھر بھی خوف تھا کہ آ ہی رہا تھا عقیقے کے پروگرام کے بعد ہم اپنے گھر آگئے

دوسرے دن۔

وقت گزرتا رہا ہم سب اسٹیڈی میں مصروف ہوگئے بس کبھی کبھی ملنے ملانے کا سلسلہ رہتا۔ اسٹیڈی کی وجہ سے رکنے بھی نہیں گئے تھے ہم لوگ۔ وہاں اس گھر میں تینوں ماموؤں کی فیملیز بخوشی رہ رہی تھیں میرے بی ایڈ کے امتحانات قریب تھے اور میرا بورڈ سرسید گرلز کالج ناظم آباد میں تھا۔ جوکہ بڑے ماموں کے گھر سے بہت قریب تھا پیدل کا راستہ تھا تو بڑی ممانی نے کہا۔

”شاہ فیصل سے آنے جانے میں بہت ٹائم ضائع ہوگا امتحانات ہمارے گھر سے دے دو حسن تمہیں ٹائم پر لانا لے جانا کرلے گا۔“

میں بھی وقت کی بچت کی وجہ سے وہاں چلی گئی اور امتحانات دینے لگی آخری پیپر والے دن ہم سب نے پلان کیا کہ آج رات خوب ہلا گلا کریں گے گراؤنڈ فلور کے ڈرائنگ روم میں سوئیں گے اور بس رات بھر ہنسی مذاق کریں گے اور آئسکریم بھی کھانے چلیں گے۔

جب میں آخری پیپر دے کر آئی تو رات کے کھانے سے فارغ ہوکر ہم سب آئسکریم کھانے گئے رات سب اپنے اپنے پورشن میں چلے گئے۔ بڑے ماموں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اس لئے حسن بھی اپنی امی کے ساتھ فرسٹ فلور پر روم میں سوگیا ہم سب کزنز ڈرائنگ روم میں ہنسی مذاق کررہے تھے ڈرائنگ روم کے دروازے کے اوپر خوب صورت سی گرل لگی ہوئی تھی اس گرل سے اس اسٹور کا گیٹ نظر آتا تھا اور میری نظر اس گیٹ پر لازمی ٹھہری جاتی تھی۔

میں بار بار اسی گیٹ کو دیکھ رہی تھی ہنسی مذاق سے فارغ ہوکر ہم تینوں اب لیٹ چکے تھے اور لیٹ کر باتیں کررہے تھے رات کے تقریباً ڈھائی بجے ہوں گے ڈرائنگ روم میں زیرو کا بلب آن تھا پھر سیڑھیوں پر بھی بلب آن تھا کافی روشنی تھی میں اٹھی ڈرائنگ روم کا گیٹ کھولا اور ٹوائلٹ گئی۔

جیسے ہی میں ٹوائلٹ سے نکلی تو دو قدم کے فاصلے پر فریج رکھا ہوا تھا اس کے ساتھ کوئی چیز کھڑی تھی جوکہ سیاہ لباس میں ملبوس تھی اس کے جسم پر سر موجود نہیں تھا باقی پورا جسم سیاہ لباس میں موجود تھا اور سر کی جگہ سے خون ٹپک رہا تھا مسلسل۔

سیڑھیوں پر لگے بلب سے اچھی خاصی روشنی آرہی تھی ساتھ ہی مین گیٹ انٹرنس پر بھی بلب لگا ہوا تھا وہاں سے بھی روشنی آرہی تھی اور ڈرائنگ روم کی گرل سے بھی۔ اتنی روشنی تھی میں اسے بغور دیکھ رہی تھی اور وہ سرکٹ مخلوق کا رخ بھی میری ہی جانب تھا میں ساکت واش روم کا گیٹ پکڑے کھڑی اسی مخلوق کو دیکھے جارہی تھی وہ مخلوق بس دو قدم کی دوری پر کھڑی تھی۔ میں انتہائی خوف زدہ تھی کہ یہ کیا چیز ہے اتنا کالا سیاہ لباس اور اس مخلوق کے وجود پر سر نہیں ہے اور سر کی جگہ سے خون ٹپک رہا ہے۔

میں انتہائی خوف زدہ اور پریشان تھی پسینے سے نہا گئی تھی حلق سے آواز نہیں آرہی تھی سانسیں رک گئی تھیں میں نے اسی مخلوق کو دیکھتے ہوئے ہی گیٹ بند کیا واش بیسن سے ہاتھ دھوئے اور اسی کو دیکھتے ہوئے میں جلدی سے ڈرائنگ روم کا گیٹ کھول کر اندر گئی اور اپنی جگہ پر لیٹ گئی۔ سب کزنز نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ میں نے بات کو ٹال کر آنکھیں بند کرلیں سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔

مگر ساری رات سو نہ سکی۔ صبح نانی آگئیں ملنے، میں نے سب سے چھپ کر نانی کو بتایا رات کا واقعہ تو انہوں نے مجھے سب کو بتانے سے منع کیا کہ یہاں رہنے سے ڈر نہ جائیں۔

میں بری طرح خوف زدہ تھی بھائی کا ویٹ کررہی تھی بھائی کے آتے ہی میں اپنے گھر آگئی۔

کافی دن تک اس مخلوق کے خیال سے اپنے وجود کو بھاری پایا۔ اور بار بار وہ شے میری آنکھوں کے سامنے آرہی تھی۔

بہرحال میں اتنے کمزور اعصاب کی مالک نہیں

خود کو سنبھالا نمازیں میں نہیں چھوڑتی۔ بہت جلد خود کو نارمل کیا کہ اللہ نے ان تمام چیزوں سے طاقتور ہم انسانوں کو بنایا ہے۔

لیکن جب بھی وہ واقعہ یاد آتا ہے تو وہ منظر آنکھوں میں آجاتا ہے وہ شے آنکھوں کے منظر سے نہیں نکلتی۔

تین سال رہنے کے بعد مجبوراً ماموں کو وہ گھر بیچنا پڑا کیونکہ وہاں سب ہی کے ساتھ کچھ نہ کچھ واقعات ہوتے ہی رہتے تھے مگر کسی نے ان واقعات کو اتنا سنجیدہ نہیں لیا تھا۔

ایک حادثہ ایسا ہوا کہ اس نے سب کی زندگی ہی بدل دی۔

اس گھر کی رونق بڑی ممانی جو کہ ایک خوش مزاج ہنسنے ہنسانے والی خاتون تھیں بہت ہی دوستانہ مزاج تھا ان کا سب سے۔ وہ ایک ہر دل عزیز خاتون تھیں کوئی بھی بور نہیں ہوتا تھا۔ ان کی موجودگی میں 40 سالہ نوجوان خاتون جنہیں کوئی بیماری بھی لاحق نہ تھی بہت ایکٹو تھیں بس یہ سوچا کہ اس سال اپنے گھر میں بڑا میلاد کروں گی اسی سلسلے میں بڑے ماموں سے کہنے لگیں۔

"آپ صدر جانے سے پہلے مجھے پرانے محلے لے چلیں وہاں میلاد پڑھنے والی ایک خاتون ہیں بہت اچھا میلاد پڑھتی ہیں میں واپسی پر رفیق کے ساتھ آجاؤں گی۔" (رفیق ماموں ان کے دیور ہیں) ممانی میلاد والی خاتون سے بات کرنے گئیں تو انہوں نے منع کردیا کہ ان کے پاس ٹائم نہیں لہٰذا وہ میلاد کے لئے ٹائم دے سکیں۔

بڑی ممانی بوجھل قدموں سے نانی کے گھر چلی آئیں چھوٹے ماموں نے کہا۔ "بھابھی میں لنچ کرکے چھوڑ آؤں گا آپ کچھ دیر رک جائیں۔"

بڑی ممانی اداس سی ہوگئی تھیں کہ وہ میلاد کا پروگرام نہیں کرواسکیں گی بس کہنے لگیں کہ "رفیق میں چلی جاتی ہوں ماموں کا ایک کزن آگیا تھا اس کے ساتھ بائیک پر آرہی تھیں جیسے ہی گلی سے نکل کر روڈ پر آئے وہ روڈ کافی تنگ بنا ہوا تھا۔ ایک رکشہ والے نے ایک دم رکشہ چلا کر ان کی بائیک کو ہٹ کیا جس کی وجہ سے وہ روڈ پر گریں۔ اور سامنے سے اسپیڈ میں بس آرہی تھی اور وہ بس بڑی ممانی کا سر کچلتی ہوئی چلی گئی۔ ان کا سر ختم ہو چکا تھا یہ خبر ایسی تھی کہ ہم سب کے لئے قیامت سے کم نہ تھی اتنے خطرناک ایکسیڈنٹ سے ہم سب لرز کر رہ گئے ان کے انتقال نے سب کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

کافی وقت لگا سب کو سنبھلنے میں بہرحال کافی روحانی عالموں نے اس گھر کی وجہ بتائی اس حادثے کے پیچھے وہ گھر بڑی ممانی نے بڑے پیار سے سجایا تھا اس گھر کے مالک بڑے ماموں اور بڑی ممانی ہی تھیں۔ اس طرح کا حادثہ سمجھ نہیں آیا۔ کیونکہ مجھے اس گھر میں بنا سر کے سیاہ لباس میں ایک مخلوق نظر آئی تھی۔ پھر بڑی ممانی کا ایکسیڈنٹ بھی ایسا ہوا کہ ان کا سر کچل گیا چہرہ بری طرح ختم ہو چکا تھا۔

ان دونوں باتوں میں کوئی کنکشن ضرور ہے مگر کیا...... یہ میں نہیں جانتی۔

خیر ایک وقت آیا کہ ماموں نے وہ مکان فروخت کردیا اور دوسرا مکان خرید کر اس میں شفٹ ہوگئے تھے۔

میری اپنے تمام قارئین سے گزارش ہے کہ جب بھی کوئی نیا گھر لیں تو استخارہ ضرور کرلیں اور کسی اچھے روحانی عالم سے چیک ضرور کروالیں اور شفٹ ہونے سے پہلے قرآن خوانی یا پھر میلاد کی محفل بھی لازمی کروائیں۔

آج بھی اس مخلوق کا ذکر مجھے خوف کی دنیا میں لے جاتا ہے آنکھوں کے پردے پر اس کا وجود سامنے آجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تمام ایسی مخلوقات سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

اندھیرے سے اجالا

ملک فہیم ارشاد- ڈجکوٹ فیصل آباد

چوتھی قسط

خوف کی وادی میں اٹکھیلیاں کرتی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی، جسم و جاں کے رونگٹے کھڑے کرتی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش پل پل لمحہ لمحہ اچنبھے میں ڈالتی خیر و شر کی کہانی

حقیقت سے روشناس کراتی اپنی نوعیت کی عجیب وغریب دماغ سے محو نہ ہونے والی روداد

''وہ اب ٹھیک ہے ایک حیرانگی کی بات سنو کاویری اور رنبیر کا بیاہ ہوگا۔'' سنتوش نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ رنبیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ دونوں خوب صورت بھی ہیں جوڑی خوب جچے گی۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جیسا حادثہ کاویری کے ساتھ ہوا ہے ہمارے ساج میں کوئی اس کا ہاتھ نہ تھامتا، میں نے دیال انکل سے بات کی تو وہ مان گئے رنبیر سے بات کی تو وہ چھپا رستم نکلا وہ اسن ہی من میں کاویری سے بے انتہا پریم کرتا تھا مگر کبھی کہہ نہیں پایا اس حادثے نے خود ہی اس کا کام آسان کردیا۔ ویسے میں نے رنبیر سے کہا کہ اچھا ہی ہوا تم نے جی کے جیون میں کاویری سے اظہار پریم نہیں کیا ورنہ جی دیا کی طرح اس کی ہتھیار بھی کردیتا۔'' سنتوش نے کہا تو عبداللہ بے اختیار ہنس پڑا۔

''ویسے بھی اللہ کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے۔'' عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''عبداللہ تم نماز اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے پڑھتے ہو ناں۔'' سنتوش نے بظاہر پوچھا۔

''ہاں بالکل۔'' عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جب اللہ تعالیٰ نے دنیا بنائی انسان بنائے تو دھرم، مذہب ایک ہی تھا، صرف اللہ کو اپنا خالق و مالک مانا لیکن پھر آبادی بڑھی کچھ جاہل انسانوں نے اللہ کے ساتھ شرک کرنا شروع کردیا پتھر کے بت بنا کر انہیں پوجنا شروع کردیا اپنے ہی ہاتھوں سے بنائے بتوں کی پوجا کرنا بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے جانوروں، سورج، چاند، ستاروں کو پوجنا شروع کردیا پھر اللہ نے ان کی ہدایت کے لئے اپنے نبی اور رسول بھیجے جنھوں نے لوگوں کو سمجھایا اور اصل حقیقت کی طرف بلایا جو رسولوں کے راستوں پر چلے وہ کامیاب وکامران ہوگئے آج بھی دنیا ان لوگوں کا احترام کرتی ہے لیکن جو اللہ کے بھیجے ہوئے پیغامبر پر نہ چلے وہ بھیانک عذابوں کی نظر ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ سب انسان اسی کی عبادت کریں اس کو ایک مانیں، ہر مشکل کو آسان کرنے والا بھی اللہ ہی ہے۔

کئی لوگ وہاں موجود تھے کہ اچانک ایک ڈاکٹر بولا۔ ''نماز کے ذریعے انسان کا چہرہ اور دماغ تروتازہ رہتا ہے نماز کے ذریعے ہی خون انسان کے دماغ تک پہنچتا ہے۔'' کرسچن ڈاکٹر نے کہا۔



"وہ کیسے......" ایک اور بولا۔
"مثال کے طور پر ایک تین منزل بلڈنگ ہے آپ کوشش کے ذریعے دوسری منزل تک تو پانی پہنچا سکتے ہیں لیکن تیسری منزل تک پانی بمشکل پہنچے گا اسی طرح انسانی جسم میں دل پمپ کی طرح کام کرتا ہے وہ جسم کے تمام حصوں تک تو خون پہنچا دیتا ہے لیکن دماغ تک تھوڑا بہت پہنچتا ہے لیکن جب انسان سجدے میں جاتا ہے تو اس کے دماغ تک بھی خون پہنچ جاتا ہے اسی لئے نمازیوں کے چہرے تروتازہ رہتے ہیں باقی صحیح معنوں میں تو چہرہ اس لئے خوب صورت ہوتا ہے کیونکہ انسان اللہ کا شکر جھکتے ہوئے کرتا ہے کیونکہ وہی ذات ہے جس کے آگے جھکا جاتا ہے۔" عبداللہ نے وضاحت کے ساتھ سمجھایا۔
"یہ تو تم نے بڑی اچھی اور حیران کن باتیں بتائیں ہیں۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"صحیح معنوں میں سنتوش انسان اللہ کی پسندیدہ مخلوق ہے اللہ تعالیٰ اپنی بنائی ہر چیز سے محبت کرتا ہے مگر انسان سے اللہ تعالیٰ بہت محبت کرتا ہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اور صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے لیکن انسان بھٹکا ہوا ہے مختلف فرقوں میں اور مذاہب میں...... دنیا کا ہر انسان وہ کسی بھی دھرم سے تعلق رکھتا ہو وہ جانتا ہے کہ اصل حقیقت اللہ ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو مسلم ہو یا عیسائی سکھ ہو یا ہندو...... لیکن پھر بھی وہ اللہ کے ساتھ کسی نہ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے لیکن پھر بھی وہ اتنا غفور و رحیم ذات ہے کہ ہماری غلطیوں کوتاہیوں کو معاف کرتا رہتا ہے قدم قدم پر ہماری اصلاح کرتا ہے آخری سانس تک ہمیں توجہ کا موقع دیتا ہے لیکن انسان پھر بھی...... سوائے افسوس کے کیا کہا جاسکتا ہے۔" عبداللہ افسوس زدہ لہجے میں بولا۔
"کیا اللہ واقعی ہمیں بہت پسند کرتا ہے۔" سنتوش کے لہجے میں حیرانگی عیاں تھی۔
"ہاں...... بالکل...... دنیا میں جتنی بھی آسائشیں ہیں وہ اللہ نے صرف انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔
"پر تو اگر اللہ تعالیٰ سب کے مالک ہیں تو پھر وہ سب کو سیدھی راہ پر لے آئیں۔" سنتوش کی اس بات پر عبداللہ مسکرا دیا۔
"تمہاری بات بالکل درست ہے سنتوش اگر اللہ تعالیٰ سب کے مالک ہیں تو پھر وہ سب انسانوں کو سیدھی راہ پر لے آئیں...... لیکن سنتوش اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے...... اب یہ بات بھی نہیں ہے کہ انسان ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرسکتا ہے اللہ کی عبادت کے لئے تو فرشتے ہی کافی ہیں وہ دن رات اللہ کا حکم بجالاتے ہیں وہ سوائے اللہ کی عبادت کے کوئی اور کام نہیں کرتے لیکن انسانوں پر اللہ کا یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے انسانوں کو کچھ چھوٹ دے رکھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو راہوں کا مسافر بنایا ہے ایک سفر نیکی کا ہے اور ایک سفر بدی کا، فیصلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو چھوٹ دے رکھی ہے۔ یعنی وہ اپنی مرضی سے خود دونوں راستوں سے کسی ایک پر چلے، اب جب انسان نیکی کی راہ پر چلتا ہے تو راستے میں ہر جگہ بدی یوٹرن چھوڑتی ہے تاکہ انسان نیکی کا راستہ چھوڑ کر بدی کا راستہ اختیار کرے لیکن اللہ تعالیٰ بھی نیکی پر چلنے والے کی پل پل رہنمائی کرتا رہتا ہے اور پھر نیکی پر چلنے والا انسان ہر بدی کو روندتا ہوا آخرکار اپنی اصل منزل کو پالیتا ہے پھر وہ فرشتوں سے بھی زیادہ مقام پالیتا ہے اور اگر بدی کے راستے پر چل پڑے اور گناہ کی حد کردے تو وہ گناہوں اور بدی کا بادشاہ شیطان کے مقام سے بھی نیچے گر جاتا ہے باقی اگر انسان نیکیاں کرتا ہے تو اسے اپنی نیکیوں پر فخر نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ بات انسان کو لے ڈوبتی ہے۔
انسان اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ وہ ہر وقت اسی شش و پنج میں مبتلا رہے ہیں کہ وہ بہت گنہگار آدمی ہے اللہ کے سچے بندوں کی حالت ایسی ہی ہے وہ ہر وقت اسی شش و پنج میں رہتے ہیں کہ شاید اللہ کو ہماری یہ حرکت اچھی نہ لگی ہو، شاید مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی ہے

اگر عبادت کا پلڑا دیکھا جائے تو سب سے بھاری شیطان کا ہے صرف اپنی ایک نادانی کی وجہ سے شیطان بن بیٹھا اب دیکھو نہ اللہ کا غفور و رحیم شیطان کو بھی کھلا چھوڑ دیا یعنی اس کے برسوں کی عبادت کا دلہ دے دیا اس کی لگام کھلی چھوڑ دی اس نے اللہ سے کہا تھا کہ وہ تیرے عبادت گزار لوگوں کو بھٹکاؤں گا اللہ نے بھی اسے کھلی اجازت دے دی تھی اب شیطان عبادت گزار لوگوں کی طرف تو جاتا ہی نہیں کیونکہ اسے معلوم ہے عبادت گزار لوگ اس کے ہر پینترے کو جانتے ہیں کیونکہ وہ حضرت محمدؐ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے حضور کو شیطان کے ہر پینترے کے بارے میں آگاہ کر دیا ہے اور حضورؐ نے اپنی امت کو شیطان کے پینتروں سے آگاہ کر دیا ہے اس لئے شیطان بھٹکے ہوئے لوگوں کو مزید بھٹکاتا ہے اور اللہ تعالیٰ قدم قدم پر ان کی اصلاح کرتا ہے یعنی ایسا کوئی واقعہ ہو جاتا ہے جو اشارہ ہوتا ہے لیکن انسان سمجھنے کے باوجود انجان بنا رہتا ہے۔‘‘ عبداللہ نے بتایا۔

’’عبداللہ انسان کسی بھی عمر میں توبہ کر سکتا ہے یعنی جوانی یا بڑھاپے میں۔‘‘ سنتوش نے مزید پوچھا۔

بالکل اور یہ حقیقت ہے کہ انسان عمر کے ہر حصے میں توبہ کرے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے پیدا ہوا بچہ یعنی اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔‘‘ عبداللہ نے کہا۔

’’ویسے ایک بات کہو سنتوش۔‘‘ عبداللہ نے کہا۔

’’کیا۔‘‘ سنتوش نے پوچھا۔

’’میں نے دیکھا ہے تمہارے چہرے پر ایک عجیب سی چمک ہے۔ ایسی چمک کسی عام آدمی کے چہرے پر نظر نہیں آتی۔‘‘ عبداللہ نے سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’یہی بات میرے گاؤں کے عبداللہ انکل بھی کہتے ہیں۔‘‘ سنتوش نے کہا تو عبداللہ چونکا۔

’’عبداللہ......‘‘

’’ہاں...... تمہارے ہم نام وہ بھی مسلمان ہیں وہ ہمارے گھر میں چوکیداری کی مزدوری کرتے تھے انہوں نے مجھے ایسا خوب صورت گفٹ دیا ہے جس نے ہر مشکل سے میری رکھشا اور مدد کی ہے۔‘‘ سنتوش نے بتایا اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوتی سنتوش کے موبائل کی رنگ ٹون جاگ اٹھی۔

☆......☆......☆

’’سنتوش ...... کالج میں ایک نئی لڑکی آئی ہے۔‘‘ زبیر نے کہا۔

’’تو...... میں کیا کروں......‘‘ سنتوش نے لفظ ’’تو‘‘ کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

’’تو کیا۔‘‘ میں نے تو ویسے ہی کہہ رہا تھا......

’’زبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

’’تمہیں نئی لڑکیوں کی بڑی چنتا ہے۔‘‘ کاویری نے غصے سے زبیر کو آنکھیں دکھائیں۔

’’ارے دیوی جی آپ کرودھت تو کرودھت ہوگئیں ہیں اب تو ہم جنم جنم کے پجاری ہیں۔‘‘ زبیر نے کاویری کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو سب ہنسنے لگے۔

’’تو پھر تمہیں نئی لڑکی کی چنتا کیوں کھائے جا رہی ہے۔‘‘ کاویری کا غصہ بدستور عروج پر تھا۔

’’ارے دیوی جی ہم تو آپ کے پجاری بن گئے ہیں۔‘‘

پرنتوں ہمارے گروپ کے باقی لڑکوں کے لئے تو دیوی کا پربند کرنا ہے کہ نہیں۔‘‘ زبیر نے وضاحتی لہجے میں کہا۔ ’’تو اس کی چنتا مت کر...... اپنا حال دیکھ کر ابھی سے اپنی ہونے والی پتنی سے ڈر رہا ہے۔‘‘ سنتوش نے کہا تو پھر سب ہنس پڑے اور کاویری بھی جو غصے کی حالت میں تھی بے اختیار ہنس پڑی۔

’’بھلائی کا زمانہ ہی نہیں رہا۔ چلو جیسے تمہاری اچھا۔‘‘ زبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

’’ویسے کاویری جی نے تو سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہ زیادہ سے ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا پرنتو اس نے کبھی شک نہیں ہونے دیا ایک ہتھیارا نکلا۔‘‘

سریش نے کہا۔
"ہاں...... حیرانی تو مجھے بھی ہوئی تھی پرنتو۔" کاویری نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک سریلی آواز ان سب کے کانوں میں پڑی۔
"ایکسکیوزمی۔"
سب نے آواز کی سمت دیکھا تو سنتوش، سریش اور رنبیر کے دلوں نے دھڑکنا شروع کر دیا سامنے ایک بے انتہا خوب صورت حسین و جمیل لڑکی کھڑی تھی اس کے ساتھ ساکھشی بھی کھڑی تھی۔
"فرینڈز یہ ہے انجلی...... اور انجلی میٹ مائی فرینڈز سنتوش، کاویری، رنبیر اور یہ مائی برادر سریش ہے اور سنتوش بھی میرا کزن ہے۔" ساکھشی نے ان سب کا تعارف کروایا۔
"اور میرا نام ہے عبداللہ...... السلام وعلیکم ۔" عبداللہ مسکراتے ہوئے ان کے قریب آ کر بولا۔
"تو مسلم......" انجلی نے عبداللہ سے پوچھا۔
"الحمدللہ......" عبداللہ فخریہ لہجے میں بولا۔
"عبداللہ یہ ہے انجلی......" ساکھشی نے گہری نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کیا آپ کالج میں نئی آئی ہیں۔" عبداللہ نے پوچھا۔
"ہاں......" انجلی نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا ۔ساکھشی بدستور عبداللہ کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔
"انجلی ویلکم مائی فرینڈز گروپ......" ساکھشی نے کہا تو انجلی مسکرا دی سنتوش کو انجلی کے چہرے پر مسکراہٹ بہت بھلی لگی۔ "اسی شہر کی ہو تم انجلی۔" سنتوش نے پوچھا۔
"نہیں...... میرے پتا جی کا اس شہر میں ٹرانسفر ہوا ہے۔" انجلی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔
"فرینڈز...... Listen to me" رنبیر نے تالی بجاتے ہوئے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔
"آج رات کو میری برتھ ڈے ہے اسی کارن میں سب دوستوں کو انوائٹ کرتا ہوں اسپیشلی کاویری کو۔" رنبیر نے کہا تو سب ہنس پڑے۔
"تم بھی آنا انجلی...... OK۔" انجلی نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
"آج نیوز پیپر کس کس نے پڑھا۔" سریش نے ان سب سے پوچھا۔
"ایسی کیا خبر آ گئی نیوز پیپر میں۔" سنتوش نے حیرانگی سے پوچھا۔
"رات پولیس کو پھر 6 لاشیں ملی ہیں، لاشوں کی حالت کافی خراب تھی، پولیس کا کہنا ہے کہ یہ کسی خون خوار جانور کا کام لگتا ہے۔" سریش نے بتایا۔
"ویسے اب تو اخبارات میں آئے دن ایسی خبریں آتی ہی رہتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے شہر میں کوئی درندہ آن گھسا ہے۔" سنتوش نے پریشان کن لہجے میں کہا۔
"ویسے...... اس شہر میں جو درندہ تھا وہ تو ختم نہیں ہو گیا......" کاویری دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔
"کیا مطلب؟" سب نے حیرانگی سے سوالیہ نشان چھوڑا۔
"جمی درندہ......" کاویری نے کہا تو سب قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔
"ویسے میرے خیال میں یہ اسی بھیڑیئے کا کام ہے جس نے اس رات جمی اور اس کے ساتھیوں کی ہتھیا کی تھی۔"
دیال انکل بتا رہے تھے کہ ہمیں بھی اس بھیڑیئے کا ہی کام لگتا ہے مگر ابھی تک وہ بھیڑیا ان کے ہاتھ میں نہیں آیا۔" سنتوش نے کہا۔
"ہاں...... پتا جی کا کہنا تو یہی ہے آئے دن انہیں لاشیں ملتی ہی رہتی ہیں جس دن سے اس بھیڑیئے نے جمی کی ہتھیا کی تھی۔" رنبیر نے بھی سنتوش کی ہاں میں ہاں ملائی۔
"چھوڑو ان باتوں کو مجھے تو خوف آنے

لگا ہے...... کوئی اور بات کرو......" ساکھشی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"آئی بڑی بھیگی بلی۔" رنبیر نے کہا تو سب قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

"عبداللہ تم بتاؤ رہائی کے بعد کیسا محسوس کر رہے ہو۔" ساکھشی نے رنبیر کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"خود کو فریش محسوس کر رہا ہوں۔" عبداللہ کے اس جواب پر سب مسکرا دیئے۔

"فرینڈز آپ کا گروپ تو بہت دلچسپ ہے۔" انجلی نے کہا۔

"میں تو کچھ زیادہ ہی دلچسپ ہوں۔" رنبیر نے انجلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہا تم نے۔" کاویری نے غصے سے آنکھیں نکالیں۔

"وہ...... وہ......" ہکلاہٹ کے باعث رنبیر کے منہ سے اتنا ہی نکلا اور رنبیر کو ایک مرتبہ پھر قہقہوں کی بارش سننا پڑی۔

"دیکھو بھئی اس گیدڑ کا حال۔ ابھی شادی ہوئی نہیں اور ابھی سے یہ حال ہے شادی کے بعد تو یہ بالکل بھیگی بلی بن جائے گا۔" سنتوش نے رنبیر کا مذاق اڑایا جواباً پھر قہقہے گونج اٹھے۔

☆......☆......☆

برتھ ڈے پارٹی میں اس تھپڑ کی گونج نے سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اردگرد پھیلے لوگ اس طرف دیکھنے لگے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے رنبیر اور کاویری نے کیک کاٹا تھا اور سب علیحدہ علیحدہ گروپس بنا کر اپنی باتوں میں لگ گئے تھے۔

"پارٹی تو کافی شاندار دی ہے رنبیر نے۔" انجلی نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل۔ دراصل ہونے والی پتنی پر رعب جما رہا ہے۔" سنتوش نے کہا تو انجلی ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"عبداللہ نہیں آیا......" ساکھشی نے پوچھا۔

"پتہ نہیں...... ویسے رنبیر نے اسے انوائٹ تو کیا تھا۔" سنتوش نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"کیوں...... تم کیوں پوچھ رہی ہو۔"

"نہیں بس ویسے ہی۔" ساکھشی نے تیز لہجے میں کہا۔

"ویسے آج دونوں کی جوڑی بہت سندر لگ رہی ہے۔" سریش نے ان سب کی توجہ کاویری اور رنبیر کی طرف کرائی جو مہمانوں میں گھرے ہوئے تھے۔

"ہاں واقعی جوڑی تو لاجواب ہے۔" ساکھشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لو سنتوش رنبیر من ہی من میں کاویری سے پریم کرتا تھا پر تو کہنے کی ہمت نہ کرسکا جبھی والا حادثہ پیش آیا تم نے دیال انکل سے بات کی اور بات بن گئی۔" سریش نے کہا۔

"رنبیر ایک اچھا انسان ہے اور اچھے انسانوں کی اوپر والا بغیر کہے بھی مدد کرتا ہے۔" جواباً سنتوش مسکرایا۔

"سنتوش ہمارا یہ آخری سال ہے اس کے بعد تم کیا کرو گے۔" ساکھشی نے پوچھا۔

"اس کے بعد میں گاؤں میں چلا جاؤں گا پتا جی کا ہاتھ بٹاؤں گا۔" سنتوش نے کہا۔

"تو بھیا تم شہر میں ہی جاب کرلو۔" ساکھشی نے کہا۔

"نہیں ساکھشی اوپر والے کا دیا سب کچھ تو ہے میرے پاس ویسے بھی مجھے شہر کی زندگی سے زیادہ گاؤں کی زندگی پسند ہے۔" سنتوش نے اپنے من کی بات کہی۔

"وہ کیوں......؟ شہر کی زندگی تو زیادہ اچھی ہے۔ یہاں ہر چیز موجود ہے۔" اس دفعہ انجلی نے کہا۔

"یہاں کے لوگوں میں کوئی پریم نہیں ہے کسی کو کسی کی خبر نہیں ہے گاؤں میں جب کسی کا دیہانت ہوتا ہے تو پورا گاؤں اس گھر میں جمع ہو جاتا ہے پر تو شہر

میں کسی کو خبر نہیں ہوتی۔" سنتوش نے کہا۔

"بڑے بے وفا ہو تم۔ سنتوش ہم نے آپ کے ساتھ کون سا برا سلوک کیا ہے۔" سا کھشی منہ بناتے ہوئے بولی۔ تو سب ہنس پڑے۔

"نہیں میری پیاری بہن میری بات کا مطلب ہرگز ہرگز یہ نہیں تھا میں تو شہری زندگی کے متعلق بتا رہا تھا۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اتنی بری بھی نہیں ہے شہری زندگی جتنی تم کہتے ہو۔" سا کھشی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"چلو خیر...... کبھی تم گاؤں میں آئی تو خود ہی فیصلہ کر لینا۔" سنتوش نے کہا۔

"نا بابا نا میں تو کبھی بھی اس دھول مٹی میں نہیں آؤں گی۔" سا کھشی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی تو سب مسکرا دیئے۔

"جب بھی اس شہر کی زندگی سے اکتا جاؤ تب گاؤں میں آنا تب پتہ چلے گا کہ گاؤں کی زندگی اصل میں ہے کیا۔" سنتوش نے کہا۔

"آداب عرض ہے۔" عبداللہ قریب آتے ہوئے بولا۔

"ارے عبداللہ تم ......" سا کھشی یکدم چہکی پھر غصے سے بولی۔

"کتنی دیر سے میں تمہارا انتظار کر رہی تھی اور تم ہو کہ اب آ رہے ہو۔"

سب حیرانگی سے سا کھشی کی طرف دیکھنے لگے۔

"وہ...... وہ...... مم...... میرا مطلب ہے سب انتظار کر رہے تھے۔" سا کھشی سنبھلتے ہوئے بولی اسی وقت "چٹاخ" کی زوردار آواز ان کے کانوں میں پڑی اور محفل میں موجود سب ہی لوگ اس طرف متوجہ ہو گئے۔

"یہ کیا ہوا۔" انجلی نے حیرانگی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" چلو دیکھتے ہیں۔

"سنتوش نے کہا اور سب اس طرف بڑھے پارٹی کے سارے لوگوں کا ہجوم اس طرف لگا ہوا تھا سنتوش اور اس کے باقی ساتھی بھی اس طرف بڑھے سنتوش ہجوم کو چیر کر آگے آیا تو اایک حیران کن منظر اس کا منتظر تھا انسپکٹر دیال کا ہاتھ اپنے دائیں گال پر تھا اور وہ حیرانگی سے لوگوں میں جکڑے رنبیر کو دیکھ رہا تھا اور رنبیر بار بار لوگوں کی گرفت سے نکل کر انسپکٹر دیال کی طرف بڑھ رہا تھا سنتوش کی دل کی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

"کک...... کیا ہوا انکل ......" سنتوش نے انسپکٹر دیال کے قریب جا کر پوچھا۔ لیکن انسپکٹر دیال حیرانگی کے عالم میں رنبیر کو تکے جا رہا تھا جو لوگوں کی گرفت میں جکڑا انسپکٹر دیال کو خونی آنکھوں سے گھور رہا تھا اور خود کو لوگوں سے چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"انکل بتایئے تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟" سنتوش نے انسپکٹر دیال کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"وہ...... وہ...... دیال صاحب کے بیٹے نے ان کے گال پر تھپڑ مار دیا۔" ہجوم میں موجود کسی آدمی نے عجیب بات کہی۔

"کک...... کیا......؟" حیرت کے باعث سنتوش کے منہ سے نکلا۔

"انکل آخر ہوا کیا تھا۔" سنتوش کرید نے والے لہجے میں بولا انسپکٹر دیال گردن جھکائے کنپٹیوں کو مسل رہا تھا۔

"انکل رنبیر نے آخر اتنی بڑی بدتمیزی کی کیسے۔"

"میں خود پریشان ہوں۔" سنتوش نے کہا۔

"بیٹا اس میں رنبیر کا کوئی دوش نہیں۔" انسپکٹر دیال نے عجیب بات کہی۔

"کیا مطلب انکل......؟" سنتوش حیران ہوا۔

"سنتوش مجھے وشواس نہیں ہو رہا ......" انسپکٹر دیال پریشان کن لہجے میں بولا۔

"کیا ایسا ہونا ممکن ہے۔"

"انکل کیا بات ہے مجھے بھی تو کچھ بتایئے۔" "رنبیر بھی کل رات سے بے ہوش ہے دوسری رات

آ گئی ہے پرنتو وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔" سنتوش بے چین لہجے میں بولا۔

"سنتوش بیٹا مجھے اس بات کا کوئی افسوس نہیں ہے کہ پارٹی میں موجود لوگوں کے سامنے میری بے عزتی ہوئی ہے کیونکہ اس حرکت میں رنبیر کا کوئی عمل دخل نہیں ہے وہ تو اس سمے کسی کے وش میں تھا۔" انسپکٹر دیال نے پھر عجیب بات کہی۔

"وش میں۔" سنتوش نے لفظوں پر زور دیا۔

"ہاں وش میں۔" انسپکٹر دیال نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"انکل آپ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہیں۔" سنتوش تنگ آنے والے لہجے میں بولا۔

"ہوں......" انسپکٹر دیال نے گہری سانس کھینچی۔

"سنتوش بیٹا تمہیں یاد ہے جب میرا ٹرانسفر شہر میں ہونے والا تھا اور تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے گاؤں میں دو مشکوک آدمیوں کو دیکھا ہے۔"

"جی ہاں...... مجھے یاد ہے۔" سنتوش نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس میں ایک سادھو رنگا گرفتار ہوا تھا اسے میں نے غصے میں تھپڑ مارا تھا اور اس نے تھپڑ کے جواب میں مجھ سے کہا تھا کہ وہ اس تھپڑ کا بدلہ لے گا اور پھر وہ رات کے سمے اپنے دونوں چیلوں کو مار کر پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا اصل میں یہ تھپڑ اسی نے مجھے مارا تھا ......" انسپکٹر دیال نے حیران کن بات کہی۔

"کیا......؟" سنتوش کا لہجہ چلانے والا تھا۔

"ہاں رات کو میں نے رنبیر سے مذاق کے طور پر یہ کہا کہ میں تمہاری شادی ابھی کاویری سے نہیں کروں گا وہ تیزی سے میرے قریب آیا اور ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر دے مارا میں دنگ رہ گیا اسی سمے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے علاوہ سب بت بن گئے ہوں اسی سمے وہاں نجانے کہاں سے رنگا آ گیا...... دیکھا انسپکٹر...... تھپڑ کی گونج۔ تو نے تو مجھے حوالات میں تھپڑ مارا تھا پرنتو میں نے تجھے تیرے چاہنے والوں کے سامنے تھپڑ مارا ہے اب یہ سب لوگ تیرے اس تھپڑ کو یاد رکھیں اور خاص کر تو...... کیونکہ تیرے لاڈلے اور اکلوتے سپوت نے ہی تیرے گال پر تھپڑ دے مارا...... ہا...... ہا...... ہا...... پھر جب تم نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا تو سب کچھ پہلے جیسے ہو گیا میں نے اردگرد نگاہیں دوڑائیں مگر اب رنگا وہاں کہیں بھی موجود نہیں تھا اور رنبیر بے ہوش ہو کر زمین پر جا گرا۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر دیال خاموش ہو گیا۔

"ہوں...... یہ تو آپ نے بڑی عجیب اور حیرت کن باتیں بتائیں انکل۔" سنتوش کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

"ہاں بیٹا میں خود حیران ہوں کہ اس رنگا نے رنبیر کو اپنے وش میں کیسے کیا پھر لوگ بت کیوں بن گئے اور رنگا وہاں آ گیا پرنتو پھر مجھے یاد آیا کہ تمہارے ساتھ بھی تو عجیب وغریب گھٹنائیں گھٹی تھیں۔" انسپکٹر دیال نے کہا۔

"ہاں انکل گھٹنائیں تو گھٹی تھیں پرنتو ایک مہان شکتی نے ان سموں میں میرا ساتھ دیا تھا۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"مہان شکتی......" حیرت کے باعث انسپکٹر دیال کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں مہان شکتی۔" سنتوش نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوتی کاویری اور رنبیر کمرے میں داخل ہوئے۔

"نمستے انکل......" کاویری مسکرائی۔

"نمستے بیٹی جیتی رہو۔" انسپکٹر دیال نے اٹھ کر کاویری کو پیار دیتے ہوئے کہا۔

"پتا جی کاویری کہہ رہی تھی کہ رات کے سمے میں بے ہوش ہو گیا تھا......" رنبیر کے لہجے میں حیرانگی کا عنصر شامل تھا۔

"ہاں بیٹا کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تمہاری اس کارن۔" انسپکٹر دیال نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب کہاں کی تیاریاں ہیں۔" سنتوش نے پوچھا۔

"ہم ذرا باہر گھومنے کے لئے جا رہے ہیں۔" کاویری رنبیر کے بولنے سے پہلے تیزی سے بولی۔

"کیا میں بھی ساتھ جا سکتا ہوں۔" سنتوش نے مذاقاً پوچھا۔

"جی نہیں۔" کاویری نے مصنوعی غصے سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا تو انسپکٹر دیال، رنبیر اور سنتوش مسکرانے لگے۔

"ٹھیک ہے بیٹا تم دونوں جاؤ۔" انسپکٹر نے کہا تو وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

"دیکھا تم نے یکدم کیسے ٹھیک ہو گیا رنبیر اور اسے کچھ یاد نہیں ہے کہ کیا ہوا ہے۔" انسپکٹر دیال نے سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل......" سنتوش نے اثبات میں سر ہلایا۔

رنبیر اور کاویری گاڑی میں آ کر بیٹھے رنبیر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

"مجھے حیرانگی اس بات کی ہے کہ رات کو میں بے ہوش کیسے ہو گیا......" رنبیر پریشان کن لہجے میں بولا۔

"کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے رنبیر۔ خیر تم چھوڑو یہ بتاؤ کہ اگر تم مجھ سے پریم کرتے تھے تو پھر کہا کیوں نہیں۔" کاویری نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

"تم ہر سمے جی کے ساتھ رہتی تھی اس لئے میں نے سوچا تم جی سے پریم کرتی ہو اس لئے۔" رنبیر نے بتایا۔

"جی مجھے پسند کرتا ہے یہ تو مجھے بھی پتہ تھا پرنتو پھر جب اس کا اندرونی روپ میرے سامنے آیا تو وہ مجھے کسی بھیڑیئے سے کم نہ لگا رنبیر وہ بھیڑیا ......بس...... بہت خوفناک تھا جس نے جی کی ہتھیا کی تھی میرے اوپر اتنا خوف سوار ہو گیا تھا کہ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔" کاویری کی زبان پر لفظ بھیڑیا آتے ہی خوف طاری ہو گیا تھا۔

"حیرانگی کی بات یہ ہے کہ اس بھیڑیئے نے تم پر حملہ کیوں نہیں کیا۔" رنبیر نے کہا۔

"لو ہوٹل بھی آ گیا۔"

رنبیر نے گاڑی پارک کی دونوں ہوٹل کے ہال میں آ کر بیٹھ گئے کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کاویری نے اپنے پرس سے گلاب کا ایک پھول نکال کر رنبیر کی طرف بڑھا دیا۔

"Thanks" رنبیر نے ہاتھ بڑھا کر گلاب کا پھول پکڑتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میں تمہارے لئے کچھ لایا ہی نہیں۔"

"کوئی بات نہیں کھانے کا بل تم پے کر دینا۔" کاویری نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو رنبیر بس مسکرا دیا۔

"وہ تو ویسے بھی میں نے ہی پے کرنا تھا۔ پرنتو میں گفٹ کی بات کر رہا تھا۔" رنبیر نے کہا۔

"کوئی بات نہیں کل دے دینا ویسے بھی کل ویلنٹائن ڈے ہے......" کاویری نے مسکراتے ہوئے کہا...... اور پھر کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

"کچھ دیر پیدل چلتے ہیں۔" کاویری نے کہا۔

"As You Wish" رنبیر نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"Thanks" دونوں سڑک کے ایک طرف چلنے لگے۔

"رنبیر سنتوش کے چہرے پر میں نے ایک عجیب سی چمک دیکھی ہے مجھے تو وہ کوئی مہان انسان لگتا ہے۔" کاویری نے رنبیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل۔" کاویری وہ واقعی مہان انسان ہے وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا ہر انسان کی مدد کرتا ہے چاہے وہ کسی بھی دھرم کا ہو پرنتو خود یہ کہتا ہے کہ بھگوان صرف ایک ہے جو نہ کسی سے پیدا ہوا نہ اس کا

کوئی باپ ہے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے وہ بالکل اکیلا ہے۔" رنبیر نے کہا۔

"پرنتو ہمارا دھرم تو یہ نہیں کہتا۔" کاویری نے کہا۔

"وہ کہتا ہے کسی بھی دھرم کی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ بھگوان دو ہیں، دنیا کی ہر کتاب میں یہی لکھا ہے کہ بھگوان صرف ایک ہے یہ ہمارے پنڈت لوگ ہیں جو ہمیں ایسی باتوں میں الجھاتے ہیں کہ بہت سارے بھگوان ہیں، ہم تو جانوروں تک کی پوجا کرتے ہیں اب جانور تو بھگوان نہیں ہوسکتا، بھگوان کی تعریف ان سب سے الگ ہے وہ یہ کہ وہ ایک ہے۔" رنبیر کھوئے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ایسی باتیں تو مسلم لوگ کرتے ہیں۔" کاویری نے کہا۔

"ہاں کرتے تو مسلم لوگ ہی ہیں پرنتو کاویری یہ باتیں سچ پر مبنی ہیں۔" رنبیر نے کہا۔

"چھوڑو ان باتوں کو وہ دیکھو آسمان پر آج چاند پورا ہے۔" کاویری نے رنبیر کی توجہ چاند کی طرف کروائی۔

"دیکھ لو رنبیر اس چاند نے اس رات کو کتنا سندر بنایا ہے۔" کاویری شاعرانہ لہجے میں بولی۔

"کک...... کک...... کاویری......" رنبیر نے ہکلاتے ہوئے کاویری کو پکارا۔

کاویری بولتے بولتے رکی اس نے حیرت سے رنبیر کی طرف دیکھا رنبیر کا چہرہ خون کی طرح سرخ ہوچکا تھا آنکھوں سے پانی بہنے لگا آنکھوں کی حالت ایسی تھی جیسے ابھی پھٹ پڑیں گی جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور وہ چاند کو گھور رہا تھا۔

"رن...... بب...... بیر...... کک...... کک...... کیا ہوا تمہیں۔" کاویری گھبرا کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی، اس نے رنبیر کو بازو سے پکڑا اور تڑپ کر بولی۔

"یہ...... یہ تمہیں...... کک...... کیا ہورہا ہے۔" رنبیر نے کاویری کو سرخ انگارہ اگلتی آنکھوں سے گھورا اور ایک زوردار جھٹکا دیا کاویری چیختی ہوئی کئی فٹ پیچھے جاگری رنبیر کی نظریں چمکتے ہوئے چاند پر لگی ہوئی تھیں اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور ہوچکا تھا کاویری کراہتے ہوئے سڑک سے اٹھ کر کھڑی ہوئی رنبیر نے اسے بڑا حیرت انگیز دھکا دیا تھا اس کے سر کے پچھلے حصے پر ایک اور سرا ابھر آیا تھا جس کی وجہ سے درد نے اس کے سر میں بسیرہ کرلیا تھا کاویری نے اپنی کمر پر ہاتھ رکھا اور دوبارہ رنبیر کی طرف بڑھی اسے حیرانی اس بات کی تھی کہ آخر رنبیر کو ہوکیا رہا ہے وہ رنبیر کے قریب پہنچی۔

"پچ...... چل...... چلی جاؤ یہاں سے کاویری۔" رنبیر اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھتے ہوئے چلایا۔

"رر...... رنبیر...... یہ تمہیں کیا ہورہا ہے۔" کاویری نے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"مم...... میں کہتا ہوں...... چل...... چلی جاؤ یہاں سے۔" رنبیر دوبارہ چلایا اچانک اس کے منہ سے غراہٹ کی آواز نکلی ایسی غراہٹ صرف بھیڑیئے کی ہی ہوسکتی تھی رنبری نے آسمان کی طرف دیکھا اور زوردار انداز میں چلایا اور پھر وہ زمین پر جا گرا۔

"رن...... بیر......" کاویری چلائی اور تیزی سے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

"کک...... کک...... کاویری درد کے کارن میرا سر پھٹ جائے گا...... مم...... میری مدد کرو۔" رنبیر تکلیف کے باعث لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔

"تت...... تت...... تم چنتا مت کرو میں۔ ابھی کچھ کرتی ہوں۔" کاویری بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ وہ اٹھی اور تیزی سے ایک طرف بھاگنے لگی وہ اب بھاگتے ہوئے رو بھی رہی تھی وہ دوڑتی دوڑتی اس ہوٹل کے قریب پہنچی ہوٹل کے باہر دو لڑکے گاڑی کے پاس کھڑے آپس میں باتیں کررہے تھے۔

"دد...... دیکھیے...... پپ...... پپ...... پلیز میری ہیلپ کریں۔" کاویری ان دونوں لڑکوں کے

قریب جا کر کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بولی وہ دونوں لڑکے کاویری کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی کہیے۔" ہم آپ کی کیا ہیلپ کر سکتے ہیں۔" ان میں سے ایک نے کاویری کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"وہ......وہ......م......مر جائے گا۔" پپ...... پلیز میرے ساتھ چلیئے۔" کاویری ٹوٹے پھوٹے لفظوں کے ساتھ بولی۔

"دیکھئے شانت رہیے اور بے خوف ہو کر بات کریں ہم آپ کی ضرور ہیلپ کریں گے آخر پتہ تو چلے بات کیا ہے۔" دوسرے لڑکے نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ......وہ......مر جائے گا اسے پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے وہ وہاں سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے۔" کاویری بچوں کے انداز میں روتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے چلیئے......" کاویری ان دونوں کے ہاں کرنے پر پیچھے کی جانب بھاگی اور وہ دونوں لڑکے بھی اس کی پیروی میں بھاگے بھاگتے بھاگتے کاویری اس جگہ پہنچی جہاں وہ رنبیر کو چھوڑ کر گئی تھی لیکن وہاں رنبیر کہیں بھی موجود نہیں تھا۔

"یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔" دوسرے لڑکے نے کاویری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ......وہ......یہی تو تھا......" کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"پرنتو یہاں تو کوئی نہیں ہے۔" پہلے لڑکے نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ دور، دور تک سنسانی پھیلی ہوئی تھی۔

"ابھی تو رنبیر یہیں پڑا تڑپ رہا تھا۔" کاویری نے انگلی کے اشارے سے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں رنبیر تھوڑی دیر پہلے تڑپ رہا تھا۔

"اور کیا ہوا تھا اسے......" دوسرے لڑکے نے پوچھا۔

"ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے میں نے اس کی توجہ چاند کی طرف کروائی تو اس کی حالت بری ہونی شروع ہو گئی اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت زیادہ تکلیف میں ہو اس کے منہ سے جانوروں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔" کاویری نے بتاتے ہوئے کہا۔

"جانوروں کی آوازیں۔" پہلے لڑکے نے حیرانگی سے کہا۔

"ہاں جیسے بھیڑیئے کی غراہٹ ہو، میں اس کی طرف بڑھی اس نے مجھے زوردار دھکا دیا ایسا دکا جو عام انسان نہیں دے سکتا تھا وہ تڑپتے ہوئے زمین پر گر گیا اور میں ہیلپ کے لئے آپ کو لے آئی پرنتو وہ اب یہاں کہیں بھی نہیں ہے۔" کاویری نے ساری بات بتائی۔

"کیا وہ آپ کا پتی تھا۔" پہلے لڑکے نے ہی پوچھا۔ کاویری نے جواب دینے کی بجائے حیرانگی سے ان دو پیلی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھا جو درخت کی شاخوں کے پیچھے سے ان تینوں کو گھور رہی تھیں۔

"وہ...... وہ آنکھیں کس کی ہیں۔" کاویری نے دوسرے لڑکے کے پیچھے بڑے سے درخت کی طرف اشارہ کیا دونوں لڑکوں نے حیرت سے گھوم کر پیچھے کی جانب دیکھا اسی وقت فضاء میں ایک غراہٹ کی آواز گونجی درخت پر بیٹھی اس چیز نے ان دونوں لڑکوں پر چھلانگ لگا دی کاویری کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی یہ وہی کالے رنگ کا بھیڑیا تھا جسے کاویری پہلے بھی دیکھ چکی تھی کاویری تیزی سے واپسی کے راستے کی طرف بھاگی ڈر کا غلبہ اس پر مسلط ہو چکا تھا اس کے قدم خود بخود تیزی سے اٹھ رہے تھے کافی دیر بھاگنے کے بعد وہ رکی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس کی نظر جہاں تک جاتی تھی وہاں تک سڑک پر سنسانی پھیلی ہوئی تھی کاویری کا پورا جسم پسینے میں نہا چکا تھا اور خوف کے باعث جسم کانپ رہا تھا سر کی نسیں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں کئی سوالوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔

"رنبیر کہاں گیا؟ وہ بھیڑیا اچانک کہاں سے

آگیا؟ کیا دونوں لڑکے اس بھیڑیا کے خوراک بن گئے۔" ان سوالوں کو سوچتے ہوئے وہ گھبرا گئی اچانک ایک خوف ناک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی مانند کوندا۔

"نن...... نن...... یہ نہیں ہوسکتا۔" وہ ڈرتے ڈرتے خود سے ہمکلام ہوئی اس کا ذہن کچھ اور ہی جواب دے رہا تھا اس کے ذہن میں جو خوفناک خیال آیا تھا وہ یہ تھا کہ کہیں رنبیر ہی تو وہ بھیڑیا نہیں ہے لیکن اس کا دل وسوسوں میں گر گیا تھا وہ یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھی اگر رنبیر بھیڑیا نہیں ہے تو پھر رنبیر کہاں گیا؟ کہیں اس خوف ناک بھیڑیے نے تو اس کا شکار نہیں کرلیا؟ ایک اور خوف ناک خیال اس کے ذہن میں ابھرا لیکن پیچھے جانے کی اس کی ہمت نہ تھی اس کی آنکھوں سے آنسو بھی رواں دواں تھے وہ ہوٹل کے کافی قریب آچکی تھی وہ ہوٹل پہنچ کر انسپکٹر دیال کو انفارم کرنا چاہتی تھی۔

اچانک اسے پاس ہی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی وہ ٹھٹک کر رکی اس نے جھاڑیوں کی طرف دیکھا جھاڑیوں میں کوئی چیز موجود تھی اچانک کاویری کے کانوں میں ایک غراہٹ کی آواز پڑی اچانک جھاڑیوں میں سے وہی بھیڑیا نکلا اس نے وہیں سے کاویری پر چھلانگ لگائی کاویری نے ایک زوردار چیخ ماری اور ہوٹل کی طرف بھاگنے لگی کئی غراہٹیں فضاء میں گونجیں کاویری نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی سٹی گم ہوگئی خوف میں مزید اضافہ ہوگیا پیچھے تین بھیڑیئے تھے جو اس کا پیچھا کررہے تھے کاویری نے پرس سے کار کی چابی نکالی جو رنبیر نے ہوٹل سے باہر نکلتے وقت اسے پکڑا دی تھی پارکنگ میں کھڑی گاڑی کے قریب پہنچتے پر اس نے ریموٹ سے گاڑی کا لاک کھولا اور دروازہ کھول کر وہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اس نے جلدی سے گاڑی اسٹارٹ کرکے گاڑی ریورس کی اور پھر اسپیڈ کے ساتھ گاڑی آگے بڑھا دی ان تینوں بھیڑیوں میں سے ایک بھیڑیا اچھلا اور حیران کھڑے ہوٹل کے چوکیدار کو لیتا ہوا ہوٹل کے ہال میں جا گرا باقی دو بھیڑیئے کاویری کی گاڑی کے پیچھے لگے رہے کاویری نے گاڑی فل اسپیڈ پر چھوڑ دی تھی دونوں بھیڑیوں کی رفتار بھی بہت زیادہ تھی وہ لمبی لمبی جست لگا کر کاویری کی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے گاڑی کے قریب پہنچتے پر ان دونوں بھیڑیوں نے لمبی جست لگائی اور گاڑی کی چھت پر جا گرے کاویری کے اوسان خطا ہوگئے اسے اپنی موت صاف نظر آنے لگی ان میں سے ایک بھیڑیا گاڑی کی ونڈ اسکرین سے ہوتا ہوا گاڑی کے بونٹ پر آیا کاویری کے منہ سے بے اختیار ایک زوردار چیخ نکلی بھیڑیئے نے اپنا سر گاؤں کی ونڈ اسکرین پر دے مارا گاڑی کی ونڈ اسکرین پر مکڑی کا جالا سا بن گیا کاویری نے زوردار چیخ ماری اور آنکھیں بند کرکے بریکس پر مضبوطی سے پیر رکھ دیئے گاڑی کا جھٹکے سے رکی اور دونوں بھیڑیئے غراتے ہوئے سڑک پر جا گرے کاویری نے آنکھیں کھولیں اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

اسی وقت کاویری کے ذہن نے ایک ترکیب کا سہارا لیا اس نے تیزی سے گاڑی کا پہلا گیئر لگا کر کلچ چھوڑا گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی گاڑی دونوں بھیڑیوں کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئی دو خوف ناک غراہٹیں فضاء میں گونجیں کاویری نے بیک مرر سے دیکھا دونوں بھیڑیئے تڑپ رہے تھے کاویری نے سکھ کا سانس لیا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا لیکن اسے رنبیر کی فکر ہورہی تھی وہ پریشان سی ہوگئی پیچھے جانے کی اس کی ہمت نہیں ہورہی تھی لیکن اس نے رنبیر سے سچی محبت کی تھی اور اس نے بریکس لگائیں اور شش و پنج میں مبتلا ہوگئی کافی دیر وہ سوچ کے سمندر میں ڈوبی رہی بالآخر اس نے پیچھے جا کر رنبیر کی مدد کرنے کا سوچ لیا اس نے گاڑی گھمائی اور موت کے منہ میں چل پڑی ڈر بھی تھا لیکن محبت کا جوش بھی تھا سڑک پر مردہ بھیڑیوں کو کچلتی ہوئی وہ آگے بڑھی اچانک کار کی چھت پر کوئی چیز دھم سے گری اور کاویری کے دل کو دھچکا سا لگا۔ "یہ...... یہ...... کک...... کیا......" وہ خوف کے باعث ہکلائی۔

اچانک ایک غراہٹ کی آواز گونجی اور کاویری کے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی وہ سمجھ گئی چھت پر تیسرا بھیڑیا بھی موجود تھا کاویری نے دوبارہ پہلے والا پینترہ آزمانے کی سوچی یہ سوچتے ہی اس نے زبردست بریکیں لگائیں گاڑی کی چھت پر موجود بھیڑیا غراتا ہوا سڑک پر جا گرا کاویری نے تیزی سے وقت ضائع کئے بغیر گاڑی آگے بڑھادی بھیڑیا اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا کاویری کا اندازہ تھا کہ یہ بھیڑیا بھی دوسرے بھیڑیوں کی طرح چلا جائے گا مگر کار کے نزدیک آتے ہی وہ بھیڑیا اچھلا اور گاڑی کے بونٹ پر جا بیٹھا کاویری کو اور تو کچھ نہ سوجھا اس نے گاڑی کا اسٹیرنگ دائیں بائیں گھمانا شروع کر دیا لیکن بھیڑیئے کے پنجے مضبوطی سے گاڑی کے بونٹ پر جمے ہوئے تھے بھیڑیئے نے مکڑی کا جالا بنی ونڈ اسکرین پر اپنا ہاتھ مارا ونڈ اسکرین چکنا چور ہو گئی بھیڑیئے نے پیروں کے پنجے بونٹ پر لگائے بھیڑیئے نے دونوں ہاتھوں سے کاویری کی گردن پکڑلی اور کاویری اسٹیرنگ چھوڑ کر اپنی گردن چھوڑانے لگی۔ گاڑی اب آؤٹ آف کنٹرول ہو گئی تھی تیز رفتاری گاڑی سڑک سے اتر کر جھاڑیوں میں داخل ہو گئی اور ایک موٹے درخت سے جا ٹکرائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاویری کا سر اسٹیرنگ سے جا ٹکرایا اور بھیڑیا غراتا ہوا درخت سے جا ٹکرایا کاویری کے سر سے خون فوارے کی مانند ابل پڑا اور بھیڑیا بھری طرح زخمی ہو گیا بھیڑیا کراہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے چمکتے چاند کی طرف ......آؤں...... بھیڑیئے کے منہ سے آواز خارج ہوئی بھیڑیئے کے زخم تیزی سے بھرنے لگے بھیڑیا نے خون میں نہائی کاویری کی طرف دیکھا اور پھر جھاڑیوں میں چھلانگ لگائی اور جھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔

☆......☆......☆

دن کے اجالے نے ہر طرف پھیلنا شروع کر دیا تھا مگر رات کے اندھیرے نے ابھی اپنی حکومت مکمل طور پر نہیں چھوڑی تھی شہری زندگی آدھی سے زیادہ ابھی نیند کے مزے لوٹ رہی تھی آسمان پر پرندوں کے غول نظر آ رہے تھے ایسے میں وہ سفید رنگ کی کار اس صاف سڑک پر جا رہی تھی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان لڑکا بیٹھا تھا وہ کئی گھنٹوں سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اب گاڑی اس نے کچی سڑک پر اتاری تھی وہ لڑکا بہت پریشان نظر آ رہا تھا پھر اس لڑکے نے اپنی کار ایک بوسیدہ سے مکان کے سامنے روک دی وہ لڑکا گاڑی سے باہر نکلا اور اس بوسیدہ سے مکان کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا وہ پہلے کمرے سے ہوتا ہوا دوسرے کمرے میں پہنچا تو اس نے دیکھا اس کمرے میں ایک بدصورت بوڑھا فرش پر آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا ہوا تھا اور منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا وہ لڑکا ایک طرف فرش پر پھونک مار کر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور اس لڑکے کی طرف دیکھا۔

''کہو مورکھ کیا خبر لائے ہو......'' اس بوڑھے نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

''سادھو جی آج...... آج مجھے اپنی آنکھوں پر وشواس نہیں ہو رہا آج میں نے ایسا منظر دیکھ لیا ہے کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید پاگل ہو جاتا۔ پرنتو آپ کے دیئے ہوئے پانی کے کارن میں اسے نظر نہ آیا۔'' وہ لڑکا خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''کیا دیکھا تم نے۔'' سادھو رنگا نے بدستور گرج دار لہجے میں پوچھا۔

''وہ دونوں لڑکا اور لڑکی گھر سے باہر نکل کر کار میں بیٹھے میں نے ان کا تعاقب کیا وہ دونوں تھوڑی دیر بعد ایک ہوٹل میں چلے گئے کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں باہر آئے اور پیدل ایک طرف چلنے لگے میں نے آپ کے دیئے ہوئے پانی کے چھینٹے اپنے کپڑوں پر ڈال لئے اب مجھے کچھ گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی میں ڈرتے ڈرتے ان دونوں کے قریب چلا گیا پھر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان دونوں کو میری موجودگی کا بالکل بھی پتہ نہ چلا حالانکہ میں ان دونوں کے بالکل قریب تھا وہ دونوں کچھ سے تک پریم کی باتیں کرتے رہے پھر اس لڑکی نے لڑکے کی توجہ چاند کی

طرف کرائی چاند کو دیکھ کر لڑکے کی حالت غیر ہونے لگی چہرہ سرخ، آنکھیں پھٹنے کو پہنچ گئیں وہ تڑپتے ہوئے زمین پر جا گرا لڑکی مدد کے لئے ہوٹل کی طرف بھاگی اسی سمے میں ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا یہاں تک کہہ وہ لڑکا ایک دفعہ پھر خاموش ہوگیا۔

''ہم سن رہے ہیں بولو تم نے کیا اور دیکھا۔'' سادھو نے پوچھا۔

''میں نے دیکھا وہ لڑکا (رنبیر) یکدم اٹھ کر کھڑا ہوگیا اس نے ایک زوردار چیخ ماری اس نے اپنے سر کو تھام لیا اس کی آنکھیں مکمل طور پر سرخ ہونے لگیں اس کے کپڑے اچانک پھٹنا شروع ہوگئے جسم کے بال تیزی سے بڑھنے لگنے چہرے کے خدوخال بدلنے لگے چہرے پر بھی بالوں کا اضافہ ہونے لگا اب وہاں اس لڑکے کے بجائے ایک بہت بڑا اور خوف ناک بھیڑیا کھڑا تھا جس کے پیچھے انسانی شریر تھا۔ بھیڑیئے کے منہ سے آواز خارج ہوئی بھیڑیئے نے میری طرف دیکھا میں خوف کے کارن اس سمے ایک درخت کے پیچھے چھپا ہوا تھا جب بھیڑیئے نے میری طرف دیکھا تو خوف کے کارن میرے پسینے چھوٹ گئے پرنتو پھر بھیڑیئے نے سڑک کی دوسری طرف دیکھنا شروع کردیا۔ میں سمجھ گیا کہ آپ کے دیئے ہوئے پانی کے کارن میں اسے نظر نہیں آرہا تھا سڑک کے دوسری طرف قدموں کی آواز سنائی دی وہ لڑکی (کاویتری) کسی کو مدد کے لئے بلا کر لائی تھی بھیڑیئے نے ایک حیران کن لمبی چھلانگ لگائی اور ایک بڑے سے درخت پر پتوں میں چھپ گیا۔''

وہ لڑکا رنگا کو ساری بات بتاتا رہا اور رنگا بڑے غور سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''خوب بہت خوب..... تم نے اچھا کام کیا میں تمہارے کام سے بہت خوش ہوا ہوں۔'' رنگا خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''سادھو جی میں حیران ہوں ایسے حیران کن منظر میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے ایک انسان اتنا خوف ناک درندہ کیسے بن سکتا ہے اور پھر وہ درندہ کسی کو کاٹے تو وہ بھی اسی کے جیسا بن جائے...... اف میرے بھگوان۔'' وہ لڑکا اپنے سر کو پکڑتے ہوئے بولا۔

''تم ان جھمیلوں میں نہ پڑو...... وہ لڑکا رنبیر کہاں ہے۔'' رنگا نے کہتے ہوئے پوچھا۔

''وہ...... وہ میری کار کی ڈکی میں ہے۔'' لڑکے نے بتایا۔

''تم نے واقعی مجھے خوش کردیا اب تمہیں اس کام کی قیمت بھی ملنی چاہئے۔'' رنگا نے کہا اور کمرے کی دیوار کی طرف دیکھنا شروع کردیا اچانک دیوار پر ایک سایہ سا نمودار ہوا اور تیزی سے حیران پریشان اس لڑکے کی طرف بڑھا اور اپنا گھیرا اس لڑکے کے اردگرد ڈال لیا اب وہ لڑکا اس سایے میں مکمل طور پر گم ہوگیا تھا تھوڑی دیر بعد وہ سایہ علیحدہ ہوا تو ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ زمین پر جا گرا۔

''تم اپنا کام تو جانتے ہو ناں......''

سائے میں سے آواز خارج ہوئی۔ ''اچھی طرح......'' رنگا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پورے شہر میں ایک ہی خبر پھیلی ہوئی تھی۔

''ایک خونخوار بھیڑیئے نے ہوٹل میں موجود 5 لوگوں کی بڑی بے دردی سے ہتھیا کردی۔''

''تفصیلات کے مطابق رائل ہوٹل میں اچانک ایک خونخوار بھیڑیا آیا اور اس نے وہاں خون کی ہولی مچادی ایک زخمی کے بیان کے مطابق سب لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ ہوٹل کا بیرونی دروازہ ٹوٹ کر اندر آگرا ہوٹل میں موجود سب لوگ حیرانگی سے اس طرف دیکھنے لگے اچانک ایک کالے رنگ کی جاندار چیز اندر داخل ہوئی خدوخال اور شریر کے لحاظ سے وہ بھیڑیا ہی لگتا تھا اس خوف ناک بھیڑیئے کو دیکھ کر عورتوں کی چیخیں نکل گئیں وہ ایک بہت خوف ناک بھیڑیا تھا جو عام بھیڑیوں سے شریر کے لحاظ سے بہت بڑا تھا بھیڑیا انگارہ اگلتی آنکھوں سے سب کو گھور رہا تھا بھیڑیے نے

حیران کھڑے ایک آدمی پر چھلانگ لگائی اور اپنے نوکیلے پنجے اس آدمی کے سینے میں گاڑ دیئے چیخوں سے ہوٹل کانپ اٹھا جو بھی بھیڑیئے کے سامنے آتا مارا جاتا خون کی ہولی کھیلنے کے بعد بھیڑیا وہاں سے چلا گیا ہوٹل سے تھوڑی دور آگے کچلتی ہوئی دو آدمیوں کی لاشیں بھی پولیس کو ملیں ہیں پولیس نے ان کی پہچان کرلی ہے رنجیت اور دنیش نامی یہ دونوں آدمی بھی ہوٹل میں کھانا کھارہے تھے اس جائے حادثہ سے تھوڑی دور آگے ایک ڈمیج کار اور اس میں موجود ایک بے ہوش لڑکی ملی تھی جو اب اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑرہی ہے پولیس تحقیقات کررہی ہے۔"

اس خبر نے سارے شہر کو ہلا کر رکھ دیا تھا ہر طرف سوالوں کی بوچھاڑ تھی ہر ایک کی زبان پر یہی موضوع تھا کاوری اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑرہی تھی اور رنبیر کا رات سے کچھ پتہ نہیں تھا انسپکٹر دیال بے چارہ اعلیٰ افسران میں گھرا ہوا تھا وہ بار بار اس سے رپورٹ طلب کررہے تھے وہ کئی دفعہ اسپتال سے بھی ہو آئے تھے مگر وہاں سے یہی معلوم ہورہا تھا کہ کاوری ابھی خطرے میں ہے تھک ہار کر انسپکٹر دیال آفس میں آکر سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد سنتوش بھی وہاں آگیا۔

"انکل پتہ چلا آخر یہ چکر کیا ہے۔" سنتوش نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا...... اور رنبیر کا بھی کہیں پتہ نہیں چل رہا۔" انسپکٹر دیال پریشان کن لہجے میں بولا۔

"آپ نے ہوٹل اور ہوٹل کے قریب ملنے والی لاشوں کو چیک کیا۔" سنتوش نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا...... پرنتو ان میں رنبیر نہیں ہے۔" انسپکٹر دیال نے بتایا۔

"تب وہ ٹھیک ہے انکل۔" سنتوش نے پختہ لہجہ میں کہا۔

"ت...... تم کیسے کہہ سکتے ہو بیٹا۔" انسپکٹر دیال نے پوچھا۔

"میرا دل کہہ رہا ہے انکل۔ وہ بالکل ٹھیک ہے لاشوں کو چیک کرنے والی بات تو میں نے اپنے دل کو تسلی دینے کے لئے کی تھی۔" سنتوش نے بتایا۔

"بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔ پرنتو میں نے پورا شہر چھان مارا ہے پھر وہ مجھے کہیں بھی نہیں ملا صرف ایک ہی امید ہے اور وہ ہے کاوری۔ وہ بھی آپریشن تھیٹر میں زندگی اور موت کی جنگ لڑرہی ہے۔" انسپکٹر دیال کسی ہارے ہوئے آدمی کی طرح بولا۔

"چنتا مت کریں انکل اوپر والا خیر کرے گا۔" سنتوش نے انسپکٹر دیال کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا اسی وقت ایک کانسٹیبل داخل ہوا اور اس نے انسپکٹر دیال کو سلیوٹ کیا۔

"سر باہر انجلی نام کی ایک لڑکی آئی ہے جو سنتوش صاحب سے ملنا چاہتی ہے۔" کانسٹیبل نے بتایا۔

"اسے اندر بھیج دو۔" انسپکٹر دیال نے کہا۔

"نہیں انکل...... کوئی بات نہیں میں اس سے باہر مل کر آتا ہوں۔" سنتوش نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوگیا وہ کانسٹیبل کے ساتھ ہی آفس سے باہر چلا گیا۔

"آخر یہ کیا ماجرا ہے...... میں...... میں رنبیر کو کیسے تلاش کروں۔" سنتوش کے آفس سے باہر نکلنے کے بعد انسپکٹر دیال پریشانی سے بڑبڑایا۔

"چنتا کیوں کرتے ہو انسپکٹر۔" اچانک کمرے میں اندھیرا چھا گیا اور انسپکٹر دیال حیرانگی سے اردگرد دیکھنے لگا۔

"کک...... کک...... کون ہو تم۔" انسپکٹر دیال نے ہکلاتے ہوئے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر بیکار اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔

"میں......" اندھیرے میں آواز گونجی۔ ساتھ ہی اندھیرے میں انسپکٹر دیال کو رنگا کا چہرہ نظر آیا۔

"تم...... !" انسپکٹر دیال دانت پیستے ہوئے بولا۔

"ہاں میں......" جواباً رنگا مسکرایا۔

"آخر تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔" انسپکٹر

دیال تنگ آنے والے لہجے میں بولا۔

"بس انسپکٹر تم تو ابھی سے ہمت ہار گئے ابھی تو میں نے تمہیں مزید تنگ کرنا ہے اس تھپڑ کا بدلہ ابھی پورا نہیں ہوا...... ابھی تو میں نے تمہارے سپوتر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے ہیں۔" رنگا زہریلے لہجے میں بولا۔

"نن......نن......نہیں......تت......تم ایسا مت کرنا۔" انسپکٹر دیال منت آمیز لہجے میں بولا ساتھ ہی رنگا کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

"انسپکٹر تم تو واقعی ہمت ہار گئے ابھی تو میں نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا صرف تیرے سپوتر کو ہتھیارا بنایا ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ وہ ایک خونی بھیڑیا ہے!" رنگا نے بظاہر انسپکٹر دیال پر بم پھینکا۔

"کک......کیا......؟" انسپکٹر دیال چلایا۔

"ہاں......یہ جو آئے دن تم بھیڑیئے کی خبریں سن رہے ہو یہ تمہارا اپنا سپوتر ہی تو ہے۔" رنگا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"امپوسیبل ...... یہ...... یہ نہیں ہوسکتا۔" انسپکٹر دیال یقین نہ آنے والے لہجے میں بولا۔

"تو تمہیں مجھ پر وشواس نہیں ہے۔" رنگا مسکرایا۔

"تو پھر یہ دیکھو۔"

اتنا کہہ کر رنگا نے انسپکٹر دیال کی دائیں طرف کی دیوار کی طرف دیکھا اور وہ دیوار کسی اسکرین کی طرح روشن ہوگئی اس اسکرین پر وہ منظر نظر آنے لگا جب رنبیر اور کاویری ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد پیدل تفریح کے موڈ میں نکلے تھے اور پھر جب رنبیر بھیڑیا بنا اس نے دو آدمیوں پر حملہ کیا وہ دونوں آدمی بھی اسی کی طرح بھیڑیا بنے وہ سارے منظر دیکھ کر انسپکٹر دیال دنگ رہ گیا۔

"کیوں انسپکٹر۔ وشواس آیا میری باتوں پر۔" رنگا نے مسکراتے ہوئے کہا انسپکٹر دیال کا دل چاہتا تھا کہ وہ اٹھ کر رنگا کا برا حال کردے مگر اس کا جسم بے جان سا کرسی پر پڑا ہوا تھا۔

"یہ...... یہ تم نے میرے بیٹے کے ساتھ...... کک......کیا کیا۔ تھپ......تھپڑ تو میں نے تمہیں مارا تھا پرنتو تم نے میرے بیٹے کو سزا کیوں دی۔" انسپکٹر دیال بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"انسپکٹر تم تو ہر ظلم سہہ جاتے پرنتو سنتان (اولاد) کا دکھ ماتا پتا کو بے بس کر دیتا ہے جیسے اب تمہارا ہے اسی کارن میں نے تمہارے بیٹے کا حال ایسا کیا اور یہ کام میں تب سے کر رہا ہوں جب سے تم شہر میں آئے ہو روزانہ اسکول سے چھٹی کے سمے تمہارے بیٹے رنبیر کا اپہارن کرتا اسے انسانی خون کی خواہش دیتا اور پھر میری تپسیا رنگ لائی اور وہ انسان سے ایک خونی بھیڑیا بن گیا تھپڑ کا بدلہ تو میں نے اسی دن تم سے بھرے لوگوں میں لے لیا تھا یہ بھی تمہاری سزا تھی۔" رنگا سانس لینے کے لئے رکا اور پھر بولا۔

"تم نے بھی تو میری برسوں کی عزت کو خاک میں ملایا تھا اب تمہارا بیٹا میرے قبضے میں ہے اور میں تمہیں روزانہ ایسا پھل دیکھاؤں گا جیسا میں نے تمہیں ابھی ابھی دیکھایا ہے۔"

"دیکھو......بھگوان کے لئے میرے بیٹے کو چھوڑ دو چاہے تو میری جان لے لو۔" انسپکٹر دیال روتے ہوئے بولا۔

"ایسے ہی تڑپتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا میں تمہیں۔" رنگا خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"اب غور سے سنو اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں تمہارا بیٹا زندہ سلامت مل جائے تو اپنے علاوہ کسی کو بھی آنند پور بھیج دو...... آنند پور کے شروع میں ہی ایک چھوٹا سا مکان ہے وہاں انہیں رنبیر رسیوں سے بندھا مل جائے گا۔"

"پرنتو وہ دوبارہ بھیڑیا تو نہیں بنے گا ناں۔" انسپکٹر دیال نے پوچھا۔

"اس کے لئے انہیں رات کے سمے وہاں رکنا پڑے گا اسی مکان میں خون سے رنگا ایک خنجر ہے وہ

رنبیر کے سینے میں تب مارنا ہے جب وہ بھیڑیے کی حالت میں ہوگا یہ کام آج رات تک ہی ہونا چاہئے نہیں تو دوسرے دن کا سورج نکلتے ہی تمہارا بیٹا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھیڑیا بن جائے گا پھر وہ دوبارہ کبھی بھی انسان نہیں بن سکے گا...... یہ کام جلد سے جلد کرو کیونکہ سے بہت کم ہے۔" رنگا نے کہا اسی وقت کمرہ دوبارہ روشنی میں نہا گیا رنگا غائب ہوگیا اور انسپکٹر دیال کو بھی اپنے بے جان جسم میں دوبارہ طاقت بحال ہوتی ہوئی محسوس ہوئی کمرے کا دروازہ کھلا اور سنتوش اور انجلی کمرے میں داخل ہوئے۔

☆......☆......☆

میری نظر میں تم سے بہتر اور کوئی نہیں...... جانا تو میں ہی چاہتا تھا پرنتو رنگا نے مجھے آنے سے منع کیا ہے مجھے وشواس ہے تم سے بہتر کوئی اور یہ کام سرانجام نہیں دے سکتا۔" انسپکٹر دیال یہاں تک کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"آپ کے لئے تو انکل میری جان بھی حاضر ہے پرنتو حیرانی مجھے اس بات کی ہے کہ وہ رنگا یکدم آپ پر مہربان کیسے ہوگیا وہ تو آپ کو اپنا خاص دشمن سمجھتا تھا۔" سنتوش نے پوائنٹ کی بات کی تھی۔

"بیٹا ہمارے پاس رنگا کی بات ماننے کے علاوہ اور کوئی اپائے نہیں ہے سمے بہت کم ہے تمہیں جلد سے جلد جانا ہوگا۔" انسپکٹر دیال کا لہجہ منت آمیز تھا۔

"ٹھیک ہے انکل اگر اوپر والے نے چاہا تو میں ضرور رنبیر کو واپس لے کر آؤں گا۔" سنتوش پرامید لہجے میں بولا۔

"بھگوان تمہیں کامیاب کرے بیٹا۔" انسپکٹر دیال نے کہا۔

"ٹھیک ہے انکل میں بھی سنتوش کے ساتھ جاؤں گی۔" ایک طرف بیٹھی انجلی نے کہا۔

"نہیں بیٹی تم میری خاطر اپنی جان سنکٹ میں نہیں ڈالو گی۔" انسپکٹر دیال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"انکل جی سنتوش بھی تو خطروں سے کھیلنے کے لئے جا رہا ہے میں اس کے کام آؤں گی آپ نے سنا ہی ہوگا ایک سے بھلے دو۔" انجلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں انجلی تم میرے ساتھ نہیں جا سکتی وہاں بہت خطرہ ہے۔ شاید میں نہ لوٹوں۔" سنتوش نے بھی نفی میں سر ہلایا۔

"اگر تم زندہ واپس لوٹے تو مجھے ساری عمر اس بات کا دکھ رہے گا کہ بھگوان نے ایک موقع دیا پُنیہ کا کام کرنے کا وہ بھی ہاتھ سے گنوا دیا۔"

"ہم ضرور کامیاب ہوں گے میں ہر حال میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" انجلی ضدی بچے کی طرح بولی۔

"پرنتو تمہارے ماتا پتا کیسے مانیں گے۔" سنتوش نے پوچھا۔

"اس کی چنتا تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد تمہیں یہیں ملوں گی۔ وہ بھی گاڑی سمیت۔" انجلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری اچھا......" سنتوش نے ہار مانتے ہوئے کہا اور انجلی مسکراتے ہوئے آفس سے باہر نکل گئی۔

"ٹھیک ہے انکل میں بھی ماما جی اور مامی جی سے کوئی بہانہ بناتا ہوں۔" سنتوش نے بھی اٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا مجھے بھی معاف کر دینا میں تمہیں موت کے منہ میں بھیج رہا ہوں۔"

"انکل جی شرمندہ مت کیجیے مصیبت کے سمے ایک دوسرے کے کام آنا ہی انسانیت ہے یہ عبداللہ کا کہنا ہے اور ویسے بھی آپ چنتا مت کیجیے میرے ساتھ دنیا کی سب سے بڑی شکتی ہے۔" سنتوش نے کہا اور انسپکٹر دیال کے آفس سے باہر نکل آیا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد سنتوش اور انجلی گاڑی میں بیٹھے آنند پور گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔

"تو مل گئی اجازت۔" سنتوش نے پوچھا جو ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا انجلی

کار ڈرائیو کر رہی تھی۔

''اجازت ملی ہے تو تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔'' انجلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ویسے سنتوش مجھے وشواش نہیں ہو رہا کہ ایک انسان رات کے سمے بھیڑیا بن جاتا ہے..... امپوسیبل۔'' انجلی یقین نہ آنے والے لہجے میں بولی۔

''انجلی دنیا میں ہر چیز پر وشواس کیا جا سکتا ہے ہر انہونی ہونا ہو جاتی ہے۔ باقی تم جا رہی ہو وہاں بڑے حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملیں گے۔'' سنتوش نے کہا۔

''تم کیسے جانتے ہو۔'' انجلی حیران ہوئی۔

''میرا دل کہتا ہے.....'' سنتوش نے کپڑوں کے بیچ چھپے لاکٹ کو ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔

''ویسے میں نے تمہارے بارے میں بھی حیران کن باتیں سنی ہیں۔'' انجلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرے بارے میں۔'' سنتوش بھی زبردستی مسکرایا۔

''ہاں تمہارے بارے میں۔'' جواباً انجلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا سنا ہے میرے بارے میں۔'' سنتوش نے بظاہر پوچھا۔

''یہی کہ تم پر بھگوان کی کرپا ہے.....'' انجلی نے بتایا۔

''وہ تو سب پر ہے۔'' سنتوش مسکرایا۔

''پرنتو تم پر کچھ خاص قسم کی ہے۔'' انجلی مسکرائی۔

''وہ کیسے.....'' سنتوش حیران ہوا۔

''تمہارے کئی قصے سنے ہیں میں نے۔'' انجلی نے کہا۔

''وہ تو بس افواہیں ہیں.....'' سنتوش نے کہا۔

''افواہوں کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے۔'' انجلی مسکرائی۔

''چھوڑو اس موضوع کو یہ بتاؤ کہ تم میرے ساتھ اس سفر پر کیوں جا رہی ہو۔'' سنتوش نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

نمبر 1 یہ پتہ کا کام ہے نمبر 2 تمہارے کارن۔'' انجلی نے بتایا۔

''میرے کارن۔'' سنتوش کے لہجے میں حیرت موجود تھی۔

''ہاں تمہارے کارن، کیونکہ جب یہ جان ہی تمہاری ہے تو تمہارے ساتھ ہی جائے گی۔'' انجلی عجیب سے لہجے میں بولی۔

''میری جان.....'' حیرت ابھی تک سنتوش کے لہجے میں موجود تھی۔

''میں تمہیں کھل کر بتاتی ہوں۔ کیونکہ ہم دونوں جس مہم پر جا رہے ہیں شاید ہماری واپسی اسمبھو نہ ہو اس لئے میں اپنے دل پر بوجھ نہیں رکھنا چاہتی۔'' انجلی نے کہا۔

''تم کیا کہہ رہی ہو مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو.....'' سنتوش اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مم...... میں ...... میں تم سے پریم کرتی ہوں۔'' انجلی نے ہکلاتے ہوئے آخر کہہ ہی دیا اور سنتوش حیرانگی سے انجلی کا منہ تکنے لگا۔

''دیکھو سنتوش میں نے تو تم سے اپنے دل کی بات کہہ دی ہے پرنتو اگر تمہیں مجھ سے پریم نہیں ہے تو مجھے تم سے کوئی گلا نہیں ہے۔'' انجلی نے سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''تم میں تو بڑی ہمت ہے انجلی۔ اتنی بڑی بات اور تم نے اتنی آسانی سے کہہ دی۔'' سنتوش نے مسکراتے ہوئے انجلی کو داد دی۔

''سنتوش دل میں جو بات ہو کہہ دینی چاہئے فرض کرو اگر تمہیں کسی سے پریم ہے اور وہ بھی تم سے پریم کرتا ہو صرف ایک دوسرے کو کہہ نہیں پائے اور دونوں کی شادی علیحدہ علیحدہ ہو جاتی ہے پریم ایسی چیز ہے جو آسانی سے دلوں سے نہیں نکلتی ساری زندگی

دونوں مشکل زندگی گزاریں گے۔" انجلی نے کہا۔

"پرنتو یہ بھی تو ہوسکتا ہے تم دوسرے سے اظہار محبت کرو وہ تم سے پریم کرتا ہی نہ ہو۔" سنتوش نے سوالیہ نگاہوں سے انجلی کی طرف دیکھا۔

"پھر بھی کہہ دینا چاہئے۔" انجلی نے کہا۔

"اب تمہاری جیسی ہمت ہر کسی میں تو ہے نہیں ہر انسان کا مائنڈ چینج ہوتا ہے یہی تو بھگوان کا نظام ہے کوئی انسان کافی تیز ہے کوئی سیدھا ہے اور کوئی بے وقوف......اب دیکھو نا پریم تو میں بھی تم سے کرتا تھا پرنتو کہنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں تم میرے چہرے پر تھپڑ ہی نہ ماردو۔" سنتوش نے کہا تو انجلی ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"ویسے ایک بات کہوں سنتوش......" انجلی نے بظاہر اجازت چاہی۔

"کہو......" سنتوش نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"تم کسی سے بھی اظہار محبت کرو کوئی بھی لڑکی ہو وہ تمہیں نہ نہیں کہے گی اور تمہارے گال تھپڑ کے لئے نہیں ہیں کیونکہ کوئی بھی لڑکی تمہارے خوب صورت شبدوں میں گرفتار ہوسکتی ہے کوئی بھی تمہارے چہرے سے نفرت نہیں کرسکتا کیونکہ تمہارے چہرے میں ایک عجیب سی کشش ہے۔" انجلی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"بس بس اب اتنی تعریفیں اچھی نہیں۔" سنتوش نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا تو انجلی ایک مرتبہ پھر ہنس پڑی۔

"اب آنند پور کے لئے کیا پلان ہے۔" چند لمحوں کے بعد انجلی نے پوچھا۔

"وہاں جاکر ہمیں خون سے رنگا خنجر ڈھونڈھنا ہے اور جب رنبیر بھیڑیا بنے گا تو اس خنجر کا وار رنبیر کے سینے پر کرنا ہوگا۔" سنتوش نے بتایا۔

"بھیڑیے کا روپ میں......یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔" انجلی خوف کے باعث بولی۔

"کام تو واقعی مشکل ہے ہم دونوں کی جان بھی جاسکتی ہے اسی کارن تو میں تمہیں منع کررہا تھا۔" سنتوش نے کہا۔

"اب میں نے اپنی جان تمہارے نام کردی اور اب ہم دونوں کا جینا مرنا ایک ساتھ ہوگا۔" انجلی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ گاڑی اب آنند پور گاؤں کی حدود میں داخل ہوچکی تھی جلد ہی انہیں وہ مکان بھی نظر آگیا سورج اب کافی حد تک دن کا ساتھ چھوڑ رہا تھا مکان آنند پور کی ابتدائی حدود میں ہی تھا مکان کافی پرانا تھا اور اس کی حالت کافی خستہ حال تھی انجلی نے گاڑی اس مکان کے سامنے روک دی دونوں گاڑی سے نیچے اترے۔

"یہ تو کافی پرانا مکان لگتا ہے۔" انجلی نے مکان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اس نے آنکھوں پر لگی کالی عینک سر پر رکھ دی تھی۔

"مکان تو واقعی کافی پرانا ہے۔" سنتوش نے اثبات میں سر ہلایا۔ مکان کا دروازہ لکڑی کا تھا وہ دونوں آگے بڑھے اور مکان کے دروازے کے قریب پہنچے۔ دروازے پر کوئی بھی تالا نہیں تھا سنتوش نے دروازے کو اندر کی جانب دھکیلا تو گردوغبار کا ایک بھبھوکا سا دونوں کی ناک سے ٹکرایا دونوں کھانسنے لگے گردوعبار ہٹنے کے بعد وہ دونوں آگے بڑھے اور مکان میں داخل ہوگئے فرش پر بھی گرد کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی فرش پر چلنے سے جوتوں کے نشان واضح ہورہے تھے پورے گھر میں دو کمرے تھے جن میں سے ایک کمرے میں رنبیر بے ہوشی کی حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا رنبیر کے ہونٹوں پر خون لگا ہوا تھا جو یقیناً انسانی تھا سنتوش گاڑی سے پانی کی بوتل نکال کر لایا اور پانی کے چھینٹے رنبیر کے چہرے پر مارے ہوش میں آنے کے بعد رنبیر حیرانگی سے ارد گرد دیکھنے لگا۔

"مم......میں کہاں ہوں سنتوش۔" حیرانگی کے عالم میں رنبیر کے منہ سے نکلا۔

"تمہیں کڈنیپ کیا گیا تھا ہم تمہیں چھڑانے آئے ہیں۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کڈنیپ۔ مجھے کسی نے کڈنیپ کیا ہے اور کیوں کیا ہے۔'' رنبیر نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

''ارے..... ارے بھئی کچھ حوصلہ کرو اتنے سوالوں کے ایک ساتھ جواب نہیں دے سکتا میں۔'' سنتوش نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

''میرا سر چکرا رہا ہے سنتوش اور یہ میرے ہونٹوں پر کیا لگا ہوا ہے۔'' رنبیر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں تم اٹھ کر بیٹھو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔'' سنتوش نے کہا۔

''نن..... نہیں..... مم..... مجھے بھوک نہیں ہے میں سونا چاہتا ہوں۔'' رنبیر نے بھاری ہوتی ہوئی پلکوں کو جھپکتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر تم سو جاؤ۔'' سنتوش نے سامنے پڑی ٹوٹی پھوٹی چارپائی کی طرف اشارہ کیا رنبیر نے اٹھنے کی کوشش کی تو سنتوش نے اس کا ساتھ دیا چارپائی پر لیٹتے ہی وہ سو گیا سنتوش نے گھر میں پڑی رسی سے رنبیر کو مضبوطی سے باندھ دیا۔

''یہ تو ایسے سو رہا ہے جیسے کئی دنوں سے نہ سویا ہو۔'' انجلی کی ہنسی نکل گئی۔

''اس بات کو چھوڑو تم اور خون سے رنگا وہ خنجر ڈھونڈو ہمیں جلدی کرنا ہوگی۔'' سنتوش نے تیز لہجے میں کہا۔

اب دونوں وہ خنجر ڈھونڈنے لگے پورا مکان دو کمروں پر مشتمل تھا چھت پر جانے کے لئے سیڑھیاں بھی تھیں سیڑھیوں کے نیچے چھوٹا سا خلا بھی تھا جس میں ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا ہوا تھا سنتوش اور انجلی نے پورا گھر چھان مارا مگر وہ خنجر نہ ملا اب سیڑھیوں کے نیچے پڑا وہ ٹوٹا پھوٹا سامان ہی رہ گیا تھا اسی وقت دونوں کو رنبیر کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔

''تم ایسا کرو چھت پر جا کر چھپ جاؤ میں یہیں رہتا ہوں۔'' سنتوش نے انجلی سے مخاطب ہوئے ہوئے کہا۔

''نہیں..... میں بھی یہیں رہوں گی۔'' انجلی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''بے وقوفانہ باتیں مت کرو اور اوپر جاؤ۔'' سنتوش نے سخت لہجے میں کہا تو انجلی بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھی وہ چھت پر پہنچی تو آسمان برسنے کے موڈ میں تھا سنتوش سیڑھیوں کے نیچے پڑے ٹوٹے پھوٹے سامان میں سے لوہے کی ایک سلاخ نکلی اور رنبیر کی چارپائی کے پاس آ کر بیٹھ گیا سنتوش نے دیکھا رنبیر کی آنکھیں کھلیں ہوئیں تھیں جو خون کی طرح سرخ تھیں اور وہ چھت کو گھور رہا تھا پھر وہ یکدم چیخا اور پھر رسیوں کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑانے لگا پھر سنتوش نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔

اچانک رنبیر کے چہرے کے خدوخال بدلنے لگے اور جسم پر پہنے ہوئے کپڑے پھٹنا شروع ہو گئے رنبیر کے جسم پر بندھیں رسیاں بھی ٹوٹ گئیں رنبیر کے چہرے اور جسم پر لمبے لمبے بال ہونے لگے تھوڑی دیر بعد وہاں ایک خوف ناک بھیڑیا لیٹا ہوا تھا سنتوش خوف کے باعث کانپنے لگا۔

اچانک سنتوش کے گلے میں پہنا ہوا لاکٹ گرم ہونے لگا بھیڑیا اٹھ کر کھڑا ہوا سنتوش کو اپنی موت صاف نظر آنے لگی اتنا خوف ناک بھیڑیا اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا دوسرا لمحہ حیران کن تھا وہ بھیڑیا سنتوش کے پاس سے ایسے گزر گیا جیسے اس نے سنتوش کو دیکھا ہی نہ ہو وہ بھیڑیا گھر سے باہر نکل گیا سنتوش نے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کیا اس کے گلے میں پہنا ہوا لاکٹ بھی یکدم ٹھنڈا ہو گیا اور سنتوش سمجھ گیا کہ وہ کس وجہ سے بھیڑیے کو نظر نہیں آیا تھا یہ اس لاکٹ کا کمال تھا باہر اب بارش نے برسنا شروع کر دیا تھا انجلی بھی چھت سے نیچے آ گئی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''مم..... میں نے آج ایسا حیرت انگیز

اورخوف ناک منظر دیکھ لیا ہے کہ مجھے اپنی آنکھوں پر وشواس نہیں ہورہا۔" انجلی یقین نہ آنے والے لہجے میں بولی۔

"مجھے بھی چند منٹ پہلے ایسا ہی لگا تھا پر تو یہ سچ ہے۔" سنتوش نے کہا۔

"بہت بھیانک سچ ہے۔" انجلی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی۔

"ہاں یہ تو ہے۔ ہمارے پاس سے بہت کم ہے۔ اس خون لگے خنجر کو ڈھونڈو ......" سنتوش نے انجلی کو اصل مقصد سے آگاہ کیا۔

"ہم نے ہر جگہ تو دیکھ لیا ہے مگر وہ خنجر کہیں نہیں ہے صرف سیڑھیوں کے نیچے موجود ٹوٹے پھوٹے سامان کو چیک نہیں کیا وہاں دیکھتے ہیں۔" انجلی نے کہا۔

"مجھے وشواس ہے خنجر وہیں ہے۔" سنتوش نے پختہ لہجے میں کہا سیڑھیوں کے نیچے موجود ٹوٹے پھوٹے سامان میں سے آخرکار انہیں وہ خون سے رنگا خنجر مل ہی گیا۔

☆......☆......☆

گرج چمک اور تیز بارش کی وجہ سے وہ لڑکی ڈری سہمی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کی بیمار ماں بار بار کھانس رہی تھی۔

"ج...... جانکی...... بیٹی۔" اس کی بیمار ماں نے اسے پکارا۔

"ج...... جی ماتا جی......" وہ احترام سے بولی۔

"بیٹی تھوڑا سا پانی تو پلا۔" اس کی ماں نے کہا۔

"ابھی لائی ماں جی۔" جانکی نے کہا اور کمرے سے باہر نکل کر باہر صحن میں آ گئی بارش نے یکدم اسے اپنے گھیرے میں لے لیا وہ ایک طرف پڑے لکڑی کے اسٹینڈ کی طرف بڑھی اس نے گھڑے میں گلاس ڈالا تو گھڑا پانی سے خالی تھا۔

"اف بھگوان ......" وہ پریشانی سے بولی ماں کو وہ انکار بھی نہیں کرسکتی تھی کیونکہ وہ بہت زیادہ بیمار تھی

گھر سے تھوڑی دور ہی ایک نلکا تھا جو گاؤں کے سرپنچ نے لگوایا تھا اس نے گلاس پکڑا اور گھر سے باہر نکل آئی بارش، غصے سے گرجتے بادلوں اور سیاہ رات کا اسے ڈر تو تھا لیکن ماں کی بیماری اور حکم اسے زیادہ عزیز تھی اللہ نے اسے بہت زیادہ حسن سے بھی نوازا تھا گاؤں کے ہر نوجوان لڑکے کی نظر اس پر تھی گیلے کپڑوں نے اس کے جسم کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اور بارش کے قطرے اس کے چہرے پر رقص کر رہے تھے۔ چلتے چلتے اچانک جانکی کو یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے کوئی بھی نہیں تھا اس نے گردن سیدھی کی اور دوبارہ چل پڑی بارش کی وجہ سے ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھی اس نے نلکے سے پانی کا گلاس بھرا اور واپسی کے لئے جیسے ہی واپس مڑی تو ڈر کی وجہ سے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا سامنے اس کے گاؤں کے دو لوفر لڑکے راجیش اور ونیش کھڑے تھے جو روزانہ آتے جاتے اسے گندی نظروں سے گھورتے تھے۔

"کیسی ہو جانکی۔" ونیش نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"د...... د...... دیکھو...... م...... مجھے جانے دو۔" "م...... میری ماں بہت بیمار ہے۔" جانکی التجائیہ لہجے میں بولی۔

"جانے دیں گے پر تو پہلے اپنا کام کریں گے پھر تمہیں جانے دیں گے۔" ونیش نے وحشی نگاہوں سے جانکی کے جسم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بھگوان کے لئے مجھ پر رحم کرو، میری ماں کو بہت پیاس لگی ہوئی ہے وہ ...... وہ مر جائے گی۔" جانکی روتے ہوئے بولی۔

"ہم کون سا تمہیں روک رہے ہیں بس ہمارا کام ہونے دو پھر چلی جانا۔" راجیش نے مسکراتے ہوئے کہا اچانک جانکی تیزی سے گھومی اور اس نے ایک طرف بھاگنا شروع کردیا اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا کرسکتی تھی اسے اپنے پیچھے راجیش اور ونیش کے قہقہے

سنائی دیئے، بھاگتے بھاگتے جب وہ تھک گئی تو اس نے گھوم کر دیکھا تو اسے دور دور تک وہ دونوں کہیں بھی دکھائی نہ دیئے وہ ایک درخت کے سہارے کھڑی ہو کر اپنی پھولی ہوئی سانس بحال کرنے لگی اچانک وہ دونوں درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کے سامنے آگئے جانکی کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی راجیش نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا...... اب تمہیں نہیں جانیں دے گے۔'' راجیش نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

''دیکھو بھگوان کے لئے مجھے چھوڑ دو تمہیں بھگوان کی سوگند......'' جانکی روتے ہوئے بولی راجیش نے اسے کندھے پر اٹھالیا اور اچانک انہیں ایک غراہٹ کی آواز سنائی دی اور پھر وہاں ایک خونی منظر پیش آگیا۔

☆......☆......☆

خنجر تو مل گیا اب رنبیر کو ڈھونڈتے ہیں۔

''سنتوش نے انجلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بارش تھمنے دو پھر اسے ڈھونڈنے نکلتے ہیں۔'' انجلی نے کہا۔

''بارش تھمنے کے ارادے تو صبح تک کے نہیں ہیں اور ہمارے پاس سے بھی صبح تک کا ہے اور اب سے آدمی رات سے بھی زیادہ کا ہو گیا ہے۔'' سنتوش نے کہا۔

''پرنتو اس بارش میں رنبیر کو ڈھونڈھنا خطرناک ہے۔'' انجلی پریشان کن لہجے میں بولی۔

''خطروں سے کھیلنے کے لئے ہی تو ہم یہاں آئے ہیں۔'' سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پرنتو پھر بھی......'' انجلی نے کچھ کہنا چاہا لیکن سنتوش نے اسے ٹوک دیا۔

''باتوں کو چھوڑو اور باہر نکلو۔''

آخر کار وہ دونوں اس مکان سے باہر نکلے بارش ابھی بھی پورے جوش کے ساتھ برس رہی تھی مکان سے باہر نکلتے ہی بارش نے تیزی سے انہیں اپنے گھیرے میں لے لیا وہ دونوں کانپتے ہوئے آگے بڑھے وہ دونوں کافی دیر اس بھڑیئے کو ڈھونڈتے رہے مگر وہ انہیں کہیں بھی نہ ملا چلتے چلتے اچانک انجلی کا پیر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ چیختی ہوئی کیچڑ میں جا گری سنتوش نے انجلی کو سہارا دے کر اٹھایا سنتوش اور انجلی نے اس چیز کی طرف دیکھا جس سے ٹکرا کر انجلی زمین پر گری تھی اس چیز کو دیکھ کر انجلی کے منہ سے چیخ نکل گئی وہ ایک لاش تھی جس کی حالت بہت خراب تھی پاس ہی ایک اور لاش تھی اس کی حالت بھی پہلی لاش جیسی ہی تھی سنتوش اور انجلی کو تھوڑی دور ایک لڑکی بھی ملی جو زندہ تھی وہ بے ہوش تھی اور مکمل طور پر کیچڑ میں ڈوبی ہوئی تھی سنتوش نے اس لڑکی کے گالوں پر ہلکے ہلکے تھپڑوں کی بارش کی تو وہ لڑکی چیختے ہوئے ہوش میں آگئی جو جانکی تھی۔

''مم...... مم...... مجھے اس جانور سے بچالو۔'' جانکی ڈرتے ہوئے بولی۔

''دیکھو گھبراؤ مت وہ جانور یہاں سے جا چکا ہے تم اب محفوظ ہو۔'' سنتوش نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

''مم...... مم...... میری ماں بیمار ہے میں اس کے لئے پانی لینے آئی تھی میرے گاؤں کے دو لوفر لڑکوں نے میری عزت لوٹنی چاہی پرنتو وہ جانور جو شریر کے لحاظ سے بھیڑیا لگتا تھا اس نے ان دونوں پر حملہ کر دیا میں اسی سے بے ہوش ہو گئی اگر وہ بھیڑیا سمے پر نہ آتا تو شاید میں آج کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔'' اتنا کہہ کر جانکی رونے لگی۔

''وہ بھیڑیا ویسے عورتوں کے لئے تو محسن ہی ثابت ہوا ہے جیسے کاویری کے لئے ثابت ہوا تھا۔'' سنتوش نے کہا اور پھر جانکی کی طرف ہوا۔

''ٹھیک ہے تم اپنی ماتا جی کے لئے پانی لے جاؤ۔''

جانکی اٹھی اور ایک طرف چل دی۔ ''کافی ڈھونڈ لیا پرنتو ہمیں رنبیر کہیں بھی نظر نہیں آیا۔'' انجلی پریشان کن لہجے میں بولی۔

"ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے اگر تم مانو تو۔" سنتوش نے کہا۔

"میں مانوں تو..... کیا مطلب۔" انجلی حیران ہوئی۔

"مطلب یہ کہ وہ بھیڑیا خون کا پیاسا اگر تمہیں زخم لگایا تو وہ تمہارے خون کی بو سونگھتے ہوئے تم تک آئے گا اور میں اس کے سینے میں یہ خنجر گھونپ دوں گا۔" سنتوش نے بتایا۔

"یہ ترکیب تو بہت خطرناک ہے۔" انجلی نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا حالانکہ وہ اندر سے ڈری ہوئی تھی۔

"اس کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی اوپائے نہیں ہے۔" سنتوش نے کہا۔

"اگر میری جان چلی گئی تو۔" انجلی مسکرائی۔

"اوپر والے پر وشواس رکھو تم بچنے کا کام کروگی۔ وہ تمہاری رکھشا کرے گا۔" سنتوش نے انجلی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر......" انجلی رضامندی سے بولی۔ سنتوش نے اسے چاقو سے زخم لگایا اور ایک طرف کھڑے ہو کر بھیڑیئے کا انتظار کرنے لگا چند لمحوں بعد ہی انہیں دور سے بھیڑیئے کی غراہٹوں کی آوازیں سنائیں دینے لگیں۔

"تم کسی درخت کے پیچھے چھپ جاؤ۔" انجلی نے ڈر کے باعث کانپتے ہوئے کہا۔

"تم میری چنتا مت کرو وہ مجھے نہیں دیکھ پائے گا۔" سنتوش نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"وہ کیسے......" انجلی حیران ہوئی۔

"بس دیکھتی جاؤ۔" سنتوش زبردستی مسکرایا کیونکہ وہ بھی اب ڈر رہا تھا کیونکہ بھیڑیئے کی غراہٹوں کی آوازیں اب نزدیک سے آرہی تھیں چند ہی لمحوں بعد بھیڑیا لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا ہوا ان دونوں کے قریب پہنچ گیا انجلی کا خون سے رنگا بازو دیکھ کر بھیڑیئے کی آنکھوں کی چمک مزید دوگنی ہوئی بھیڑیا واقعی سنتوش کے پاس سے یوں گزر گیا جیسے اس نے سنتوش کو دیکھا ہی نہ ہو بھیڑیا اب انجلی کے سامنے کھڑا تھا اور خوف کے باعث انجلی بری طرح کانپ رہی تھی۔

"سس...... سس...... سنتوش۔" "مم...... مم...... مجھے بچالو نہیں تو یہ بھیڑیا...... مم...... مجھے مار ڈالے گا۔" انجلی ہکلاتے ہوئے چلا کر بولی سنتوش تیزی سے آگے بڑھا اس سے پہلے کہ بھیڑیا اپنے نوکیلے دانت انجلی کی گردن میں گاڑتا سنتوش نے وہ خنجر بھیڑیئے کے سینے میں گاڑ دیا بھیڑیئے کے منہ سے اک فلک شگاف چیخ نکلی جس کی آواز اتنی تیز تھی کہ بے اختیار انجلی اور سنتوش نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے بارش اب تھم چکی تھی رنبیر جو کہ اب اپنی اصل حالت میں آگیا تھا کیچڑ زدہ زمین پر بے ہوش پڑا ہوا تھا اس کے جسم پر کوئی بھی کپڑا نہیں تھا وہ بالکل برہنہ تھا سنتوش نے اپنا کوٹ اتارا اور جھک کر رنبیر کے اوپر ڈال دیا۔

"انجلی چلو اب یہاں سے۔ ہمارا کام ......" سنتوش نے گھوم کر انجلی سے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے کیونکہ انجلی کو سادھو رنگا نے پکڑا ہوا تھا رنگا کے ایک ہاتھ میں ایک خنجر تھا جس کی نوک انجلی کی گردن پر تھی۔

"کیسے ہو مورکھ لڑکے۔" رنگا نفرت سے سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کون ہو تم اور انجلی کو اس طرح کیوں پکڑ رکھا ہے۔" سنتوش نے سخت لہجے میں پوچھا۔

"میں وہی رنگا ہوں جس کو تمہارے کارن جیل کی ہوا کھانی پڑی انسپکٹر دیال کا تھپڑ سہنا پڑا اور پھر تمہارے کارن ہی انسپکٹر دیال کو تکلیفوں کے پہاڑ سہنے پڑے تمہارے کارن ہی رنبیر انسانی خون چوسنے والا بھیڑیا بنا اور تمہارے کارن ہی اس معصوم ناری کو تکلیف سہنی پڑ رہی ہے اور اگر تم چاہتے ہو کہ یہ مزید کشٹ میں نہ پڑے تو میری بات مان لو ورنہ اس ناری کی ہتھیا کے کارن بھی تم ہی بنو گے میں سمے ضائع کئے بغیر اسے جیون کی ڈور سے آزاد کردوں گا۔" رنگا

سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''جیون کی ڈور اوپر والے کے ہاتھ میں ہے تمہارے ہاتھ میں نہیں اگر اوپر والے کو انجلی کی زندگی منظور ہوئی تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔'' سنتوش پرعزم لہجے میں بولا۔

''تم تو واقعی ہمت والے ہو تمہاری پریمکا کی جان میرے ہاتھ میں ہے پھر بھی تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔ خیر میرے پاس سے بہت کم ہے اگر تم نے اپنے گلے میں پہنا ہوا وہ لاکٹ اتار دیا تو میں اس کا جیون بخش دوں گا۔'' رنگا کہتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آیا۔

''لل...... لاکٹ...... کیسا لاکٹ...... میرے پاس کوئی لاکٹ نہیں ہے۔'' سنتوش نے گھبراتے ہوئے کہا۔

زیادہ بنومت ورنہ میں تمہاری اس پہلی اور آخری پریمکا کا خون پی پاؤں گا یہ رنبیر تو نہیں پی سکا۔'' رنگا کہتے ہوئے مسکرایا۔

''یہ تو پھر انسان ہے اصل میں بھیڑیئے تو تم ہو تم خون پی سکتے ہو۔'' سنتوش نے غصے سے کہا۔

''اپنا یہ بھاشن بند کرو اور ترنت مجھے وہ لاکٹ دے دو میرے پاس سے بہت کم ہے۔'' رنگا نے خنجر کی نوک کا دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا اور تکلیف کے باعث انجلی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

''رر...... رکو......'' سنتوش نے ہاتھ ہوا میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں تمہیں لاکٹ دیتا ہوں۔'' سنتوش نے اپنے گلے سے وہ ہار اتار کر رنگا کی طرف پھینکا جسے انجلی نے کیچ کر لیا۔ رنگا نے انجلی کو چھوڑ دیا۔

''تھینکس سنتوش۔ تم تو جلدی مان گئے ہیں میں نے تو سوچا تھا کافی پاپڑ بیلنا پڑیں گے خیر آخر کار جیت پریم کی ہی ہوئی وہ کہتے ہیں نہ ہو گی پیار کی جیت۔'' انجلی مسکراتے ہوئے بولی۔

رنگا بھی مسکرا رہا تھا اور سنتوش حیرانگی سے انجلی کا منہ تک رہا تھا۔

''تمہاری حیرانگی میں دور کئے دیتی ہوں میں بھی رنگا کی ساتھی ہوں۔'' انجلی نے حیران کن بات کہی۔

''کیا......؟'' سنتوش چلایا۔

''ہاں سنتوش بابو۔ تمہارے گلے سے اس ہار کو اتروانے کے لئے ہمیں پریم کا یہ مایہ جال بننا پڑا اور مجھے انجلی پر گرو ہے یہ کامیاب ہوئی۔'' رنگا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ان...... جلی...... م...... م...... مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔'' سنتوش نے دکھی لہجے میں کہا۔

''پریم تو مجھے بھی تم سے ہو گیا تھا پرنتو اس کام کے لئے مجھے جتنی دولت آفر ہوئی تھی وہ پریم کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔'' انجلی نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب میں تمہارا کام تمام کر دوں گا۔'' رنگا غصے سے بولا۔

انجلی تم نے بہت اچھا کام کیا ہے اور اب میں تمہیں اس کا انعام دوں گا۔'' اتنا کہہ کر رنگا نے تیزی سے اپنا ہاتھ انجلی کی طرف کیا انجلی کے کپڑوں میں یکدم آگ بھڑک اٹھی وہ چیخنے چلانے لگی اور رنگا قہقہے لگانے لگا۔

''یہ کیا کیا تم نے بدبخت......'' سنتوش دانت پیستے ہوئے بولا۔

''جیسا حال اب تم تمہارا ہونے والا ہے۔'' اتنا کہہ کر رنگا نے اپنا ہاتھ تیزی سے سنتوش کی طرف کیا مگر سنتوش اپنی جگہ پر ٹھیک ٹھاک کھڑا رہا تو رنگا نے پھر اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا مگر بے کار اب حیرانگی کی باری رنگا کی تھی۔

''کیوں...... کیا وار خالی جا رہے ہیں۔'' سنتوش نے لفظ ''کیوں'' کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ آخر ہو کیا رہا ہے۔'' رنگا پریشان کن

لہجے میں کہا۔

”یہ اس لئے ہورہا ہے کہ وہ مہان شکتی شالی لاکٹ ابھی میرے پاس ہی ہے۔“سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا......؟“اس مرتبہ چلانے کی باری رنگا کی تھی۔

”بدبخت انسان اگر وہ لاکٹ تمہارے پاس ہوتا تو اس کی شکتی سے تم جل کر راکھ ہوجاتے یہ تو نقلی لاکٹ تھا جسے میں نے اس سے پہنا تھا جب میں نے انجلی کو چھت پر بھیجا تھا تو گاڑی میں جب انجلی نے مجھ سے اظہار پریم کیا تو میرا لاکٹ گرم ہوگیا کیونکہ جب بھی مجھ پر کوئی مشکل آئی ہو یا کوئی مجھ سے جھوٹ بول رہا ہو میرا یہ لاکٹ یکدم گرم ہوجاتا ہے انجلی کے اظہار پریم پر جب یہ لاکٹ گرم ہوا تو میں پریشان رہا لاکٹ تب تک گرم رہا جب تک انجلی میرے ساتھ رہی لیکن جب میں نے اسے چھت پر بھیجا تو لاکٹ یکدم ٹھنڈا ہوگیا اور میں سمجھ گیا کہ انجلی میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہی ہے میں نے اصل لاکٹ اتار کر جیب میں ڈال لیا اور یہ لاکٹ گلے میں ہی رہنے دیا اور اب اسی مہان لاکٹ سے میں تمہارا کام تمام کروں گا۔“اتنا کہہ سنتوش نے اللہ والا لاکٹ جیب سے نکالا اور رنگا کی طرف کیا رنگا کے کپڑوں میں بھی یکدم آگ بھڑک اٹھی اور وہ ایک منٹ سے پہلے جل کر خاک ہوگیا۔سنتوش نے لاکٹ کو چوما اور گلے میں پہن لیا اس نے ایک طرف پڑی انجلی کی راکھ کو دیکھا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

”برائی کا ساتھ دینا برائی ہے۔“

اب وہ بے ہوش پڑے رنبیر کی طرف بڑھا۔

☆......☆......☆

کچھ مہینوں بعد

آج رات کافی سیاہ تھی آسمان چاند ستاروں سے خالی تھا ایسے میں وہ بس اس صاف اور کبھی ختم نہ ہونے والی سڑک پر جارہی تھی بس کے تقریباً سبھی مسافر سیٹوں سے ٹیک لگائے گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے سنتوش بھی اسی بس کا مسافر تھا ڈرائیور اور کنڈیکٹر کے علاوہ صرف سنتوش تھا جو اس بس میں جاگ رہا تھا سنتوش کو بس کے سفر میں کبھی نیند نہیں آتی تھی آج کئی سالوں بعد وہ اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا وہ اداس بھی تھا اور خوش بھی اس لئے کہ وہ اپنے ماں باپ سے ملنے والا تھا اور گاؤں ہمیشہ کے لئے جارہا تھا اور اداس اس لئے کہ وہ شہر میں اپنے دوستوں کو چھوڑ کر جارہا تھا اس کے سبھی دوستوں کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے جب وہ اسے رخصت کررہے تھے آنسو کیوں نہ نکلتے آخر وہ اپنے دوستوں کے لئے جان تک کی پرواہ نہیں کرتا تھا انسپکٹر دیال بھی کافی افسردہ تھا۔

”سنتوش بیٹا تم شہر میں ہی رہو یہاں کوئی اچھی سی جاب کرلو۔“انسپکٹر دیال نے سنتوش کو مشورہ دیا۔

”نہیں انکل...... گاؤں میں پتا جی کی کافی زمینیں ہیں وہاں کھیتی باڑی کروں گا۔“سنتوش نے کہا۔

”تمہارے جانے کا سب سے زیادہ دکھ مجھ کو ہوگا۔“انسپکٹر دیال نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”دکھ تو مجھے بھی ہوگا انکل کیونکہ آپ جیسے انکل نصیب والوں کو ملتے ہیں۔“سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں بیٹا نصیب والا تو میں ہوں جسے تم جیسا دوست ملا جو بے جھجک میری خاطر آگ میں کود پڑا۔“انسپکٹر دیال نے کہا۔

”آپ بھی تو میرے ایک دفعہ کہنے پر مجرم پکڑنے چلے جاتے تھے ناں۔“سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ میرا فرض تھا پر تم فرائض میں نہیں تھے۔“انسپکٹر دیال نے کہا۔

”انکل جب سے آپ سے دوستی ہوئی ہے تو آپ کے کام بھی ہم پر فرض ہوجاتے ہیں اور ویسے بھی انکل انسان کو انسان کے کام آنا چاہئے کیونکہ اوپر والے

کا نظام بھی ہے وہ انسان کی تکلیف انسان کے ذریعے ہی دور کرتا ہے۔" سنتوش نے پوائنٹ کی بات کی۔ اگر ہر انسان کے وچار تمہارے جیسے ہوجائیں تو دنیا سے برائی کا خاتمہ مکمل طور پر ہوجائے۔" انسپکٹر دیال نے کہا۔

"اچھائی اور برائی کا ساتھ تو چلتا ہی رہے گا انکل...... کیونکہ جس طرح دکھ اور سکھ زندگی کا حصہ ہیں اسی طرح اچھائی اور برائی بھی دنیا میں رہے گی۔" سنتو نے کہا۔

"باتیں تو تمہاری دل میں گھر بنالیتی ہیں کہاں سے سیکھتے ہو اتنی خوب صورت باتیں۔" انسپکٹر دیال نے پوچھا۔

"عبداللہ اینڈ عبداللہ سے۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"ایک تو گاؤں کے عبداللہ انکل سے اور دوسرا یہاں کے عبداللہ سے۔" سنتوش نے ہنستے ہوئے بتایا۔

"مسلم سے۔" انسپکٹر دیال حیران ہوا۔

"جی ہاں وہ دونوں مسلمان ہیں اور ویسے بھی اچھی بات کوئی بھی دھرم کہے سن لینی چاہئے یہ بات اپنا دھرم تو نہیں مانتا پرنتو مسلم دھرم مانتا ہے۔" سنتوش نے کہا۔

"دوسرے دھرم کی بات ہم کیسے مان سکتے ہیں بھلا سنتوش۔" انسپکٹر دیال نے سوالیہ نگاہوں سے سنتوش کی طرف دیکھا۔

"انکل جی دھرم تو شروع سے ایک ہی ہے اوپر والے کو ایک ماننا، دھرموں کا بٹوارہ تو ہم لوگوں نے کیا ہے اور علم دھرم کا بھی یہی کہنا ہے کہ اوپر والا ایک ہے یہ بات ہر دھرم مانتا ہے مگر صرف یہ بات دھرم کی کتابوں میں ہے ہمارے دلوں میں نہیں دنیا کا ہر پادری، پنڈت، مولوی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اوپر والا ایک ہے سب دھرموں کی کتابوں میں جو یکساں ہیں ہم وہ تو مانیں کہ اللہ ایک ہے، بھگوان ایک ہے، گاڈ ایک ہے، دیال انکل اوپر والا ہمارا کتنا خیال رکھتا ہے کھانے پینے کے لئے دیتا ہے رہنے کے لئے گھر دیتا ہے کھانے کے لئے پھل دیتا ہے عورتوں کو ہمارے لئے بناتا ہے سنتان کو پیدا کرتا ہے تاکہ وہ سنتان بڑھاپے میں ہماری سیوا کرسکے اور بدلہ میں ہم اس کا شکر ادا کرنے کی بجائے اسے کئی حصوں میں بانٹ دیتے ہیں کبھی اور کئی کئی چیزوں میں ڈھونڈتے ہیں بلکہ کبھی چاند ستاروں میں انسان خود سوچے رات کو بنانے والا دن کو بنانے والا چاند ستاروں، سورج کو بنانے والا انسانوں کو بنانے والا، چرند پرند، جانوروں کو بنانے والا بھلا کسی کا محتاج کیسے ہوسکتا ہے ہم خود ہی پتھر کے بت بنا کر اسے پوجنے بیٹھ جاتے ہیں مسلم مسجدیں بناتے ہیں پرنتو وہ ایک کے بجائے کئی اللہ کو نہیں مانتے مسجدوں کو صرف اپنی جگہ کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں وہ قبلہ رخ ہوکر نماز پڑھتے ہیں وہ بھی صرف اس لئے کہ اوپر والے کا حکم ہے۔ پرنتو ہم مندروں میں بے جان مجسموں کی پوجا کرنے بیٹھ جاتے ہیں انسان اچھا کام کرے تو اسے اعلیٰ کا درجہ دے دیتے ہیں، لیکن انسان کتنا بھی عظیم کام کیوں نہ کرے مگر وہ اوپر والا نہیں بن سکتا۔ انسان کے اس عظیم کام کے پیچھے اوپر والے کا ہی ہاتھ ہوتا ہے کیونکہ اس کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہلتا، جھکا صرف اوپر والے کے ہی سامنے جاتا۔" سنتوش نے کہا۔

"ہوں......" انسپکٹر دیال نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"تمہاری باتیں تو غور طلب ہیں اب میں بھی اپنے پنڈتوں اور مولانا حضرات سے ضرور ملوں گا۔" انسپکٹر دیال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ضرور انکل...... تاکہ ہمیں دنیا میں آنے کا مقصد پتہ چلے یہی نہیں کہ ہم بے معنی زندگی گزار کر چلے جائیں۔" سنتوش نے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا میں ضرور یہ کام کروں گا۔" انسپکٹر دیال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، رنبیر کو بچانے کے لئے تو اس نے اپنی جان داؤ پر لگادی

تھی وہ بھی اس کا شکرگزار تھا ایک اور حیران کن راز سنتوش پر کھلا تھا جس نے اسے اپنی عقل سے حل بھی کرلیا تھا وہ ایک سنہری شام تھی جب وہ اور ساکھشی چھت پر بیٹھے تھے۔

"سنتوش میں نے تم جیسا بے وقوف انسان نہیں دیکھا۔" ساکھشی نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا۔" سنتوش مسکرایا۔

"اگر زبیر کو بچاتے بچاتے تمہاری جان چلی جاتی تو ہم تمہارے پتاجی کو کیا منہ دکھاتے۔" ساکھشی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"وہی منہ جو تم سب کے پاس ہے۔" سنتوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں مذاق کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں" ساکھشی نے بدستور منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو میں کون سا مذاق کے موڈ میں ہوں۔ اور ویسے بھی صحیح تو کہہ رہا ہوں میں۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ انسان کو انسان کے کام آنا چاہئے دوسری بات وہ میرا دوست ہے اور دوست وہ جو مصیبت میں دوست کے کام آئے ساکھشی کسی کے کام آنا ادھار کی طرح ہوتا ہے کیونکہ آج تم نے مدد کی ہے تو کل وہ تمہارے کام بھی ضرور آئے گا۔" سنتوش نے ساکھشی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں ایسی سمجھ داری کی باتیں سکھاتا کون ہے۔" ساکھشی نے پوچھا۔

"عبداللہ اینڈ عبداللہ۔" سنتوش نے بتایا۔

"عبداللہ اینڈ عبداللہ...... کیا مطلب ......" ساکھشی حیران ہوئی۔

"ایک تو گاؤں میں ہیں عبداللہ انکل اور دوسرا عبداللہ شہر والا۔" سنتوش نے بتایا۔

"سنتوش یہ دنیا بھی عجیب ہے ناں۔" ساکھشی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"کیوں ...... دنیا نے تمہیں کیا کہہ دیا۔" سنتوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"آئی ایم سیریس سنتوش۔" ساکھشی واقعی سنجیدہ تھی۔

"دنیا عجیب نہیں دنیا والے عجیب ہیں۔" سنتوش نے بتایا۔

چلو یہی مان لیتے ہیں۔" ساکھشی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"کچھ بتاؤ بھی آخر تمہیں دنیا سے کشٹ ہے۔" سنتوش نے پوچھا۔

"یہاں دھرموں کا بازار لگادیا۔" ساکھشی نے کھوئے کھوئے لہجے میں بتایا۔

"کیوں......کیا ہوا۔" سنتوش چونکا۔

"سب کا دھرم ایک ہی ہوتا تو کتنا مزہ آتا نہ ذات نہ برادری پرنتو۔" ساکھشی نے حسرت زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یہ دھرم ریت رواج ہمارے اپنے بنائے ہوئے ہیں ساکھشی ......اوپر والے کا تو صرف ایک دھرم ہے اور وہ ہے اوپر والے کو ایک ماننا اس کے ساتھ کسی دوسرے کو نہ مانو اور انسانوں کے بارے میں اوپر والے کا کہنا ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔" سنتوش نے بتایا۔

"یہ کیسی عجیب بات کہہ رہے ہو تم، اچھوت، غلام، کالا گورا کیسے برابر ہوسکتے ہیں۔" ساکھشی ہنسی۔

"مالک، اچھوت، غلام، کالا، گورا سب برابر ہوتے ہیں ساکھشی۔ مالک کو دینے والا بھی اوپر والا ہے اور غلام، اچھوت، گورے، کالے کو دینے والا بھی اوپر والا ہی ہے غلام بھی محنت کی کھاتا ہے اور مالک بھی محنت کی کھاتا ہے بس یہ اوپر والے کا نظام ہے کہ وہ انسان کی ضروریات انسان کے ذریعے ہی پوری کرتا ہے تو اس میں چھوٹا بڑا کہاں سے آ گیا مالک بھی اوپر والے کا دیا کھاتا ہے اور غلام بھی سچا اور حقیقی مالک (اللہ) اگر چاہے

توغلام کو مالک اور مالک کو غلام بنادے ماضی اور کتابیں ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں اب تم فیصلہ کروانسانوں میں کیا فرق ہے ہاں فرق تب ہوگا جب وہ اوپر والے کی عبادت دل کھول کر کرے تب اس کا رتبہ اوپر والے اور دنیا کی نظروں میں بڑھے گا ۔''سنتوش نے ساکھشی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاتو تمہاری دل کو لگتی ہے ۔''ساکھشی متاثر ہوتے ہوئے بولی۔

''ساکھشی یہ ہم انسانوں کی فطرت ہے کہ ہم ایک دوسرے میں فرق کرتے ہیں ورنہ اوپر والے کی نظر میں سب برابر ہیں ۔''سنتوش نے ساکھشی کو مزید بتایا۔

''کیا مسلم دھرم بھی اچھا ہے۔'' ساکھشی نے پوچھا۔

''بالکل...... کیونکہ اس دھرم کے نبی کی جو باتیں ہیں وہ بالکل سچی ہیں انہوں نے ہی تو اوپر والے کا یہ پیغام دنیا تک پہنچایا ہے کہ سب انسان برابر ہیں عورت کا مقام بتایا غلاموں کے حقوق بتائے انہوں نے جو بات کہی سچی اور کھری کہی وہ دنیا میں تقریباً آج سے چودہ سو سال پہلے آئے ان کی کہی ہوئی باتیں آج سچ ہورہی ہیں اور ان کے عاشق دیکھو آج تک ان کی باتوں پر عمل کررہے ہیں اور ان کی باتوں پر عمل کرنے سے انہیں بے انتہا فائدے پہنچ رہے ہیں۔''سنتوش نے بتایا۔

''نبی...... یہ نبی کیا ہوتا ہے......'' ساکھشی نے پوچھا۔

'' جب زمین والے اپنے اصل مقصد کو چھوڑ کر غلط راہوں پر چل پڑے تو اوپر والا انہیں سیدھی راہ دکھانے کے لئے انہی میں سے ایک نبی پیدا فرماتا تھا جو انہیں ان کے اصل مقصد سے آگاہ کرتے تھے لیکن پھر اوپر والے نے مسلمانوں کے نبی پر یہ سلسلہ بند کردیا میں نے سنا ہے کہ اب ان کا فرمان ہی سب کے لئے سیدھی راہ ہے چاہے کوئی انسان کسی بھی دھرم کا ہو اگر وہ یہ دین دھرم اپنائے گا تو وہ ہر جائز خواہش پوری کرسکتا ہے۔''سنتوش نے بتایا۔

''مسلمانوں کے نبی نے کیا کہا ہے۔'' ساکھشی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''ان کے فرمان سے تو کتابیں بھری پڑی ہیں۔''سنتوش نے بتایا۔

''تو ٹھیک ہے میں وہ کتابیں ضرور پڑھوں گی۔'' ساکھشی نے کہا۔

''ضرور پڑھنا کیونکہ ہوسکتا ہے تمہاری زندگی سنور جائے ۔''سنتوش نے کہا تو ساکھشی نے اثبات میں سر ہلادیا۔

پھر سنتوش نے اسے عبداللہ سے احادیث اور سیرت النبیؐ کی کتابیں لاکر دیں جس کا مطالعہ ساکھشی نے بڑے غور سے کیا اور پھر اس موضوع پر اس کی سنتوش سے بات شروع ہوئی۔

''تم نے واقعی ٹھیک کہا تھا سنتوش اسلام جیسی سچائی میں نے کسی بھی دھرم میں نہیں دیکھا۔'' ساکھشی نے کہا۔

''یہ تو واقعی حقیقت ہے ۔''سنتوش نے جواباً اثبات میں سر ہلایا۔

''مسلمانوں کے نبیؐ کا جنم آج سے چودہ سو سال پہلے ہوا انہوں نے جو باتیں اس دور میں کہی تھیں وہ آج ہر طرف موجود ہے۔ مسلمانوں کے نبیؐ تو واقعی کمال کے ہیں ۔'' ساکھشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''زندگی سے لے کر مرنے تک کے آسان طریقے بتائے ہیں جن پر چل کر انسان دنیا میں بھی کامیاب ہوتا ہے اور مرنے کے بعد سورگ (جنت) میں بھی جاتا ہے اسلام جیسا تو واقعی کوئی دھرم نہیں۔''

''بالکل...... یہ تو ہے اسلام جیسا کوئی دھرم نہیں اور اس دھرم میں کسی طرح کی سختی نہیں ہے اسلام دھرم میں صرف فائدے ہی فائدے ہیں مسلمانوں کے نبی

نے خود سختیاں برداشت کیں پرنتو اپنی جنتا (عوام قوم) کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔" سنتوش نے بتایا۔

"اس دھرم میں داخل ہونے سے انسان زندگی اور موت کی مشکلوں سے بچ جاتا ہے۔" ساکھشی نے بتایا۔

"یہ بھی حقیقت ہے۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"آج میں تم سے ایک بات شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ پرنتو تم وعدہ کرو کہ وہ راز ہم دونوں کے بیچ ہی رہے گا۔" ساکھشی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"پہلے بات بتاؤ پھر وعدہ کروں گا۔" سنتوش بھی سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"نہیں نہیں پہلے وعدہ پھر بات......" ساکھشی نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوکے بابا وعدہ۔" سنتوش نے آخر کار ہار مانتے ہوئے کہا۔

"مم...... میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔" ساکھشی نے بے دھڑک کہہ دیا۔

"کیا......؟" سنتوش حیران ہوا اور اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ہاں...... کیونکہ مسلمانوں کے نبیؐ میں جو سچائی میں نے پائی ہے وہ کسی اور انسان میں نہیں اپنے لئے کچھ نہیں صرف اپنی جنتا کے لئے سوچا اسلام میں داخل ہونے کی کوئی زبردستی نہیں، کسی کے دھرم کو برا نہیں کہنا اوپر والا ایک ہے کیونکہ یہ بات دنیا کے ہر دھرم کی کتاب میں موجود ہے اوپر والے کی نظر میں سب برابر ہیں۔ بڑوں سے تمیز سے بات کرو چھوٹوں سے پیار کرو ایک دوسرے کے کام آؤ اپنا وشواس صرف اور صرف اوپر والے پر رکھو کبھی کسی کو حقیر نہ جانو غریب مسکین کا خیال رکھو اسے کھانا کھلاؤ اپنے اردگرد کے لوگوں کا خیال رکھو وہ تو غیر دھرم کے لوگوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔

"میں ایک اور بات تم سے کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ کیا......" سنتوش نے پوچھا۔

"میں عبداللہ سے پریم کرتی ہوں......" ساکھشی نے عجیب بات کہی سنتوش ساکھشی کی اس بات پر مسکرایا۔

"مجھے پہلے ہی پتہ تھا کیونکہ میں نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ تم جب بھی عبداللہ کی طرف دیکھتی تو تمہاری آنکھوں میں حسرت ہوتی تھی۔" سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بالکل...... پرنتو مجھے یہ چنتا کھائے جا رہی تھی کہ ہمارا ملن کیسے ہوگا پرنتو اب مجھے اس کی کوئی چنتا نہیں۔" ساکھشی کسی خیال کے تحت بولی۔

"کیا مطلب......" سنتوش حیران ہوا۔

"پہلے میں نے سوچا تھا کہ اگر میرا اور عبداللہ کا ملن نہ ہوا تو میں آتما ہتھیا کرلوں گی یا مسلمان ہو جاؤں گی پرنتو اب بھی میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں پرنتو کارن کوئی اور ہے۔" ساکھشی اتنا کہہ کر رکی۔

"کیا کارن ہے۔" سنتوش نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

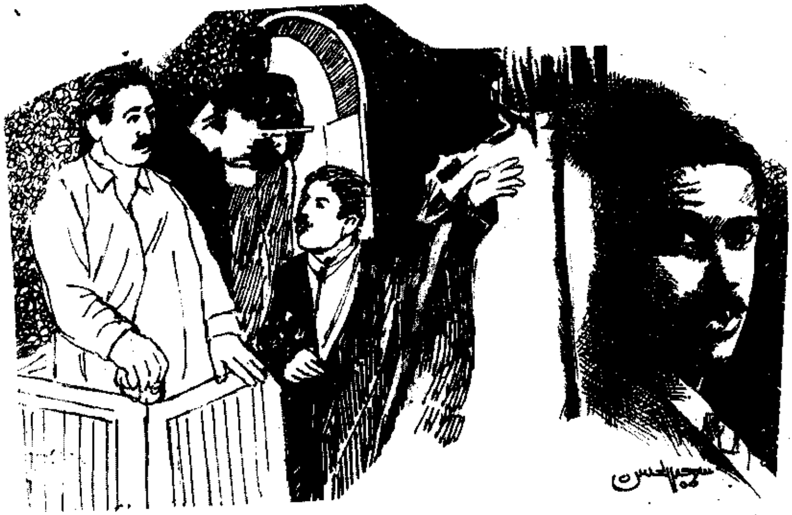
"اب میں مسلمانوں کے نبیؐ کے کارن مسلمان ہونا چاہتی ہوں کیونکہ انسان تب ہی کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ اوپر والے سے پریم کرے اور اس کے نبیؐ سے۔" ساکھشی نے بے حد خوب صورت وجہ بیان کی۔

"واہ بھئی واہ تم تو پوری تیاری میں ہو۔" سنتوش مسکرایا۔

"ہاں بالکل...... کیونکہ جیون کا کوئی وشواس نہیں کب سانس اکھڑ جائے اس لئے اوپر والے کا اصل اور حقیقی راستہ چن لینا چاہئے کیونکہ یہ جیون تو فرضی ہے اصل جیون تو مرتیو کے بعد شروع ہوگا۔" ساکھشی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"پرنتو مجھے ماتا پتا اور سریش کی چنتا ہے وہ نہیں مانیں گے۔"

(جاری ہے)



اندھیرے کا مسافر

طارق محمود۔کامرہ اٹک

مزدور گھر کی بنیاد اکھاڑ رہے تھے کہ اچانک ایک مزدور کی فلک شگاف چیخ سنائی دی تو قرب و جوار کے لوگ دہل کر رہ گئے، گڑھے میں انسانی ہڈیاں تھیں اور اس میں تعویذ مضبوطی سے بندھے پڑے تھے کہ پھر......

کبھی کبھی ناعقل لوگ اپنی ناعقلی دوسروں پر تھوپ دیتے ہیں، کہانی پڑھ کر دیکھیں

دھماکہ اتنا شدید تھا کہ کچہری کی بلڈنگ لرز اٹھی کھڑکیوں کے شیشے چھن چھنا چھن کی آوازوں سے چکنا چور ہو کر گر گئے سب لوگ زمین پر گر گئے ان کے منہ سے توبہ توبہ کے الفاظ نکلنے لگے۔ایک سپاہی کی گردن اڑ گئی دوسری کی پیٹھ میں کتنے ہی شیشوں کی کرچیاں گھس گئیں وہ بھی آہ وفریاد کرنے لگا ہر طرف قیامت سی برپا تھی کچہری کی کچھ دیواریں گر گئی تھیں لوگ ان کے نیچے پھنس گئے تھے گرد وغبار اتنا پھیلا کہ کسی کو پہچاننا مشکل تھا۔

میں اپنے تفتیشی افسر پر گرا تھا میرے اوپر بھی کچھ بوجھ سا تھا میں نے زور لگا کر اس کو اپنے اوپر سے ہٹایا چاروں طرف شور بپا تھا میں اٹھ کر کھانستا ہوا اس گرد وغبار سے ایک طرف نکلتا چلا گیا میرے دائیں بازو میں لگی ہتھکڑی کی زنجیر زمین پر گھسٹنے لگی تب مجھ

پر انکشاف ہوا کہ تفتیشی افسر یا تو مر گیا یا پھر بے ہوش پڑا ہے۔ ایمبولینس اور حکومت کی مددگار گاڑیاں ہوٹر بجاتی ہوئی وہاں آ پہنچیں۔ میں گرد و غبار چھٹنے سے پہلے وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کہ میری نظر ایک بچی پر پڑی جو کہ ٹوٹی ہوئی دیوار کے نیچے پھنسی ہوئی تھی، میرے ضمیر نے مجھے وہاں سے بھاگنے نہ دیا میں اس بچی کو نکال کر ایمبولینس تک اٹھا لایا وہاں کتنی ہی عورتیں بوڑھے ادھر ادھر گرے پڑے تھے جنہیں میں اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالنے لگا میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں چار آدمیوں کا قاتل تھا، بے شک وہ قتل میں نے طیش میں آ کر کئے تھے لیکن تھے تو قتل ہی، میں قاتل تھا مگر مجھے اس درد بھرے منظر نے رلا دیا میرے لئے یہ بہت ہی اچھا موقع تھا بھاگنے کا لیکن بے گناہ لوگوں کی تکلیف نے میرے پاؤں میں ان دیکھی زنجیر باندھ دی کتنے ظالم اور پتھر دل ہیں وہ لوگ جو ایسے دھماکہ کرتے اور کرواتے ہیں۔

جو لوگ ایسی موت بانٹتے ہیں جانے انہیں کیسی موت آئے گی۔ زخمیوں کو ریسکیو کارکنوں کے ساتھ اٹھاتے ہوئے میری ہتھکڑی کی زنجیر زمین پر گھسٹتی رہی لیکن مجھے احساس نہ رہا کہ میں ایک قیدی ہوں ایسا لگ رہا تھا کہ وہاں کوئی پولیس کوئی قیدی کوئی وکیل نہیں ہم سب درد کی زنجیر سے بندھے تھے اور زخمیوں کو اٹھا کر گاڑیوں میں ڈال رہے تھے یہاں تک کہ گنتی کے چند زخمی رہ گئے باقی بے گناہ لوگوں کی ڈیڈ باڈیز تھی میں ایک زخمی کو گاڑی میں لٹا کر پلٹا تو ایک جھٹکے سے رک گیا میرے سامنے میرا تفتیشی افسر کھڑا مجھے حیرت سے دیکھ رہا تھا، اس کو دیکھتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ میں ایک قیدی ہوں لیکن اس نے ایسا کام کیا کہ میں ششدر رہ گیا اس نے آگے بڑھ کر میری ہتھکڑی کھول دی۔

"مجھے حیرت ہو رہی ہے تم پر اپنے دل میں انسانیت کا اس قدر درد رکھنے والا کسی کو قتل کیسے کر سکتا ہے۔"

"لیکن آپ کے لئے میرا بھاگنا بہت مسئلہ بن سکتا ہے۔" میرے منہ سے بمشکل نکلا۔

"نہیں...... عادل تم تو اس دھماکے میں چیتھڑوں میں تبدیل ہو چکے ہو تم جاؤ کسی نئی پہچان سے نئی راہیں ڈھونڈو۔" اور میں اس کی طرف تشکر بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں سے نکل آیا، اب میرے ذہن میں دو ٹارگٹ تھے۔ میرے لئے دونوں ہی اہم تھے، دونوں ہی میری نظر میں انسانیت کے قاتل تھے۔

☆......☆......☆

میں ان دنوں پراپرٹی کا کام کرتا تھا زندگی بہت ہی اچھی گزر رہی تھی میری ڈیلنگ دونوں پارٹیوں سے ہی اچھی ہوتی بیچنا اور خریدنا کچھ لوگوں کی مجبوری ہوتی تو کچھ لوگ خریدار نئے نئے پلان لے کر زمین خریدتے ہمارے علاقے میں دو یونیورسٹیاں کچھ فاصلہ پر بن رہی تھیں اس لئے ان کے آس پاس کی زمین جو کہ زیادہ تر ریتلی تھی لیکن ان یونیورسٹیوں اور پھر مین روڈ بننے کی وجہ سے سونے کے بھاؤ بک رہی تھی میرے جیسے چھوٹے پراپرٹی ایجنٹ بھی اب تو کافی خوشحال ہو گئے تھے اب میرا اپنا گھر تھا چھوٹی سی گاڑی تھی دو بچے تھے ایک بیٹا ایک بیٹی دونوں ہی اچھے اسکول میں پڑھ رہے تھے میری بیوی اسی اسکول میں جاب کرتی تھی خوشحالی آتے ہی میں نے اس کی جاب چھڑوا دی، زندگی میٹھے جھرنے کی طرح رواں دواں تھی کہ اچانک ایک شیطان نے اس میٹھے جھرنے میں غلیظ پھینک دیا۔

ہوا یوں کہ میں ایک پراپرٹی کے سودے میں مصروف تھا کہ بیوی کے موبائل سے خالی آنے لگی میں نے ان لوگوں سے معذرت کی اور سائیڈ پر ہو کر جلدی سے فون اٹینڈ کیا، دوسری طرف ہماری پڑوسن تھی۔

"عادل بھائی جلدی پہنچیں بھابھی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہیں وہ خون کی الٹیاں کرتے کرتے بے ہوش ہو گئی ہے۔" میں نے فون بند کیا اور گاڑی

www.urdusoftbooks.com

میں بیٹھ کر گھر کی طرف تیزی سے چل دیا، ساتھ ہی خیال کے تحت ریسکیو ایمبولینس کو فون کردیا میرے گھر پہنچتے ہی ایمبولینس پہنچ چکی تھی وہ میری بیوی کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں سوار کررہے تھے کہ میں پہنچ گیا اور ہم اسے اسپتال لے گئے۔

میڈیکل ٹریٹمنٹ سے اس کی طبیعت کچھ سنبھل تو میں نے اس کا مکمل میڈیکل ٹیسٹ کروایا بظاہر کچھ بیماری نہ تھی رپورٹس بھی ٹھیک تھیں معدہ میں کچھ ہلکی سی پرابلم تھی لیکن وہ دن بدن کمزور سے کمزور ہوتی جارہی تھی گھر میں ہم دو ہی تو تھے بچے تو بہت چھوٹے تھے بیوی کی دیکھ بھال مجھے خود ہی کرنی پڑرہی تھی ادھر کام کا ہرج ہورہا تھا لیکن کیا کرتا گھر کو سنبھالنا بھی تو ضروری تھا بیوی کا علاج چل رہا تھا لیکن وہ سوکھ سوکھ کر بہت ہی کمزور ہوگئی تھی۔

آخر مجھے اس کی آنکھوں میں موت کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں اور پھر ایک دن ہم لوگوں کو سسکتا بلکتا چھوڑ کر چلی گئی۔

ہمارے ہنستے بستے گھر کو کسی کی نظر لگ گئی۔ میں نے قسمت کے اس لکھے پر صبر کرلیا، اب میں خود ہی بچوں کو تیار کرتا انہیں ناشتہ کھانا خود کھلاتا انہیں اسکول چھوڑتا اور پھر اپنے کام پر توجہ دیتا اپنی بیوی کی یاد بھی میرے دل سے نکل نہ سکی لیکن زندگی تو ہے غم اور خوشی بچے پہلے پہل بہت تنگ کرتے لیکن شاید ان کو بھی زندگی کی تلخیوں کی سمجھ آگئی تھی۔

زندگی کی گاڑی پھر سے چل پڑی اداس زندگی تھی لیکن اب یہ گاڑی تین پہیوں پر تھی بہنیں آتیں مجھے دوسری شادی کے مشورہ دیتیں اور اپنے گھروں کو واپس چلی جاتیں مشکل وقت میں دنیا میں والدین کے علاوہ کوئی کام نہیں آتا ان پر گلہ بھی کیا کرنا ہر بندے کی اپنی سو مجبوریاں ہیں۔ اس دن میں گھر پر ہی تھا بچوں کی بھی چھٹی تھی میرا دل چاہ رہا تھا کہ بچوں کو کہیں گھمانے لے جاؤں دروازے پر دستک ہوئی میں باہر نکلا تو سامنے میرا ایک جاننے والا پراپرٹی ڈیلر تھا۔

”ایک حقیقت“

اگر انسان یہ سمجھ لے کہ ”انسان کی موت اس وقت نہیں ہوتی جب وہ طبعی طور پر منوں مٹی تلے دبا دیا جائے۔ حقیقت میں انسان کی موت اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کی دعاؤں سے نکل جاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی انسان زندہ رہتا ہے کسی یادوں میں، دعاؤں میں اور ایصال ثواب میں۔“

تو کبھی پھر کوئی ایسا کام نہ کرے جس کی وجہ سے وہ کسی کی دعاؤں سے نکل جائے۔ اس لئے آسانیاں بانٹتے چلو تاکہ لوگ مرنے کے بعد بھی آپ کو اچھے لفظوں میں اور اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور آپ مرنے کے بعد بھی زندہ رہو کسی یاد، اچھے الفاظ اور دعا میں۔

(ایڈووکیٹ نینا خان۔ کراچی)

”عادل بھائی کیا حال ہے۔“ دعا سلام اور حال احوال کے بعد وہ اصلی بات پر آیا میرے گھر کی دیوار ایسی تھی جس کی وجہ سے اس کے گھر اور اس طرف بننے والے نئے گھروں کے لئے راستہ کچھ تنگ سا ہورہا تھا میں نے اس سے کہا۔

”دیوار وہ اپنے خرچہ پر گرادیں کچرہ وغیرہ میں خود اٹھوا کر تھوڑا سا اندر کرکے نئی دیوار بنالوں گا۔

میری بات سن کر وہ بہت ہی خوش ہوا۔ ”عادل بھائی جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر آپ کو پایا۔“ میں اس کی بات پر مسکرا کر رہ گیا۔

”راستہ تو صدقہ جاریہ ہوتا ہے مجھے لوگوں کا راستہ تنگ کرکے بددعاؤں اور گالیوں کے علاوہ ملتا کیا۔“

اس نے دو مزدور لگادیئے جو احتیاط سے دیوار گرانے لگے اور پھر ان مزدوروں نے ایک ہی دن میں وہ دیوار گرا کے اینٹیں صاف کرکے میرے صحن میں ڈھیر لگادیا۔

اب ہلکی ہلکی بنیاد اکھاڑ رہے تھے کہ اچانک ایک مزدور چیخ کر پیچھے ہٹا میں بھاگ کر ان کے پاس جا پہنچا کہ ان لوگوں کو کیا ہوا۔

میں نے دیکھا کہ کچھ انسانی ہڈیاں تھیں جن کے گرد کالا دھاگہ لپٹا ہوا تھا جس میں تعویز پروئے ہوئے تھے۔

''صاحب اسے ہاتھ نہ لگانا یہ تو آپ پر کسی نے سفلی عمل کروا رکھا ہے۔'' میں نے ان ہڈیوں کو اٹھانے کے لئے جھک کر ہاتھ بڑھایا تھا کہ ایک مزدور چلایا تو میں نے ڈر کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

''وہ کیا ہوتا ہے سفلی عمل اور کس لئے ہوتا ہے۔'' میں میٹرک پاس اپنے کام میں زندگی بتانے والا عام سا آدمی تھا۔

مجھے کالے علم کے بارے میں کیا پتہ تھا بس کبھی کبھار تعویز گنڈوں کے بارے میں گھر میں آنے والی عورتوں سے سنتا رہتا تھا لیکن کبھی دھیان نہ دیا۔ اس مزدور کو جتنا پتا تھا اس نے مجھے بتایا اس کی باتیں سن کر میرا دل کانپ اٹھا لوگ دوسروں کو ہرانے ان کو نیچا دکھانے کے لئے کیا کیا شیطان کے چکروں میں پڑے ہوتے ہیں۔

''اب مجھے کیا کرنا چاہئے اس سے حفاظت کے لئے۔''

میرے پوچھنے پر وہ مزدور صبح ایک پیر صاحب کو لے آیا جنہوں نے وہ ہڈیاں وہاں سے اٹھالیں اور میرے گھر پر چاروں طرف قرآنی آیات پڑھ کر دم کیا اور پانی پر دم کرکے ہم کو پینے کے لئے دیا۔

''عادل صاحب آپ کے کسی کاروباری حریف نے آپ کے گھر پر بہت سخت سفلی عمل کروایا ہے...... اس کے توڑ کے لئے مجھے تین دن آپ کے گھر میں ایک عمل کرنا ہوگا ......'' میں اب انہیں کیا جواب دے سکتا تھا اس بارے میں تو میں بالکل نا بلد تھا میں نے ان سے ان کاروباری حریف کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ناں میں سر ہلایا جس سے میں یہ سمجھا کہ یا تو انہیں اس کے بارے میں پتہ نہیں یا تو وہ بتانا نہیں چاہتے کیونکہ اس کاروبار میں تو اب بہت لوگ ہیں میں خود سے اسے نہیں ڈھونڈ سکتا۔ بھلا ہو ان پیر صاحب کا جو کہ تین دن تک میرے گھر وظیفہ کرتے رہے ور مجھے مطمئن کر کے یہاں سے گئے دیوار پھر سے تعمیر ہوگئی راستہ کھلا ہو گیا۔

ایک دن میری گاڑی باہر ہی کھڑی تھی بچوں کو تیار کر کے ہم نکلے تاکہ انہیں اسکول چھوڑ سکیں ہم باہر نکلے تو میں نے ایک آدمی زمان نامی کو کار سے عجلت میں دور ہٹتے دیکھا میرا ذہن پہلے سے اپ سیٹ تھا اس کو یوں وہاں سے تیزی سے دور جاتے دیکھ کر ماتھا ٹھنکا میں کار کو خوب غور سے نیچے اوپر اندر سے جانچنے والی نظر سے دیکھا بظاہر تو مجھے کوئی خرابی نہ لگی لیکن اندر سے میں ڈرا ہوا تھا، اسی لئے میں نے بہت ہی آہستہ آہستہ گاڑی چلائی بچوں کو چھوڑ کر مجھے سکون ملا، میں گاڑی واپس موڑ کر تھوڑی سی اسپیڈ بڑھائی ہی تھی کہ اچانک گاڑی ڈگمگانے لگی اور پھر درمیانی فٹ پاتھ سے لگ کر گاڑی خود ہی رک گئی ورنہ ہینڈل بالکل فری ہو گیا تھا اللہ کا خاص کرم ہوا، میں بچ گیا تھا لیکن گاڑی کا ٹائی راڈ ٹوٹ گیا تھا اور مجھے پتہ تھا یہ کس کی حرکت تھی۔

میرے دماغ میں پیر صاحب کی یہ بات چکرانے لگی کہ کوئی کاروباری حریف مجھے نقصان پہنچانے کے درپہ ہے زمان بھی میرا ایک کاروباری حریف تھا میں اب ساری بات سمجھ گیا لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا میری قسمت میں جو لکھا تھا وہ مجھے مل کر رہے گا میں نے ٹھنڈے دل سے زمان سے بات کرنے کا سوچا میں نے گاڑی ایک قریبی گیراج میں کھڑی کردی اور سیدھا زمان کے گھر پہنچا میں نے اس سے سکون سے بات کی لیکن وہ اور اس کے تین بھائی مجھ سے لڑنے لگے مجھے بھی غصہ آگیا، مجھ سے جتنا ہو سکتا تھا میں نے بھی ان کو مارا لیکن وہ چار تھے اور میں اکیلا مار کھاتے ہوئے جانے کیسے زمان کے ہاتھ سے میں نے پستول چھین لیا، صرف چار گولیوں نے ان چاروں کا خاتمہ کردیا۔

میں وہاں سے بھاگ نہ سکا اور بھاگ کر جاتا بھی تو کہاں، میرے بچے میرے بغیر کیسے رہ پاتے کسی نے پولیس کو فون کر دیا اور میں گرفتار ہو گیا۔

میرا وکیل مجھے پکا یقین دلا رہا تھا کہ مجھے سزائے موت نہیں ہو سکتی، ہاں کچھ سال کی سزا ہو گی۔

اس دن عدالت میں پیشی تھی کہ دھماکہ ہو گیا۔

مجھے عرفان استاد ملا جس نے میری کہانی سنی تو اس نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔

”عادل صاحب تمہاری ہنستی بستی خوشحال زندگی کے ساتھ تو بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے...... جیسے تم بتا رہے ہو کہ تمہاری بیوی تندرست تھی لیکن اچانک بیمار ہوئی اور چل بسی...... میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ سفلی عمل بہت ہی سخت ہوتا ہے۔“

”عرفان استاد زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا تو وہ بولے۔

”دیکھو میں مولوی نہیں کہ تمہیں بھرپور طریقے سے سمجھا سکوں، بس اتنا سمجھ لو کہ یہ سب شیطانی ہتھکنڈے ہیں، شیطان نے قیامت کی صبح تک اپنے کرتوتوں کے لئے اللہ سے مہلت لے رکھی ہے۔ اللہ نے بھی فرمایا کہ ”جو میرے بندے ہیں وہ تیرے بہکاوے میں کسی صورت بھی نہ آئیں گے اگر کچھ بھٹک بھی گئے تو توبہ مانگیں گے تو میں انہیں بخش دوں گا۔“

یہ سب باتیں میرے دماغ میں فٹ ہو گئیں اور ادھر ہی مجھے پتہ چلا کہ آج کل ایک عامل ناگر بابا اس علاقہ میں اپنے کالے عمل سے شیطان کو خوش کر رہا ہے، اب میرا پہلا ٹارگٹ وہی تھا میرے بچے میرے پڑوسی کے گھر میں تھے جن کی اولاد نہ تھی مجھے پتہ تھا کہ وہ لوگ میرے بچوں کو بہت پیار سے رکھیں گے ٹی وی اور اخبار میں میرے مرنے کی خبر نشر ہو چکی تھی اب میں اپنے بچوں کی زندگی میں دوبارہ جا کر ارتعاش پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں ناگر بابا کے پاس ایک ضرورت مند بن کر گیا اور اپنی درد سے بھی کہانی سنا کر اس کا چیلا بن گیا میں کچھ دن اس کے پاس رہ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ واقعی وہ کالے عمل کرتا ہے۔

کیسے کیسے لوگ اس کے پاس آ رہے تھے کوئی ساس اپنی بہو کے ہاتھوں تنگ تھی اور اس پر سفلی عمل کروانا چاہتی تھی تو کوئی بہو ساس کے ہاتھوں دنیا کمانے کے چکر نے لوگوں کی مت ماردی تھی ہر کوئی اپنے کاروباری حریف، رقیب اپنے محبوبہ کے ہونے والے خاوند کو کیسے کیسے لوگ وہاں شیطان کے بہکانے سے آ رہے تھے مجھ سے اور دیکھا نہ گیا، رات کو میں نے باقی چیلوں کو کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا کر بے ہوش کر دیا اور پھر ناگر بابا کو ایسی سزا دی کہ میں خود اس کا حال دیکھ کر لرز اٹھا، میں نے پانی میں خالص تیزاب ملا کر اس کے منہ میں جبراً ڈالا وہ پینا نہ چاہتا تھا۔

میں نے اس کی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کاٹ دی اس نے پھر بھی ضد کی تو میں نے ایک اور انگلی کاٹ دی جب وہ درد سے چلانے کی کوشش کرتا تو میں اس کے منہ پر جما کر ہاتھ رکھ دیتا آخر تین انگلیاں کٹوانے کے بعد اس نے موت کا پیالہ پی لیا تیزاب اندر جاتے ہی اس کے منہ ناک اور نیچے سے دھواں نکلنے لگا میں نے اسے مضبوطی سے باندھ رکھا تھا وہ تڑپنا چاہتا تھا لیکن تڑپ نہیں سکتا تھا اس کو ایسے موت آئی کہ اس کے اندر سے سب کچھ بہہ نکلا اس کے بعد میں وہاں سے غائب ہو گیا۔

اب ناگر بابا جیسے لوگوں کے لئے میں ایک بہروپیا قاتل، وحشت کی علامت ہوں اس کے بعد دو اور کالے کرتوتوں والے میں نے ایسے ہی قتل کئے، تو ایسے عمل کرنے والے چھپنے لگے، میں ساتھ ساتھ اپنے دوسرے ٹارگٹ کلر دھماکے اور دہشت گردی کی واردات کرانے والوں کی تلاش میں ہوں، میرا پختہ عزم ہے کہ انسانیت دشمنوں سے میں اپنے ملک کو اپنی طاقت رکھنے تک لڑتا رہوں گا انہیں صفحہ ہستی سے مٹاتا رہوں گا اب میرا نام مجاہد ہے اور میں اندھیرے کا مسافر ہوں۔

سفاک کون

مہر پرویز احمد دولو۔میاں چنوں

نادیدہ قوت کی دل شکستہ آواز سنائی دی۔ "محترم بزرگ عام لوگ ہم پر الزام تراشی کرتے ہیں بلکہ جھوٹی باتوں کی وجہ سے ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں اور حقیقت سے سب آشنا ہیں۔

حقیقت کے پالنا میں جھولتی ہوئی اپنی نوعیت کی لرزا دینے والی دل گرفتہ کہانی

"**میں** پنچایت کے سامنے جو کچھ کہوں گی سچ کہوں گی۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی۔ ہم نے باباجی سے جنوں کے ذریعے حساب کروایا ہے انہوں نے ثبوتوں کے ساتھ ہمارے خدشات کی تصدیق کردی ہے۔ یہ تمام اشیاء کیل، سوئیاں، عورت کے سر کے بال، بلیڈوں کے ٹکڑے، ان کی تعداد اور مقدار جنوں نے بتائی ہے جبکہ یہ تمام اشیاء ہم نے ایک سفید کاغذ میں لپیٹ کر شاپر میں بند کرکے صندوق میں رکھ کر بڑا بھاری تالا لگایا تھا۔"

سوکلومیٹر دور باباجی کے خاص حجرے میں جنوں نے یہ تمام اشیا دائرے کے اندر میرے سامنے لاکر رکھ دی تھیں۔

باباجی نے اپنے خاص حجرے میں مجھے بلایا پکے فرش پر موٹی سیاہ مارکر سے دائرہ لگایا اس کے اندر مجھے بیٹھایا۔

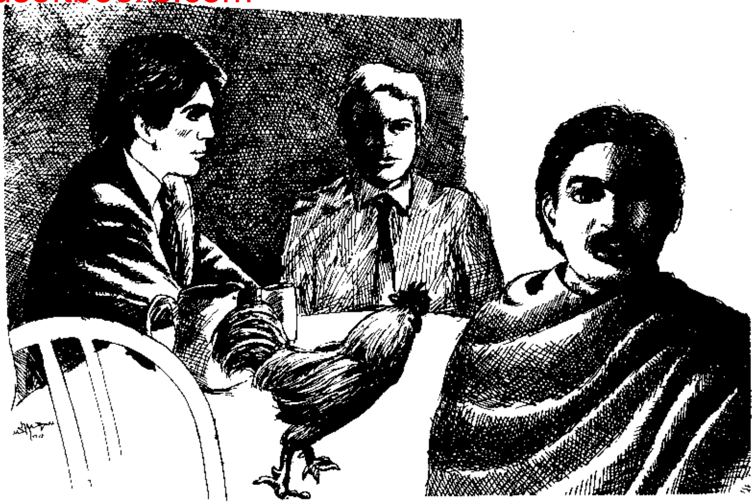
میرے دائیں انگوٹھے پر زیتوں کا تیل لگایا اور مجھے اپنی ساری توجہ اس انگوٹھے پر مرکوز کرنے کی ہدایت کی۔

باباجی نے جونہی پڑھنا شروع کیا، میرا انگوٹھا بلب کی طرح جلنے بجھنے لگا نظریں ٹکانے کی وجہ سے آنکھیں چندھیا کر خود بخود بند ہونے لگیں دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگیں، یوں محسوس ہوا جیسے نوکیلے ناخنوں، لمبے دانتوں، سیاہ بال اور انگارے کی طرح جلتی آنکھوں والی پانچ بدروحوں نے مجھے سر سے لے کر پاؤں تک جکڑلیا ہے سانس لینا دشوار ہوگیا، آنکھیں ابل کر باہر آنے لگیں دکھ غم پریشانی اور خوف سے میری چیخیں کمرے کی چھت کو پھاڑ کر باہر جانے لگیں۔

چیخ نکلنے کے فوراً بعد مجھے باباجی کی مسحور کن آواز سنائی دی۔

"مریدنی ڈرو نہیں، ان انسانیت دشمن چڑیلوں کا مقابلہ کسی عام ٹوٹکے باز، جعلی عامل اور فراڈیے جن بابا سے نہیں بلکہ "گھوبے شاہ" سے ہے۔ میں ان کا خون پی جاؤں گا چتا جلا کر ویران کھنڈروں میں خاک پھینکوں گا ان کو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ہر ڈراؤنی مخلوق انسان کے سائے سے بھی دور بھاگے گی۔"

جس شخص نے عمل کرکے ان کو تمہارے پاس بھیجا ہے وہ زندگی کی بھیک مانگے گا، آئندہ کسی سائل سے من مرضی کے روپے بٹور کے اس کے مخالف کے



پاس نہیں بھیجے گا، چڑیلوں کے ساتھ اس کو بھی تہس نہس کردوں گا۔ تم حوصلے سے کام لو، تھوڑی سی تکلیف برداشت کرو۔"

آنے والے لمحات میں چڑیلیں تڑپنے ،تلملانے اور چیخ وپکار کرنے لگیں، جیسے جلتی آگ میں پھنسا زندہ انسان زندگی بچانے کی تگ ودو کرتا ہے۔

اسی دوران چھوٹے چھوٹے بونوں کی ایک فوج آ گئی، جو کہ ان چڑیلوں سے بھڑ گئی، ان کے گتھم گتھا ہوتے ہی ایک بھاری شاپر ایک چڑیل کے ہاتھ سے گر گیا جسے اس چھوٹی مخلوق کے ایک لیڈر ٹائپ بونے نے اٹھا لیا، اس نے جب اس کو کھولا تو اس میں یہ سب اشیا جو آپ کے سامنے کیل، پن، بلیڈ اور بالوں کی صورت میں رکھی ہیں ان اشیاء کو اس بونے نے باباجی کے حضور پیش کیا اور تمام ساتھیوں کو لے کر غائب ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی مجھ پر غنودگی چھا گئی، دو نرم وملائم ہاتھوں نے فرش سے اٹھا کر مخملی پلنگ پر لٹا دیا لیٹتے ہی گرم معطر سانسوں اور دل کی سریلی دھڑکن نے میری رگ رگ میں نشہ بھر دیا۔

سکون کے لمحات سے فارغ ہوتے ہی ایک بار پھر ننگ، دھڑنگ ڈراؤنی شکل والی چڑیلیں دائرے کی شکل میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر باباجی کے حضور گریہ زاری کرنے لگیں اور آئندہ کسی بھی انسانی آبادی میں آنے سے توبہ کرنے لگیں پہلی غلطی پر بار بار معافی مانگنے لگیں۔

باباجی نے رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی غلطی کی اس شرط پر معافی دی کہ وہ آئندہ کسی آبادی کے نزدیک رہائش نہیں رکھیں گی۔

باباجی نے جب ان سے میرے پاس آنے کی وجہ پوچھی تو بولیں۔

"مجیب نامی شخص نے ایک غیر مسلم سانگا مسیح کو دس ہزار روپے دیئے کہ حمیدہ کے گھر میں قیمتی گائے کو جان سے مارنا ہے، یہ گائے قیمتی اور ان کو بہت عزیز ہے، گائے کے مرنے پر ان کو دو لاکھ کا نقصان ہوگا، وہ ہمارا بہت نقصان کر چکے ہیں، ہم براہ راست ان سے نہیں لڑ سکتے لہٰذا آپ اس گائے کو تعویذ گنڈے یا کسی ہوائی مخلوق کے ذریعے مروا دیں۔"

سانگا مسیح نے پلید جسم کے ساتھ پلید عمل کر کے ہم چڑیلوں کو قید کر رکھا ہے اس نے ہمیں بلایا ہم نے گائے کے پیٹ میں بلیڈ، کیل وغیرہ ڈال کر اسے شدید

زخمی کردیا زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جب وہ مرنے لگی تو اسے حلال کردیا گیا اس کی بیماری کو مشکوک ہونے سے بچانے کے لئے اس کے پیٹ کے اندر ڈالا گیا سامان ہم نے نکال لیا یہ تمام سامان ہم سالکا مسیح کو دینے واپس جارہی تھیں کہ اس دوران آپ نے عمل کرکے ہم کو بلوالیا۔ سزا بھی دی اور سامان بھی ہم سے چھین لیا، وہ سامان جو مجیب میرے سابق داماد نے گائے کو کھلا کر ماردیا تو اب ہم اس سے دو لاکھ کی بجائے دس لاکھ لیں گے۔

اگر اس نے ہماری گائے کو ہلاک نہیں کیا تو ہمیں دس لاکھ کا ضامن دے۔

اگلے جمعے والے دن نماز جمعہ کے بعد کوئی بھی شخص اس کی جگہ مسجد میں حلف دے کہ ہماری گائے کو اس نے ہلاک نہیں کیا تو ہم اس پر لگائے گئے الزام کی معافی مانگیں گے اور آئندہ اس کی ذات پر انگلی نہیں اٹھائیں گے۔

یہ تمام باتیں طے ہونے کے بعد مجیب کے ساتھ آئے ایک شخص نے پنچایت کے سرپنچ سے کہا۔

”اگر آپ اجازت دیں تو ہم بھی ایک بزرگ سے پورے گاؤں کے سامنے چوراہے پر حساب کروالیں ہوسکتا ہے یہ واقعہ ایسے نہ ہو جیسے حمیدہ نے بیان کیا ہے ان کا مجرم کوئی اور ہو۔“

دونوں فریقین کو پنچایت نے پابند کیا۔

حلف دینے سے قبل ایک بار پھر حساب کروانے کے عمل پر اتفاق کیا گیا۔

☆......☆......☆

حمیدہ کا کردار ہوش سنبھالتے ہی مشکوک نہیں بلکہ کالی سیاہ، گھپ، اندھیری رات کی طرح سیاہ تھا لاکھ کوشش کے باوجود عزت کا سفید داغ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

جوانی کی عمر کو پہنچی تو آئے روز کی تہمت، بدنامی، ہزیمت والدین کے لئے سوہان روح بن گئی اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لئے دور کے رشتہ داروں میں اس کی شادی کردی گئی۔

سسرال جانے پر پرانی روش نہ بدلی، زندگی کی صبحیں شاموں میں تبدیل ہوتی رہیں چھ بچوں کی ماں بننے کے دوران کتنے ہی معاشقے چلے، کچھ کامیاب ہوئے کچھ ناکامی سے دوچار۔

ادھیڑ عمر کو پہنچ گئی مگر جس برے کام کی گھٹی لے کر پلی بڑھی تھی نصیحت کی طرح زندگی کے دوپٹے سے باندھ کر رکھا، یہ برائی خون پینے والی جونک کی طرح اب تک اس کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔

دو بیٹیاں جوان ہوئیں تو ماں کی روش اپنائی، زخم چوسنے والی مکھی کی طرح طالب آتے اور روپوں کے عوض طلب پوری کرکے چلے جاتے۔

ایک بیٹی کا رشتہ دور پار کے رشتہ داروں میں طے کردیا اور ایک ہمسائے میں ایک قریبی عزیز مجیب کو دے دیا۔

مجیب ایک فرم میں بطور سیل مین کام کرتا تھا اکثر ملک کے طول و عرض میں دورے پر ہوتا اس لئے اس کی بیوی شبنم میکے میں ماں کے پاس رہتی۔

حمیدہ اور بیٹی شبنم نے گھناؤنا کاروبار جاری رکھا، لیکن اب حمیدہ کے بیٹے باشعور ہوچکے تھے، زمانے کی اونچ نیچ کو سمجھتے تھے انہوں نے ماں بیٹی کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگادی لیکن جیسے چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہیں اسی طرح وہ چوری چھپے لوگوں سے ملنے لگیں لیکن یہ بات کب تک چھپی رہتی اکثر مل بیٹھے پکڑی جاتیں تو ان کی خوب دھلائی ہوتی گاؤں میں بدنامی الگ ہوتی۔

اب کی بار بیٹوں نے باز نہ آنے پر ہاتھ پاؤں توڑنے کی دھمکی دی۔

یہ دھمکی سن کر ان کے اوسان خطا ہوگئے، لیکن دوسری طرف وہ دوستوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اس مشکل مسئلے سے نمٹنے کے لئے سخت بے قرار ہوگئیں۔ لفنگوں کو لفنگے میلوں دور سے تلاش

کر لیتے ہیں ان کو بھی ایک باباجی کی بھنک پڑ گئی جو خواتین میں بہت مقبول تھے عزتوں کا لٹیرا ہونے کے ساتھ ساتھ سائلوں اور مریدوں کی جیبیں ہلکی کرنے کا فن بھی خوب جانتا تھا۔

یہ بابا تو سو فیصد ماں بیٹی حمیدہ اور شبنم کو مطلوب تھا، یہی ان کی بھنور میں پھنسی ناؤ کو کنارے لگا سکتا تھا۔

یہ باباجی الو کے خون سے دوران محبت تعویز لکھتا تھا جو سو فیصد کامیاب ہوتے۔تعویز لیتے ہی سائل کے تمام داغ دھلنا شروع ہوجاتے مخالفین آنکھوں سے نابینا، کانوں سے بہرے اور پاؤں سے معذور ہوجاتے، سائل مکمل کر من مرضی کے فیصلے اور افعال کرتا اس باباجی کی اطلاع پاتے ہی ماں بیٹی نے سکھ کا سانس لیا اگلے ہی دن دوپہر کے وقت باباجی کے حجرے میں پہنچ گئیں۔

☆......☆......☆

غفور عرف گھوبا کسی دور میں گاؤں کے چوک میں بیٹھ کر جوتے گانٹھتا اور پالش کرتا تھا کام کروانے والی اکثر خواتین اور لڑکیوں سے چھیڑ خانی کرنے پر اس کی جوتوں سے مرمت ہوچکی تھی۔

عاشقی کا بھوت جب سر پر سوار ہوا تو سب کام چھوڑ کر منزل پانے کے لئے من کی مرادیں پوری کرنے والے بابا کا ملنگ بن گیا۔

یہ باباجی کے لئے سائل تلاش کرکے لاتا، جھوٹی موٹی کرامات سنا کر لوگوں کی توجہ مبذول کرواتا من پسند خواہشات کی تسکین کے قصے سناتا اور لوگوں کو مطمئن کرتا۔

ایک لمبے عرصے تک خدمات سرانجام دینے کے صلے میں باباجی نے اپنے گدی نشین کی خلعت سے نوازا اور لوگوں کو فیوض وبرکات سے مستفید کرنے کے لئے دور کے علاقے میں بھیج دیا جہاں کے مریدوں کو باباجی کے حضور حاضری دینے کے لئے بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا مریدوں اور مریدنیوں سے آشنائی تھی ان کی عقیدت نے جلتی پر تیل کا کام کیا باباگھوبے شاہ کی شہرت کو چار کی بجائے آٹھ چاند لگا کر دور دور تک ڈھنڈورا پیٹا۔

"گھوبے شاہ" کی کرامات کی شہرت حمیدہ اور شبنم کے کانوں میں پڑی تو فیضیاب ہونے کے لئے بے قرار ہوگئیں اور باباجی کے حضور پیش ہوگئیں۔

خوب صورت وحسین ماں بیٹی کو دیکھتے ہی باباجی کے منہ سے رال ٹپکنے لگی جبکہ شکار خود قفس میں مقید ہونے کے لئے بے قرار تھا۔

کون سا تعویز اور کالے کا دم، باباجی اور ان کے درمیان پیری مریدی سے ہٹ کر رشتہ قائم ہوگیا بیٹوں کو لگام ڈالنے کے لئے باباجی نے اپنے ایک خاص مرید کو کہہ کر دور کے شہر میں نوکری کا بندوبست کردیا ،جبکہ خود ماں بیٹی کی قربت سے مزے اڑانے لگا۔

ایسے چھٹے ہوئے پیروں کے مرید بھی ان کی طرح ذلت کے گڑھوں میں گرے ہوتے ہیں ایک خاص مرید کی نظر جب شبنم پر پڑی تو وہ اس پر فریفتہ ہوگیا۔

باباجی کو آستانے کے لئے ایک کینال زمین دی ساتھ ہی نذرانے کا ڈھیر بھی بطور عقیدت پیش کیا اور بدلے میں کنیز شبنم کا ہاتھ مانگا۔

باباجی نے نظر عنایت کرتے ہوئے اس بار ہاتھ آئی بارات سے مل کر محظوظ ہونے کا فیصلہ صادر فرمایا۔

مرید نے اسے بھی غنیمت سمجھا، شبنم اب باباجی کے علاوہ مرید کی بھی منظور نظر بن گئی۔

☆......☆......☆

باباجی کے آستانے پر ماں بیٹی اپنے چاہنے والوں کے ساتھ عیاشیوں کی دلدل میں دھنستی گئیں۔

فحاشی کے قصے آستانے سے گھر کی دیواروں تک آپہنچے۔

شبنم کا خاوند عجیب طیش میں آگیا۔

شبنم کو مارا پیٹا، آئندہ میکے اور کسی بھی آستانے پر جانے سے سختی سے منع کردیا۔

مگر عشق کی آگ نے عزت، غیرت، انا، خودداری کو جلا کر خاکستر کردیا تھا، ایسی دھمکیوں اور پابندیوں نے خاک اثر دکھانا تھا۔

مرید اور شبنم ایک دوسرے کی زلفوں کے اسیر اور یک جان دو قالب تھے۔ سماجی رکاوٹوں کو روندنے کا فیصلہ کیا۔

باباجی اور آشنا کے کہنے پر خلع کا دعویٰ دائر کردیا۔ یہاں بھی باباجی کا اثر ورسوخ کام کرگیا۔

کسی بھی پیشی کی اطلاع مجیب کو نہ مل سکی، عدم پیشی پر یکطرفہ فیصلہ ہوا شبنم کو طلاق ہوگئی مجیب کے نام کی زنجیر کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گئی اب سب لوگوں کو خوب کھل کر رہنے کا موقع مل گیا۔

مجیب نے اپنے دفتر کی ساتھی ورکر سے شادی کرلی جو متعلقہ شاخ کی سربراہ تھی اس کے دن بدلنے لگے۔

میاں بیوی کی تنخواہ بہت زیادہ تھی تھوڑے عرصے میں شہر سے پلاٹ خرید کر ایک خوب صورت گھر بنالیا۔

مجیب کا ایک بھائی اور بہنوئی گاؤں میں رہتے تھے ان کو ملنے جب مجیب آتا تو دفتر کی ٹویوٹا کرولا میں بیوی کے ساتھ تحائف سے لدا پھندا بھائی کے گھر آتا۔

روپے پیسے کی ریل پیل نے اس کے انداز واطوار تبدیل کردیئے تھے۔ خوشحالی کے جھولے میں مجیب اور اس کے گھر والوں کو جھولتے دیکھ کر حمیدہ اور شبنم کے سینے پر سانپ لوٹتے۔

وہ ہر صورت مجیب اور اس کے گھر والوں کو زک پہنچانا چاہتے تھے۔ اور تو کچھ نہ کرسکے ان کی ایک آسٹریلیا کی گائے تھی جس کا ریٹ دو لاکھ روپے لگ چکا تھا اور انہوں نے بیچنے سے انکار کردیا تھا۔

اس گائے کو ہلاک کرکے الزام مجیب اور اس کے گھر والوں پر لگانے کا فیصلہ کیا گیا ایک دن انہوں نے کچے آٹے کے پیڑے بنائے ان میں خواتین کے سر کے بال، کیل، پنیں بلیڈوں کے ٹکڑے، تیزاب اور پارہ ڈالا گیا اور یہ پیڑے باری باری گائے کو کھلا دیئے۔

زہریلے مادوں اور کیلوں، بلیڈوں پر مشتمل آٹے کے پیڑے کھاتے ہی گائے بیمار ہوگئی زمین پر گر گئی چاروں پاؤں بے قراری سے ادھر ادھر مارنے لگی۔

حمیدہ نے نمبردار کے ہمسائے سے قصائی کو بلایا۔ ساتھ ہی نمبردار کا بیٹا بھی بلالیا اس کے علاوہ چند اور مرد حضرات اکٹھے کرکے سب کے سامنے گائے حلال کروائی چمڑا وغیرہ اتار کر جب پیٹ کاٹا گیا تو اندر بہت سے زخم تھے۔

جب اوجھڑی کو کاٹا گیا تو چارے کے ساتھ آٹا، بلیڈ، پنیں، اور کیل بھی برآمد ہوئے۔

ان تمام اشیاء کو نکالا گیا تو حمیدہ نے دیکھتے ہی دوپٹہ سر سے اتار کر دور پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے منہ پر تھپٹر مارنے لگی۔

شبنم نے جب ماں کو روتا دیکھا تو وہ بھی ماں کے ساتھ زور زور سے چیخیں مار کر رونے لگی۔

پیٹ سے تمام سامان نکال کر دھویا گیا اسے سفید کاغذ میں لپیٹ کر شاپر میں بند کرکے صندوق میں رکھ کر تالا لگا دیا گیا۔

اگلے دن ماں بیٹی گائے کی ہلاکت کا سبب جاننے کے لئے باباجی کے حضور پہنچ گئیں۔

باباجی نے تمام حالات وواقعات کو ایک خاص رنگ دے کر تمام الزام ثبوتوں کے ساتھ مجیب اور گھر والوں پر لگایا۔

یہ سب اشیا پنچایت اکٹھی کرکے حمیدہ نے سب لوگوں کے سامنے رکھیں باباجی کے حساب کا فلسفہ بیان کیا اور تمام واقعات میں مجیب اور اس کے گھر والوں کو ملوث کیا۔

☆......☆......☆

مجیب کے ساتھ پنچایت میں موجود ایک شخص نے علاقے کی معروف، ہر دلعزیز بزرگ شخصیت سے

رابطہ کیا اور تمام واقعات اس کے گوش گزار کیے۔

اس باباجی نے جمعہ والے دن سب لوگوں کے سامنے بیچ چوراہے پر چڑیلوں کو بلا کر ان سے حقیقت حال جاننے کا اعلان فرمایا۔

پنچایت، مدعی، ملزمان اور تمام گاؤں کے لوگوں کو چوک میں اکٹھے ہونے کا اعلان کروایا گیا۔

جمعہ والے دن بزرگ نے ایک مکان کی دیوار کو سیاہ چادر سے ڈھانپنے کا حکم دیا پوری دیوار جب کالی چادر سے چھپ گئی تو باباجی نے مخصوص منتر پڑھنا شروع کیا منتر پڑھتے ہی اس سیاہ چادر پر ڈراؤنی شکلوں والی چڑیلوں کا غول نظر آنے لگا جب سب چڑیلیں نمودار ہوگئیں تو باباجی نے ان کی ملکہ چڑیل سے سوال کیا۔

"سنا ہے تم سانگا مسیح کی قید میں ہو اور اسکے کہنے پر انسانوں کا نقصان کرتی ہو۔حمیدہ کی گائے کو بھی تم نے سانگا مسیح کے کہنے پر ہلاک کیا ہے۔کیا یہ سچ ہے؟" تمام الزامات سننے کے بعد ملکہ چڑیل انتہائی مودبانہ انداز میں بولی۔

آبادی سے دور پراسرار جنگلات، پہاڑوں اور کھنڈرات میں ہم سکون سے زندگی کی گاڑی میں محوسفر تھیں رہائش کے لئے آسائشات سے مزین حویلیوں اور بنگلوں کی خواہشمند نہیں تھیں، محدود ضروریات اور خواہشات تھیں جو آسانی سے پوری ہورہی تھیں کسی قسم کے مسائل اور پریشانیوں سے دوردور تک واسطہ نہ تھا۔

بڑھتی آبادی نے دیہاتوں سے شہروں کی طرف اور شہروں سے دیہاتوں کی طرف سفر کرنا شروع کردیا یہ آبادیاں، دیہاتوں، شہروں کونشانہ بناتی، جنگلات اور کھنڈرات تک جا پہنچیں ہمارا جنگلات اور کھنڈرات میں بسیرا شہری آسائشات سے لطف اندوز ہونے والے معززین نفیس اور انسانیت کے ٹھیکیداروں کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

ان لوگوں کو اب شہر کی زندگی بھی ناگوار محسوس ہونے لگی، شوروغل، آلودگی اور رش سے ان نفیس لوگوں کا دم گھٹنے لگا۔آبادی سے ہٹ کر بنگلے بنانے شروع کردیے، روپے پیسے کی ریل پیل نے ان کا غرور اور تکبر آسمان پر پہنچا رکھا تھا، اپنے علاوہ انسانوں کو گھٹیا، حقیر کمتر اور کیڑے مکوڑے سمجھتے تھے ہمیں کہاں خاطر میں لاتے۔

ہم سے ویران ٹھکانے بھی چھین لئے گئے، سر چھپانے کے لئے ہمیں جگہ کا ملنا محال ہوگیا زندہ انسانوں نے جب ہم سے زندگی چھیننا چاہی تو ہمیں وہ لوگ عظیم اور اپنے ہمدرد محسوس ہوئے جوان زندہ لوگوں کے گھر، بنگلے، گلیاں، بازار، کوٹھیاں اور لگژری گاڑیاں چھوڑ کر قبرستان کی خاموش مگر پرامن سرزمین کے مقیم بن گئے تھے۔

ان مرحومین کی شرافت، بے بسی اور انسانیت دوستی سے متاثر ہوکر قبرستان کے اندر کھنڈرات اور جھاڑیوں پر بسیرا کرلیا۔

رات کو قبرستان میں قبروں کے اندر نیک وبدمرحوم ہوتے اور ہم چڑیلوں کی محفلیں جمتیں۔

"رزق مقدر"

حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وحی بھیجی ہے کہ کوئی شخص نہیں مرتا جب تک کہ وہ اپنا مقدر رزق پورا نہیں کرلیتا۔اگر چہ دیر سے اس کو پہنچے۔پس جب یہ بات ہے تو تم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور روزی تلاش کرنے میں حد اعتدال سے تجاوز مت کرو اور تاخیر رزق کی صورت میں گناہوں کے ساتھ رزق طلب نہ کرنے لگنا اور جو رزق حلال اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے (بزار)

(ایس حبیب خان۔کراچی)

ہم میں سے بھی کچھ نیک فطرت، رحم دل، قابل احترام، اور کچھ بدفطرت، بدحرام، تیز طرار کام چور اور انسانیت دشمن تھیں۔

ان کا غرور بھی، زندہ مغرور دولت میں کھیلنے والے لوگوں کی طرح سر چڑھا تھا۔ اپنے پیاروں کے درمیان ہم زندہ چڑیلوں کی زندگی ان دنیادار دوزخ نما پیٹ اور شیطان کی آنت کی طرح طویل خواہشات کے مالک حریص دنیاداروں کو کھٹکنے لگی۔

دولت کی سیاہ کاری سے مقدر کو کالا کرنے کے لئے کچھ لوگوں نے الٹے سیدھے عمل چلے اور تعویز گنڈوں کی مدد سے تیز طرار بدکردار چڑیلوں کو قبضے میں کر کے ناجائز کام کروانے کا دھندہ شروع کردیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کم وبیش نوسو سال تک زندگی گزارنے والے اللہ کے خاص بندے آخرکار موت کی وادی میں مقید ہوگئے اسی طرح ہر زندہ زندگی کا اختتام موت ہے، کسی بھی شخص کو جتنا عروج ہو آخرکار زندگی کے کنارے سے موت کے گڑھے میں چھلانگ لگاتا ہے۔

نیک کام کا صلہ اگرچہ دیر سے ملتا ہے مگر نیکی اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے اپنی دائمی چمک سے ہرآنے والا سیاہ راستہ روشن کردیتی ہے اور برائی کا انجام برا ہے۔
کیونکہ گندم بونے سے بھی چنے نہیں اگتے۔

چڑیلوں کو اپنے قابو میں لانا اتنا بھی آسان نہیں، لیکن کچھ لوگ ضد اور انا کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔

اکثر کہتے سنا گیا ہے کہ ''ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔''

اگر فرہاد دودھ کی نہریں کھود سکتا ہے تو چڑیلوں کو قبضے میں لانا کون سا مشکل کام ہے۔

جس طرح ایک پرہیزگار شخص وقتی طور پر آزمائش کے شکنجے میں جکڑا جاتا ہے، مگر اس کی سچائی پرہیزگاری اور ایمان کی مضبوطی پر مشکل گھڑی کے سامنے دیوار چین کی طرح سینہ سپر ہوتی ہے۔

مشکلات کی گھڑیاں دھوئیں کے بادل کی طرح مٹ کر ختم ہوجاتی ہیں۔ مگر شیطان انسان کا ازلی دشمن ہمیشہ مصائب کے اندھے کنوئیں میں دھکیلنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے جو انسان اس کو اپنا رہنما مان لیتا ہے شیطان خوب چن چن کر اس سے بدلے لیتا ہے چڑیلیں سبھی ایک جیسی نہیں ہوتیں دودھ کی طرح صاف کردار کی مالک چٹانوں کی طرح مضبوط حوصلوں اور ارادوں کی مالک چڑیلوں کو لاکھ چلے کشی، تعویز آدھی رات کے وقت ایک پاؤں پر کھڑے ہوکر بیچ دریا میں مخصوص کلمات پڑھے جائیں دم، مراقبے جو مرضی پاپڑ بیلے جائیں قابو میں نہیں لایا جاسکتا۔

مگر بدکردار چڑیلوں کو فطرت کے خلاف کام اور گندی جگہوں پر گندے عمل کرکے قابو میں لایا جاسکتا ہے۔

ایسے بدکردار شخص کی شکل پر منحوسیت برستی ہے، رب کی پھٹکار سے چہرہ بے نور ہوتا ہے شیطان کا پیروکار اور قریبی ساتھی بن جاتا ہے۔

جس طرح شیطان روز ازل سے ملعون ہے اسی طرح ایسا مکروہ کردار کا مالک شخص بھی ہمیشہ ملعون سمجھا جاتا ہے سوائے روپے کی زیادتی کے باقی تمام دنیاوی ذہنی اور روحانی آسائشات اور سکون کو اس سے چھین لیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے تو وہ بے اولاد ہوتا ہے، شکل قابل نفرت ہوتی ہے پاس بیٹھنے والے کو اس سے گھن اور بدبو آتی ہے۔

یہ شخص انتہائی سفاک، پتھر دل اور ظالم ہوتا ہے، رحم دلی کے معنی بھی نہیں جانتا انتہائی حریص، خودغرض اور مفاد پرست ہوتا ہے۔

روپے پیسے کا پجاری ہوتا ہے، اس کا دین، ایمان اور زندگی کا مقصد صرف پیسہ ہوتا ہے ایسا شخص جب مرتا ہے تو اس کی شکل بگڑ جاتی ہے۔

جیسے مردار کا گوشت گدھ کھاتے ہیں ایسے ہی اس کا مال کھانے والے گدھوں کی طرح جھنڈوں کی شکل میں مال پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

جس مال کو وہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل کر اکٹھا کرتا ہے، موت کے بعد پانی کے بلبلوں کی طرح لمحوں میں ختم ہوجاتا ہے۔

جو چڑیلیں ایسے بدقماش لوگوں کے قبضے میں آجاتی ہیں وہ انسان کی طرح ظالم، بدطینت، بدکردار، پتھردل اور لالچی نہیں ہوتیں کہ بلاوجہ انسانوں کو تنگ کریں ان کا جانی اور مالی نقصان کریں۔

ہم چڑیلیں کون ہوتی ہیں انسانوں کو ان کی خطاؤں کی سزا دینے والی، ہم نے اس زمین پر کبھی بھی فرعون یا اس کے پیروکاروں کی طرح خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔

تمام مخلوقات کی طرح ہم چڑیلیں بھی امتحان کے لئے اس دنیا میں ہیں اور زندگی کی ہر سانس، فعل اور عمل کی جواب دہ ہیں۔

انسانوں کی طرح نیک عمل کو آنے والی کل تک کبھی بھی ملتوی نہیں کیا۔ ہماری خواہش ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ مالک وخالق کی یاد سے خالی ہو کر نہ گزرے ہماری بھی کوشش ہوتی ہے کہ اوپر والا ہم سے راضی ہوجائے کیونکہ اگر اوپر والا راضی ہوگیا تو ہم اس دنیا میں بھی کامیاب ہوجائیں گی اور جب اس کے حضور پیش ہوں گی تو بھی شرمندگی نہیں ہوگی اور ویسے بھی ہم انسانوں کی طرح دلیر نہیں کہ موت کے بعد دیکھا جائے گا زندگی سے صرف مزے اڑاؤ حرام حلال کو پس پشت ڈال دو۔

ہمیں قابو کرنا اتنا بھی آسان نہیں، یہ جتنے بھی جن بابا، پری بابا، تعویز گنڈے والے بابا ہیں ہمارے بارے میں سراسر جھوٹ بولتے ہیں ہم اتنی بھی کمزور نہیں کہ ان جیسے فراڈیوں کے تابع ہوں اور ان کے حکم پر انسانوں کی جان اور مال کو نقصان پہنچائیں۔

ایسے بابا سراسر جھوٹے، دغا باز ار اور بے ایمان ہیں اور یہ جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم ان کے ناجائز کام سرانجام دیتی ہیں۔

ٹی وی، اخبارات اور رسالوں میں جو لمبے چوڑے اشتہارات دیئے جاتے ہیں ان کا حقیقت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ سالوں اور مہینوں کا کام، ہفتوں، دنوں اور گھنٹوں میں کرنے کا دعویٰ سراسر جھوٹ پر مبنی ہے ایسا نہیں ہے لیکن اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے تو جو چڑیل ایک پلید کام کرنے والے شخص کے قابو میں پلیدگی کی حالت میں چلے کشی کے بدلے قابو میں آجاتی ہے تو جو چڑیل ایسے مکروہ بے دین شخص سے جان نہیں چھڑا سکتی وہ دو نامحرم لڑکے اور لڑکی کے درمیان پیار کی پینگیں کیسے بڑھا سکتی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ اولاد نہ دے اس کو ایک چڑیل اولاد کیسے دے سکتی ہے ایسا ممکن نہیں بلکہ یہ طاقت صرف اور صرف اوپر والے مالک کے پاس ہے۔

جن میاں بیوی کا آپس میں جائز طریقے کے مطابق نکاح ہوا ہے وہ لوگ اس رشتے کو نبھانا نہیں چاہتے تو ایک چڑیل کیسے ان کے درمیان پیار و محبت اور حقوق وفرائض کی ادائیگی کا جذبہ پیدا کرسکتی ہے۔

یہ رٹے رٹائے جملے ہیں دشمن قابو میں، من پسند جگہ شادی، اولاد کا نہ ہونا، لاٹری ٹکٹ اور پرائز بانڈ کا پہلا انعام لگنا۔

پڑھے لکھے اور ان پڑھ لالچی لوگ ایسے جھانسے میں آجاتے ہیں۔ انسانوں میں ایک عجیب خواہش پائی جاتی ہے کہ بیٹھے بیٹھائے بغیر حرکت کیے اللہ تعالیٰ کے حکم کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرنے کی بجائے روپے پیسے کے بل بوتے پر جائز ناجائز خواہشات کی تسکین چاہتے ہیں پانچ وقت نماز پڑھنے اللہ تعالیٰ کے حضور جھکنے اس کی اطاعت وبندگی کرنے کی بجائے اس کے احکامات کی صریحاً خلاف ورزی کرنے کے لئے کالے پیلے جادو کرنے والے چڑیلوں کو تابع رکھنے کا دعویٰ کرنے والے بابوں، پریوں کو نگی کا ناچ نچانے کا ڈھونگ رچانے والے جعلی عاملوں کے آستانوں پر حاضری دینا فخر محسوس کرتے ہیں اور روپے پیسے کے عوض فطرت تبدیل کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔

جبکہ ایسا قطعاً ممکن نہیں، جو بھی ہوتا ہے اللہ

تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے پوری کائنات میں بکھرے ادنیٰ سے لے کر انسان، حیوان، دریا، سمندر، دیوہیکل پہاڑ تک اس کے حکم کے پابند ہیں۔

جو اللہ تعالیٰ ایک قطرے سے چھ فٹ کا انسان تخلیق کرسکتا ہے شیر جیسے طاقتور اور ہاتھی جیسے دیوہیکل جانور کو پیدا کرسکتا ہے چیونٹی سے لے کر زراف تک کو تخلیق کرسکتا ہے بنجر زمین سے جاندار فصل، بے جان انڈے سے جاندار چوزہ پیدا کرسکتا ہے۔

جس نے کروڑ ہا سال قبل زمین کی تخلیق کے وقت قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے ان کے استعمال کی اشیاء سونا، چاندی، لوہا، تانبا، کرومائیٹ، یورینیم، دھاتیں، گیس، آئل، کوئلے کے ذخیرے زمین کے نیچے چھپادیئے اور ان کے تحفظ کے لئے اوپر پہاڑوں کو گاڑ دیا۔

قیام تک انسان ان اشیاء کو استعمال کرکے تھک جائے گا مگر ان کی مقدار میں ریت کے ذرے کے برابر بھی کمی نہیں ہوگی۔

جس مالک نے بغیر ستونوں کے صدیوں سے نیلگوں آسمان کو کھڑا کر رکھا ہے زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کو پانی کی سطح کے اوپر چمٹا رکھا ہے۔

اس مالک کائنات کو بیٹا دینا مشکل ہے، میاں بیوی کے درمیان پیار کا جذبہ پیدا کرنا آسان نہیں، رشتوں ناطوں کو طے کروانے اور ارب ہا مخلوق کو روزی دینے کے لئے کسی سے مشورہ کرنے کا پابند ہے۔

نہیں نہیں ہرگز نہیں۔

ہم چڑیلیں، آسیب اور جنات بلاوجہ بدنام ہورہے ہیں۔

محترم بزرگو! ہم دست بستہ عرض گزار ہیں کہ انسان ہی انسان کا دشمن بنا ہے انسان ہی انسان کو دھوکہ دے رہا ہے اس سے فراڈ کررہا ہے جھوٹ بول کر ریت کے محلات تعمیر کرکے روپے اینٹھ رہا ہے پیار، محبت، عشق، معشوقی، روزی، اولاد، من چاہی خواہش کی تسکین کے جھوٹے وعدے تسلیاں دے رہا ہے۔

ایسی کسی بھی حقیقت، واقعہ کارنامہ عجوبے، کرامت اور پراسراریت سے ہمارا دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔

یہ سب ہم پر الزام تراشی اور بہتان ہے ان جھوٹی کہانیوں کی وجہ سے انسان ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے ہیں۔

حمیدہ سراسر جھوٹ بول رہی ہے، ایسے کسی بھی واقعہ، کارروائی یا واردات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

گائے کی ہلاکت میں ہمارا ذرہ برابر کردار نہیں، جس نے اسے ہلاک کیا ہے اس کو تلاش کرو۔

جھوٹی کہانی سنا کر ہماری کردار کشی کی گئی ہے، گائے کی ہلاکت کے بارے میں حمیدہ اور اس کے چاہنے والے بابا بہتر جانتے ہیں انسانوں کے مسائل انسان جانیں ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے پر بزرگ نے چڑیل کا شکریہ ادا کیا جبکہ ان حقائق کو سنتے ہی حمیدہ شرم سے زمین میں دھنسنے لگی۔ جھوٹ کا پردہ چاک ہونے پر پوری پنچائیت نے لعن طعن کی اس کی اور گھر والوں کی سخت سرزنش کی۔

تعویز گنڈوں کی مدد سے گائے کے قاتل کو تلاش کرنے کا یہ طریقہ ایک سازش اور مخالفین کو بلاوجہ بغیر جرم کے پھنسانے کا منصوبہ قرار دیا۔

حمیدہ کو وارننگ دی گئی کہ جب تک ٹھوس ثبوت نہ ہو کسی پر بہتان، الزام لگا کر تنگ نہ کیا جائے۔

اگر آئندہ مخالفین کو پھنسانے کی بھونڈی حرکت کی گئی تو اس پورے خاندان کو گاؤں بدر کردیا جائے گا۔

حمیدہ اور گھر والے سخت ہراساں اور پریشان تھے پنچائیت اور مجیب سے معافی مانگی اور شرمندہ، شرمسار چہروں کے ساتھ گھر چلے گئے اور ایک لمبے عرصے تک لوگوں سے منہ چھپا کر جھوٹ کی منہ پر لگی کالک کو مٹانے کی کوششیں کرتے رہے۔



شہر خموشاں

نسرین رانا۔کراچی

رات کا ہولناک اندھیرا قبرستان کی ویرانی ہر سو دہشت پھیلا رہی تھی کہ اتنے میں ایک خوفناک شکل انسان نظر آیا جو کہ اپنا ہی ایک ہاتھ چبا چبا کر مزے سے کھا رہا تھا کہ......

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے جنم لینے والی وحشت ناک کہانی

اچانک ہی ان کی کار جو کہ اسپیڈ سے جارہی تھی رک گئی۔

''یہ کار کو کیا ہوا۔'' توحید نے پریشانی سے کہا۔

''میں خوب سمجھتی ہوں اس میں تمہاری کوئی سازش ہوگی۔'' صبا نے شک بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا۔'' توحید معنی خیز نگاہوں سے بولا۔

''مطلب یہ ہے توحید صاحب جسے میں خوب جانتی ہوں۔''

''کیا جانتی ہو کیا کہے جارہی ہو۔'' توحید جھنجھلاتے ہوئے بولا۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔'' صبا غصے سے بولی۔

''تو اور کیا کررہا ہوں اتنی دیر سے۔''

توحید برابر گاڑی اسٹارٹ کرنے کی سعی کررہا تھا۔

"یہ ناٹک چھوڑو اور گاڑی اسٹارٹ کرو۔ سیدھی طرح سے۔" صبا ناگواری سے بولی۔

"کیسا ناٹک۔" توحید حیرت سے بولا۔

"کیسا ناٹک جیسے کچھ جانتے ہی نہیں کتنے بھولے بن رہے ہو مسٹر توحید میں خوب سمجھ رہی ہوں تمہارے اس ناٹک کا مطلب مجھے سب معلوم ہے کوئی گاڑی واڑی خراب نہیں ہوئی ہے یہ سب تم جان بوجھ کر کررہے ہو تاکہ مجھ سے بات کرسکو اور......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

پھر بولی۔"فوراً گاڑی اسٹارٹ کرو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے میں بھلا ایسا کیوں کروں گا۔" توحید بولا۔

"تمہیں نہیں معلوم کیا۔" صبا اسے دیکھتے ہوئے طنزیہ ہنسی کے ساتھ گویا ہوئی۔

"تم نے مجھے اتنا گھٹیا سمجھا ہے کہ میں تمہارے رشتے سے انکار کے بعد ایسا کچھ کروں گا۔" توحید غصے سے بولا۔

"میں کچھ نہیں جانتی بس فوراً گاڑی اسٹارٹ کرو۔" وہ چہرے کو دوسری طرف کرتے ہوئے بولی۔

"گاڑی حقیقت میں خراب ہوئی ہے تم یقین کرو۔" وہ کار سے اترتے ہوئے لاپروائی سے بولا۔

اور پھر وہ کافی دیر تک کار ٹھیک کرنے کی اپنی سی سعی کرتا رہا۔

اچانک ہی بہت زور سے تیز ہوائیں چلنے لگیں۔

واقعی ہوا بہت تیز ہوگئی تھی درختوں کے پتے تیزی سے ہلنے لگے کار کے اندر بیٹھی صبا چاروں طرف دیکھتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔

توحید جو کار کے اسٹارٹ نہ ہونے کی وجہ سے صبا کے سوال سے اور اب اس تیز ہواؤں سے پریشان ہوگیا تھا۔ وہ جھنجھلا کر کار میں واپس آکر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا......؟" صبا پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

"کچھ نہیں گاڑی اسٹارٹ نہیں ہورہی ہے نامعلوم کیا ہوگیا ہے۔"

"تو معلوم کرونا۔"

"کیسے معلوم کروں اپنی سی کوشش کرتو لی سمجھ نہیں آرہا ہے کیا ہوا ہے۔"

"اب کیا ہوگا۔"

"کوئی نظر بھی تو نہیں آرہا ہے جس سے ہیلپ لیں، یہاں تو دور دور تک نہ کوئی گھر ہے نہ کوئی انسان، عجیب سی جگہ ہے۔" وہ پریشان ہوتے ہوئے چاروں طرف نظر ڈالنے لگا شاید کوئی مل جائے۔

اچانک کار کی کھڑکی کے پاس ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا اس کا عجیب وغریب لباس تھا پھر وہ کھڑکی میں جھانکتے ہوئے گویا ہوا۔

"سفری ہو بیٹا۔"

"جی بابا ہماری گاڑی خراب ہوگئی ہے کیا آپ ہماری کوئی مدد کرسکتے ہیں۔"

"بیٹا گاڑی ٹھیک کرنی مجھے کہاں آتی ہے اور نہ یہاں کوئی گھر نہ گیراج وغیرہ ہے۔ تم ایسا کرو اس قبرستان کو پار کرکے دوسری جانب چلے جاؤ وہاں آبادی ہے گیراج بھی ہے کسی کو لے آؤ وہاں سے گاڑی ٹھیک کروانے کے لئے، یہاں مت رکو کیونکہ یہ جگہ آسیب زدہ ہے۔"

قبرستان کو پار کرنے کے خیال سے صبا نے ڈرتے ہوئے توحید کا ہاتھ پکڑلیا، جانے کیوں اس بوڑھے سے اسے ڈر لگ رہا تھا۔

بوڑھا کافی پراسرار سا لگ رہا تھا صبا کو بوڑھے سے اور اتنی رات میں قبرستان میں جانے سے ڈر لگ رہا تھا توحید اسے حیرت سے دیکھنے لگا یہی لڑکی تھی جب توحید نے اسے اپنے دل کی بات کہنے کے لئے اس کا نازک ہاتھ پکڑا تھا تو اس نے کتنی بے دردی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا اور آج نہ صرف اس کا ہاتھ پکڑا تھا بلکہ اس کے سینے سے لگ گئی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹے جلدی کرو رات گہری ہو رہی ہے۔" بوڑھے نے دونوں کو غور سے دیکھ کر کہا۔

"اتنی رات میں قبرستان سے پار جانا ٹھیک رہے گا۔"

"کیا کوئی اور حل نہیں۔" توحید نے بوڑھے سے پوچھا۔

"نہیں......" بوڑھے نے سخت لہجے میں کہا۔

"وہاں جانا ہی پڑے گا کیونکہ وہاں آبادی ہے۔"

توحید نے صبا کے نازک ہاتھ پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میں ہوں نا تمہارے ساتھ چلو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے کار سے باہر آ گیا۔

قبرستان سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ وہ بوڑھا بھی ان دونوں کے ساتھ ہو لیا۔

صبا نے توحید کا ہاتھ نہیں چھوڑا تھا، ایک ہاتھ میں بیگ دوسرے ہاتھ سے توحید کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"بابا اتنی دیر سے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ کوئی مل جائے مدد کے لئے مگر کوئی نظر نہیں آیا اور پھر آپ اچانک ہی نظر آ گئے۔" توحید نے سوال کیا۔

مگر یہ کیا بوڑھا غائب تھا۔ "بابا کہاں گئے؟" توحید بولا۔

"مجھے تو وہ کوئی بھوت لگتا ہے جو اچانک ہی غائب ہو گیا۔" صبا بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔

"ہمیں قبرستان میں نہیں جانا چاہئے، دیکھو وہ بوڑھا غائب ہو گیا ہے۔"

"اس کے غائب ہونے سے میں بھی پریشان ہوں مگر جائیں تو کہاں جائیں قبرستان کی دوسری طرف آبادی ہے اس لئے وہاں جانا ضروری ہے۔"

توحید بولتے ہوئے قبرستان میں صبا کا ہاتھ تھامے ہوئے داخل ہو گیا۔

دونوں کے داخل ہوتے ہی تیز ہوائیں چلنے لگیں تو توحید نے صبا کے ہاتھ پر اپنی گرفت مزید سخت کر دی اور آگے بڑھنے لگا۔

توحید جلد از جلد اس شہر خاموشاں سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ صبا بہت ڈر رہی تھی۔ اور رات بھی آگے بڑھ رہی تھی۔

وہ بہت تیزی سے چل رہے تھے کہ کسی چیز سے ٹکرا گئے صبا گرنے کو تھی کہ توحید نے صبا کی کمر کے گرد اپنے ہاتھ ڈال کر سنبھال لیا ساتھ اس نے نیچے دیکھا تو زمین پر ایک انسانی کھوپڑی پڑی تھی، ان دونوں کے پاؤں سے یہی کھوپڑی ٹکرائی تھی۔

صبا ڈر کر توحید سے لپٹ گئی۔

توحید نے اپنے پاؤں سے کھوپڑی کو ایک طرف کرنا چاہی تھی کہ اچانک انسانی کھوپڑی نے آنکھیں کھول دیں۔ کھوپڑی کی دونوں آنکھیں اب روشن ہو چکی تھیں۔ توحید نے صبا کا ہاتھ پکڑے اس جگہ سے آگے بڑھ گیا۔

وہ تو اچھا تھا کہ صبا نے اس کھوپڑی کی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں ورنہ تو وہیں بے ہوش ہو جاتی۔

توحید اور صبا دونوں ہی قرآنی آیات پڑھ رہے تھے اور ڈر جو کہ ان دونوں کو اپنے شکنجے میں جکڑنے کے لئے تلا ہوا تھا۔

کافی چلنے کے بعد بھی قبرستان سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

مزید کچھ دور چلنے کے بعد دونوں کے قدم ایک آدمی کو دیکھ کر رک گئے۔

وہ آدمی تھوڑی دور ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا اور کوئی لمبی سی چیز ایک ہاتھ میں دبائے کھڑا تھا رات بڑھ جانے سے اندھیرا کافی ہو گیا تھا ایک تو رات اور چاروں طرف اندھیرا، دوسرے وہ آدمی کالا سیاہ تھا۔ اس آدمی نے عجیب سا لباس پہنا ہوا تھا۔

"چلو اس کے پاس چلتے ہیں۔" توحید بولا۔

"ٹھہرو مجھے تو لگتا ہے یہ کوئی ڈاکو ہے۔" صبا نے اپنا شک ظاہر کیا۔

"اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی رہبر ہو اور ویسے بھی یہاں اور کون ہے جس سے ہم راستہ پوچھیں باہر جانے کا۔" توحید یہ کہتے ہوئے صبا کا ہاتھ پکڑے اس آدمی کی طرف چلنے لگا۔

"سنیے۔" توحید نے اس کے قریب جا کر بولا۔

"باہر جانے کا راستہ بتا سکتے ہیں کیا۔"

وہ آدمی جو گوشت کھانے میں مصروف تھا اس نے اپنا سر اٹھایا تو صبا اور توحید دونوں ہی ڈر گئے، صبا تو توحید سے لپٹ گئی۔

وہ آدمی اپنا ہی ہاتھ کھا رہا تھا اس کا ایک ہاتھ موجود تھا جسم کے ساتھ دوسرا ہاتھ بازو سے الگ تھا اور وہی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں لئے ایسے کھا رہا تھا جیسے بہت ہی من پسند کھانا کھا رہا ہو۔

توحید اور صبا کو دیکھ کر اس آدمی کے چہرے پر ایک عجیب سی چمک آگئی تھی۔ خوف ناک مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا۔

"یہاں آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں۔ اور یہاں جو آتا ہے وہ واپس نہیں جاتا ہے یہ ہمارا شہر خموشاں ہے۔ یہاں ہمارا راج ہے۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

"صبا بھاگو یہاں سے۔" توحید صبا کا ہاتھ پکڑے بھاگنے کو تھا کہ صبا بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ اور توحید کو پتا ہی نہیں چلا وہ کب بے ہوش ہوگئی تھی۔

"ہاہاہا......" اس آدمی کے بھیانک قہقہے سے سارا شہر خموشاں دہل گیا۔

توحید نے فوراً صبا کو اپنے کندھے پر ڈالا اور بھاگنے کو تھا کہ وہ آسیب نما آدمی جھٹ توحید کے سامنے آ گیا۔

"بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھ سے ڈرو مت کیونکہ میں تمہیں اور اس خوب صورت لڑکی کو نہیں کھاؤں گا اگر کھانا ہوتا تو اب تلک تم دونوں میرے پیٹ میں پہنچ گئے ہوتے۔" وہ بھیانک ہنسی کے ساتھ اپنے بڑے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

"مگر مجھے تو بس اپنا ہی گوشت کھانے کی عادت ہے۔" اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا دوسرا ہاتھ اپنے پاؤں پر زور سے مارا اور ہاتھ جسم سے الگ ہو کر گر پڑا تو نیچے سے اپنا ٹوٹا ہوا ہاتھ اٹھا کر کھاتے ہوئے بولا۔

"یہ میری غذا ہے میرا کھانا ہے۔" وہ اپنا ہاتھ بھنبھوڑنے لگا۔

توحید کو کراہیت ہو رہی تھی۔ وہ اس کو بھاگنے بھی نہیں دے رہا تھا اسے اور صبا کو مار بھی نہیں رہا تھا آخر یہ چاہتا کیا ہے میں کب تلک یونہی صبا کو لئے اس خوف ناک آدمی کے آگے کھڑا رہوں گا۔

پھر توحید کو خیال آیا یہ ہمیں کھائے گا بھی نہیں اور کچھ کر بھی نہیں سکتا ہے، اب تو اس کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں، مجھے فوراً یہاں سے نکلنا چاہئے اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت آئے جلدی یہاں سے نکلنا چاہئے۔

توحید نے بھیانک آدمی کو دیکھا جو اپنا ہی پہلا ہاتھ کھا کر اس کی ہڈیاں بھی چبا گیا تھا اور اب دوسرا ہاتھ بڑے مزے سے سر جھکائے کھا رہا تھا۔

اور پھر توحید موقع غنیمت سمجھ کر فوراً وہاں سے صبا کو کندھے پر ڈالے بھاگ کھڑا ہوا۔

صبا کو کندھے پر اٹھائے کافی دور تک بھاگتا رہا پھر ایک گھنا درخت اس کے سامنے آ گیا تو توحید نے صبا کو نیچے گھاس پر لٹا دیا اور صبا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا اور اس وقت توحید کو صبا کے لئے پانی کی اشد ضرورت تھی مگر پانی کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں وہ سوچنے لگا یہاں کا گورکن کہاں چلا گیا ہے سارا شہر خموشاں دیکھ لیا ہے ہوسکتا ہے وہ بھی یہاں سے ڈر کر بھاگ گیا ہو۔

توحید بہت مضطرب ہو رہا تھا رات کافی ہوگئی تھی باہر جانے کا راستہ بھی نہیں مل رہا تھا اور کوئی رہبر بھی نہیں تھا ایک ملا بھی تو بھیانک بلا نما آدمی۔ ہر طرف بڑی عجیب سی خاموشی تھی اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت شور و غل ہو رہا ہے۔

اچانک ہی تیز ہوائیں چلنے لگیں ادھر صبا کو ہوش آ گیا تو توحید نے فوراً صبا کو چلنے کے لئے کہا اور دونوں تیز ہوا کے باوجود راستہ ڈھونڈنے لگے۔

ہوا کچھ اور تیز ہوئی تو صبا کا دوپٹہ اڑا اور ایک درخت پر جا کر لٹک گیا سردی بھی بڑھ گئی تھی توحید نے اپنا کوٹ اتار کر اسے دیا اور خود دوپٹہ اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

''رہنے دیجیے ......'' صبا نے توحید کو دوپٹہ اتارنے کی کوشش کرتے دیکھا تو کہا۔

''ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا چاہئے۔''

ہوا بہت تیز چل رہی تھی دوپٹہ درخت کی شاخ پر لہرا رہا تھا تھوڑی اور کوشش کر کے آخر توحید نے دوپٹے کے پلو کو پکڑ ہی لیا۔

''یہ لیں محترمہ صاحبہ۔''

صبا نے دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہا۔'' اتنی دیر ہو گئی چلتے چلتے مگر راستہ باہر جانے کا نہیں مل رہا ہے۔''

''ہمیں واپس جانا چاہئے جہاں ہماری گاڑی ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو پہلے یہ سامنے جھونپڑی نظر آ رہی ہے یہاں دیکھ لیتے ہیں شاید یہ گورکن کا گھر ہے اگر وہ مل جاتا ہے اور ہماری مدد کرتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ واپس چلتے ہیں۔''

ہوا کافی تیز چل رہی تھی اچانک کسی شور کی آواز سنائی دی تو دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو عجیب سا منظر دکھائی دیا۔

ساری قبریں زور زور سے ہلنے لگی تھیں درخت ایسے ہلنے لگے جیسے چھوٹا سا پودا تیز ہوا سے ہلتا ہے پورے قبرستان میں قبروں کی ہلنے کی آوازیں گونجنے سے ایک ہنگامہ سا ہو رہا تھا آہستہ آہستہ آوازیں تیز ہوتی گئیں اور پھر ساری قبریں چٹخنے لگیں۔

تڑ تڑ تڑ آوازیں ایسی آنے لگیں جیسے کوئی پتھر مار رہا ہو۔ آوازیں اور بلند ہونے لگیں اور قبریں بہت تیزی سے ہلنے لگیں توحید حیرت اور خوف سے یہ سب

> ## اثر
>
> ''یہ آج پارک میں اتنا کوڑا کیوں پھیلا ہوا ہے اس سے پہلے میں نے کبھی پارک میں اتنے کاغذ بکھرے ہوئے نہیں دیکھے۔''
>
> ''کل پارک میں آنے والوں میں پمفلٹ تقسیم کئے گئے تھے جن میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ کوڑا کرکٹ پارک میں ادھر ادھر نہ دیکھیں۔ یہ سب وہی پمفلٹ ہیں۔''
>
> (اُفشیں ستار۔ کھڈرو ضلع سانگھڑ سے)

دیکھتے ہوئے صبا سے مخاطب ہوا۔

''صبا اپنا دوپٹہ کس کے باندھ لو اور قرآنی آیات کا ورد شروع کر دو اور یہاں سے بھاگو۔''

صبا کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا۔

پھر توحید صبا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے جھونپڑی کی طرف تیزی سے بھاگا۔

پھر اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا تو دونوں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک اور منظر ان کی نظروں کے سامنے تھا۔

صبا بے ہوش ہو کر گر پڑی تو توحید دم بخود ہو کر اسے دیکھنے لگا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

ساری قبریں پھٹ گئی تھیں اور مردے اپنی اپنی قبروں میں کھڑے تھے۔

اب تو توحید بھی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا اب اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ صبا کا ساتھ اور اب مردوں کا نظر آنا دل دہلا رہا تھا توحید نے قرآنی آیتوں کا پڑھنا بند نہیں کیا اور بلند آواز سے پڑھنے لگا اور اللہ سے مدد مانگنے لگا تھا۔ صبا کو اٹھا کر اس نے اپنے کندھے پر ڈالا، اتنی سردی کے باوجود وہ پسینے میں شرابور تھا۔

سارے مردے اپنی اپنی جگہ سے سیدھے

کھڑے تھے ان کی کوئی آواز تھی نہ ان میں کوئی حرکت تھی۔

توحید جھونپڑی کی طرف دوڑتا چلا گیا اور چند لمحوں میں وہ جھونپڑی کے اندر موجود تھا اس نے جھونپڑی کے باہر نہ دستک دی اور نہ آواز پریشانی اور خوف کے عالم میں وہ عجلت میں جھونپڑی کے اندر گھس گیا تھا۔

اندر جاکر اس نے سانس لی اور چاروں طرف دیکھا۔

''اوہ......تم۔'' وہ حیرت سے بولا۔

وہی گوشت خور آدمی اپنی ٹانگ کھار ہاتھا اسے دیکھتے ہی عجیب سی ہنسی ہنسنے لگا۔

آ گئے تم! مجھے معلوم تھا تم یہاں ضرور آؤ گے اور جاؤ گے بھی کہاں اس شہر خموشاں سے بچ کر۔ یہاں آنے کا راستہ ہے جانے کا نہیں، یہاں ہمارا راج ہے۔'' وہ زوردار قہقہے کے ساتھ بولا۔

توحید پریشانی اور خوف سے کبھی جھونپڑی کے باہر کے منظر کی فکر کرتا تو کبھی اندر کا۔ اس گوشت خور نما انسان جو بظاہر انسان نما تھا مگر حرکتیں درندوں جیسی تھیں گویا ہوا۔

''کھڑے کیوں ہو بیٹھ جاؤ بھوک لگی ہے کیا تمہیں، لو کھانا کھاؤ۔'' اس نے اپنی چبائی ہوئی ٹانگ توحید کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

توحید نے جھرجھری سی لی اور دوسری طرف منہ پھیر لیا کیونکہ اگر وہ اسے بغور دیکھتا تو اسے الٹی ہوجاتی۔ پھر اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ ''ہاں تم یہ کھانا نہیں کھاؤ گے کیونکہ تم تو انسان ہو۔''

توحید نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور پلنگ پر صبا کو لٹا کر خود اس جگہ بیٹھ گیا...... قبرستان میں بھاگتے بھاگتے وہ بری طرح تھک گیا تھا اس نے دوبارہ منہ ہی منہ میں آہستہ آہستہ تلاوت شروع کردی تھی۔

گوشت خور آدمی ہنستے ہوئے بولا۔ ''مجھ سے ڈر کر یہ پڑھ رہے ہو نا مگر ڈرو نہیں میں تمہیں اور تمہاری محبوبہ کو کچھ نہیں کہوں گا اور نہ تمہیں کھاؤں گا کیونکہ میں تو صرف اپنا ہی گوشت کھاتا ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

توحید کا ڈر اس سے اب کچھ کم ہو گیا تھا مگر باہر کے منظر سے وہ ابھی تک خوف زدہ تھا صبا کو لے کر وہ باہر کیسے بھاگے چاروں طرف مردے ہی مردے تھے۔

پھر اس نے ڈرتے ہوئے اس گوشت خور آدمی سے پوچھا۔

''باہر سارے مردے اپنی اپنی قبروں سے نکل کر کھڑے ہوگئے ہیں...... ایسا کیوں؟''

''اس شہر خموشاں کا معمول ہے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''کیا مطلب یہاں یہ روز ہوتا ہے مگر کیوں......؟''

''وہ اس لئے کہ اس شہر خموشاں پر ہم سب کا قبضہ ہے یہاں تو اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔'' وہ خوف ناک مسکراہٹ کے ساتھ بولتے ہوئے اپنی ٹانگ کی ہڈی چبانے لگا۔

توحید کو پیاس لگ رہی تھی اور صبا کو ہوش میں لانے کے لئے پانی کی ضرورت تھی، سامنے ایک مٹی کا مٹکا رکھا تھا۔

''میں پانی پی سکتا ہوں۔'' توحید نے پوچھا۔

''شوق سے جتنا پینا ہے پیئو۔'' وہ بولا۔

توحید نے مٹکے پر رکھے مٹی کے پیالے کو اٹھایا اور مٹکے سے پانی نکالنے لگا مگر پھر اس نے گھبرا کر مٹی کے پیالے کو چھوڑ دیا پیالہ زمین پر گر پڑا۔

''یہ...... یہ کیا ہے......؟'' اس نے خوف سے نیچے گرے خون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پانی کی جگہ خون۔''

''ہاہاہا......'' پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ ہمارا پانی ہے یہاں جو تازہ مردہ آتا ہے اس کا میں خون نکال لیتا ہوں اور اس مٹکے میں رکھ

لیتا ہوں۔"

اور کوئی مردہ نہیں آتا ہے تب کیا کرتے ہو۔"

توحید کو اپنی صبا کی فکر ہوئی۔

"تو پیاسا رہتا ہوں.....'' اس گوشت خور نے جواب دیا۔

پھر توحید بولا۔"محترم کیا آپ ہمارے لئے کچھ کر سکتے ہیں، میرا مطلب ہے ہمیں اس خوف ناک قبرستان سے باہر نکال سکتے ہیں؟"

"نہیں سا شہر خموشاں سے کوئی باہر نہیں جاسکتا ہے۔" اس نے دوسری ٹانگ زمین پر کس کر ماری تو وہ ٹوٹ کر گر پڑی۔ اب سر اور دھڑ رہ گیا تھا پھر وہ دوسری ٹانگ کو بھی بھنبھوڑنے لگا۔

وہ درندہ کھانے میں مصروف تھا اور توحید اسے دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگ رہا تھا۔

"پروردگار اس مشکل وقت میں ہماری مدد فرما نجانے ہمارے گھر والے ہمارے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ رشتہ سے انکار کے بعد صبا کے گھر والے یہ نہ سمجھیں کہ صبا کے انکار کرنے پر میں نے صبا کو اغوا کروالیا ہے یا بھگا کر لے گیا ہوں۔"

ایک بار پھر توحید اچنبھے میں پڑ گیا، کیونکہ اس گوشت خور آدمی کے اب دونوں نئے ہاتھ نظر آنے لگے تھے اور ساتھ ہی دونوں ٹانگیں بھی ثابت نظر آ رہی تھیں۔

توحید حیرت اور خوف سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیوں پڑ گئے ناں حیرت میں۔" وہ ہنستے ہوئے مٹکے کی جانب بڑھا اور مٹکے سے خون نکال کر پینے لگا کہ اچانک توحید کے ذہن میں ایک عجیب سا خیال آیا پھر توحید گویا ہوا۔

"آپ تو بہت کچھ کر سکتے ہیں واقعی اس خوف ناک شہر خموشاں پر آپ کا قبضہ ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ بولا۔

"ہمارے لئے بھی کچھ کریں ہمیں کسی طرح یہاں سے نکال باہر کریں شہر خموشاں سے جہاں ہماری گاڑی کھڑی ہے۔" توحید کے لہجے میں التجا تھی۔

"نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا۔" اس نے صاف انکار کیا تو توحید اس کی خوشامد کرتے ہوئے پھر بولا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی آپ کو آپ کے گوشت کی قسم اس نئے نکلے دونوں ہاتھ پاؤں کی قسم۔"

"اوہو یہ کیا کہہ دیا تم نے زندگی میں سب سے زیادہ جو چیز اہم ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے جس کے بغیر میں رہ نہیں سکتا اور تم نے اسکی قسم دے دی جو میری غذا ہے میرا پسندیدہ کھانا ہے میرا اپنا گوشت اپنا کھانا میرے گوشت کی قسم دے دی اب تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔"

"اب ان کے لئے غذا کہاں سے لاؤں۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"غذا مگر آپ تو اپنا گوشت کھاتے ہیں ناں۔" توحید اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

وہ ہنستے ہوئے بولا۔"بے وقوف انسان میں اپنا گوشت کھاتا ہوں مگر میرے ساتھی تو دوسروں کا گوشت کھاتے ہیں۔" بھیانک آدمی توحید کو اور پلنگ پر لیٹی بے ہوش صبا کو دیکھتے ہوئے بولا۔

توحید اس کی باتوں سے مزید ڈر گیا۔"یا اللہ مجھ پر اور صبا پر رحم فرما۔"

پھر توحید گویا ہوا۔"میں نے آپ کو قسم دی ہے کیا آپ میری دی ہوئی قسم کو توڑ دیں گے۔" توحید کو اپنے صبا کے بچنے کی جو امید نظر آئی تھی وہ ڈوبتی ہوئی نظر آئی تو توحید نے اسے اپنی دی قسم کی یاد دلائی۔

"نہیں بالکل نہیں میں تمہاری دی ہوئی قسم کو نہیں توڑوں گا کیونکہ تم نے مجھے میرے ہی گوشت کی میری غذا کی قسم دی ہے اس لئے تمہاری مدد ضرور کروں گا۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اپنے ساتھیوں کو کیسے بہلاؤں ان سے کیا کہوں انہیں کیا دوں گا۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"خیر جانے دو کوئی اور شکار آ جائے گا۔"

"چلو تمہاری مدد کرتا ہوں۔" وہ ایسے بولا جیسے بہت بڑا احسان کرنے جا رہا ہو۔

اور اگر دیکھا جائے تو وہ حقیقت میں ان دونوں پر احسان ہی کرنے جا رہا تھا، ان کی زندگی بخش کر۔

پھر توحید جھٹ بولا۔ "ذرا ٹھہریں میں صبا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہوں جب تک آپ باہر کے منظر میرا مطلب ہے ان مردوں کو ہمارے راستے سے ہٹا دیں۔" توحید نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"اس کی فکر نہیں کرو، وہ سب اپنی اپنی قبروں میں اب تک جا چکے ہوں گے اور ہٹو تم اس کے سامنے سے۔" گوشت خور نے توحید کو صبا کے سامنے سے ہٹنے کا کہا۔

"کیوں......؟" توحید حیرت سے بولا۔

صبا کو ہوش میں لانے کے لئے اس گوشت خور نے یہ کہتے ہی صبا کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ شاید کچھ پڑھا بھی تھا۔ اور پھر اس نے صبا کے چہرے پر پھونک ماری تو صبا نے آنکھیں کھول دیں۔

سامنے اس گوشت خور کو دیکھ کر خوف سے اٹھ بیٹھی اور جھٹ پلنگ سے اتر کر توحید سے لپٹ گئی تو توحید نے بھی اسے اپنے مضبوط بانہوں کی گرفت میں فوراً لے لیا۔

"اب چلو بھی یا ابھی کچھ اور باقی ہے۔" گوشت خور نے خوف ناک ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں چلئے ہم چلنے کو تیار ہیں۔" توحید نے کہا۔

"میرا ہاتھ پکڑلو اور اپنی آنکھیں بند کرلو۔" اس نے اپنا کالا لمبا بڑے بڑے بالوں سے بھرا ہاتھ توحید کے آگے کیا اور تم لڑکی میرا دوسرا ہاتھ پکڑلو۔"

تو صبا خوف سے توحید کی طرف دیکھتے ہوئے گردن کے اشارے سے نہیں کرنے لگی۔

تو گوشت خور بولا۔ "تم انسان بڑے ہی عجیب ہو ایک بات مان لو تو ساری بات منواتے ہو ارے بابا میں تمہیں کھاؤں گا نہیں۔ ہاتھ پکڑو۔" وہ جھنجلا کر بولا۔

توحید نے فوراً صبا کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "صبا یہ ہمیں ہماری گاڑی تک باہر پہنچا رہے ہیں ان کا ہاتھ پکڑلو۔"

"دیر نہیں کرو جلدی سے ہاتھ پکڑلو ورنہ اس کے سوا کوئی اور چارا نہیں ہے دیکھو انہوں نے ہمیں ابھی تک کچھ نہیں کہا ہے۔" توحید صبا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔

صبا نے ڈرتے ہوئے گوشت خور کے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولی۔

"ہماری گاڑی تو خراب پڑی ہے تو پھر۔" صبا توحید پر نظریں گاڑتے ہوئے بولی۔

"وہ بھی ٹھیک ہو جائے گی اب دونوں آنکھیں بند کرو اور جب تک میں نہیں کہوں آنکھیں مت کھولنا اور نہ ہی بات کرنا۔"

دونوں نے آنکھیں بند کرلیں تو انہیں ہلکا سا جھٹکا لگا اور محسوس ہوا کہ وہ ہوا میں معلق ہوں پھر تھوڑی دیر بعد گوشت کی آواز آئی۔

"آنکھیں کھول دو۔" تو دونوں نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران رہ گئے کیونکہ خوشت گور اور وہ دونوں اب اپنی کار کے پاس کھڑے تھے۔

"اب تم دونوں بے خوف وخطر اپنی گاڑی میں بیٹھ جاؤ اور جتنی جلدی ہو سکے اس علاقے سے باہر نکل جاؤ۔" گوشت خور نے کہا۔

دونوں کار میں بیٹھتے ہوئے گوشت خور کو احسان مند نظروں سے دیکھنے لگے تو گوشت خور نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا اور ہاتھ کا اشارہ کیا کہ اب چلے جاؤ۔

اور اچانک ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گیا۔

توحید نے کار اسٹارٹ کی تو دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

توحید اور صبا دونوں چچازاد کزن تھے۔ توحید

صبا کو پسند کرتا تھا اور جانے کب یہ پسند محبت میں بدل گئی تھی۔

توحید نے اپنا رشتہ بھی بھیجا مگر صبا نے اپنے والدین سے صاف کہہ دیا تھا کہ توحید کو میں پسند نہیں کرتی اور جب پسند نہیں تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ادھر توحید کو اپنا رشتہ ٹھکرائے جانے سے اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوئی اور اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے انسلٹ کا بدلہ ایسے لیا کہ اس نے صبا سے قطع کلامی کرلی۔

اس شام کو توحید کے گھر دعوت تھی تمام رشتہ دار آئے تھے صبا کی فیملی بھی آئی تھی۔

توحید کے والد وحید علی جو صبا کو بہت پسند کرتے تھے ان کی یہ خواہش تھی کہ صبا ان کے گھر کی بہو بنے رشتہ سے انکار کے بعد وہ افسردہ تھے، سب مہمان چلے گئے اور پھر انہوں نے بہت ضد کرکے صبا کو روک لیا تھا اور پھر صبح کے وقت صبا کو اس کے گھر چھوڑنے کے لئے انہوں نے توحید سے کہا تو، توحید نہ چاہتے ہوئے بھی والد کی بات رکھ لی اور پھر صبا کو اس کے گھر چھوڑنے جارہا تھا۔

☆......☆......☆

کار تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی دونوں خاموش تھے، سڑک سنسان تھی اس لئے توحید نے کار کی اسپیڈ بڑھادی تھی اور ویسے بھی وہ جلد از جلد صبا کو اس کے گھر پہنچانا چاہتا تھا۔

کل تک صبا جو توحید کو ناپسند کرتی تھی آج ایسے موقع پر اس کی مدد حاصل کی اس کا ساتھ دینے کی وجہ سے وہ نہ صرف اسے پسند کرنے لگی تھی بلکہ دل کے کونے میں توحید کے لئے پیار پیدا ہوگیا تھا۔

وہ خاموش بیٹھی شہر خموشاں کے ان جان لیوا خوف ناک مناظر کو یاد کرنے لگی تھی بار بار توحید کا ہاتھ پکڑنا اور جب وہ کئی بار بے ہوش ہوئی تو توحید کا اپنے کندھوں پر اسے ڈال کر شہر خموشاں سے باہر نکلنے کی کوشش کرنا۔

لیکن اگر توحید چاہتا تو صبا کو وہیں چھوڑ کر خود اپنی جان بچا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔

کیونکہ توحید اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے اور سچا پیار کرتا ہے اور میں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا، ناپسند کرکے رشتہ سے انکار کیا، شہر خموشاں میں داخل ہونے سے پہلے اس نے توحید کو جو کہا اس سے صبا کافی اذیت کی کیفیت میں ہوگئی تھی۔

گاڑی ہوا سے باتیں کرتے ہوئے چلی جارہی تھی کہ توحید نے ایک نظر سر جھکائے صبا پر ڈالی جو لڑکی اس سے دور رہنا چاہتی تھی آج وہ خود اس کے کتنے قریب آگئی تھی۔ رشتے سے انکار کے بعد خود توحید اس سے دور رہنا چاہتا تھا اسے بھلا دینا چاہتا تھا مگر آج قسمت نے ان دونوں کو بہت قریب کردیا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" توحید نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں......؟"

"کیسے کہوں کہ میں بہت شرمندہ ہوں اپنے سلوک سے کاش آپ کو نہ ٹھکرایا ہوتا۔" وہ دل میں سوچتے ہوئے پژمردہ چہرے سے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو ہے۔" توحید پرسوچ انداز کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"چلو اچھا ہے میرا ہاتھ نہ سہی اس گوشت خور کا ہاتھ تھام لیا۔ یعنی تم نے اسے میرے مقابل لا کھڑا کیا تو یہ ہے تمہاری پسند جس کے لئے تم نے مجھے ٹھکرادیا۔" توحید اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"چلو جو مرضی۔" وہ شرارت سے بولتے ہوئے صبا کے خوب صورت چہرے کو دیکھنے لگا۔

"آپ سمجھ کیا رہے ہیں اپنے آپ کو۔"

"کیوں اس طرح کی باتیں کرکے میرے دل کو مزید دکھ دے رہے ہیں ایک تو میں پہلے ہی آپ کو ٹھکرا کر شرمندہ ہوں اوپر سے آپ مجھے اور پریشان

کرر ہے ہیں۔" دل کی بات صبا کی زبان پر آ ہی گئی وہ شرمندہ نگاہوں سے توحید کو دیکھتے ہوئے بولی۔

توحید نے گاڑی روک دی۔

"کہیں آپ کی باتیں سننے سے ایکسیڈنٹ نہ ہوجائے۔" توحید چہکا۔

"تو تم اقرار کررہی ہو کہ تم نے مجھے ٹھکرا کر غلطی کی ہے۔" اب توحید سیریس ہوگیا تھا۔

"ہاں......" وہ اشک ندامت کے ساتھ ہاں کہہ گئی۔

"تو پھر کیا ارادے ہیں؟" توحید اس کے دل کی بات زبان پر لانے کے لئے مضطرب ہوگیا۔

"اب کیا فائدہ اب تو رشتے سے انکار ہوچکا ہے۔" وہ دل شکستہ سے توحید کو اشکبار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اب میری بات کون سنے گا۔"

"میں ہوں ناں۔" توحید مسکراتے ہوئے بولا۔

"بس تم بتاؤ تم راضی ہونا کہیں پہلے کی طرح انکار تو نہ کردو گی۔"

"نہیں...... نہیں......" وہ لمبی سانس لیتے ہوئے بولی۔

"صبا کو اپنے لئے اتنا مضطرب دیکھ کر توحید کو بہت خوشی ہوئی کیونکہ یہی وہ لڑکی تھی جس کے لئے توحید اسے دیکھنے کے لئے بے چین رہتا تھا اس کے گھر کے چکر لگاتا اگر صبا سے اسے پیار نہ ہوا ہوتا تو اس کے گھر شوق دیدار کو نہ جاتا۔

صبا خاموش بیٹھی نظریں جھکائے افسردہ تھی اس کی آنکھوں سے اشک ندامت اس کے گال بھگو رہے تھے اب اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہورہا تھا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا۔

"اچھا اب یہ آنسو بہانا تو بند کرو۔ ایسے گھر جاؤ گی تو میرے سسرالی کیا کہیں گے۔" توحید شرارت سے بولا۔

"سسرالی...... کون سسرالی......؟" صبا حیرت سے بولی۔

"ارے بھائی تمہارے گھر والے میرے سسرالی تو ہیں۔"

"مطلب تم میرا مطلب...... اب۔" اور صبا نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بھئی ہم تو وہی کریں گے جو مرضی یار ہو۔" توحید ہنستے ہوئے گویا ہوا۔

"میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے اتنا چاہنے والا مل جائے گا اور میرے لئے جان کی بازی لگا دے گا۔"

پھر توحید بولا۔ "ہمیں اس شہر خموشاں کا شکر گزار ہونا چاہئے جس نے ہمیں یک جان دو قالب بنا دیا۔"

پھر توحید کار کی کھڑکی سے باہر سر نکال کر زور سے چیخا۔ "شکریہ شہر خموشاں شکریہ شہر خموشاں۔"

"ارے یہ کیا کررہے ہیں۔" صبا بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک ہنس پڑی تھی۔

"اب چلئے بھی بہت دیر ہوگئی ہے۔ گھر والے کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں کہ آپ نے......" صبا نے مسکراتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور ہاں وہ دوبارہ بولی۔

"ابھی ہم تھوڑی ہی دور آئے ہیں شہر خموشاں سے، کہیں آپ کی آواز وہ گوشت خور نہ سن لے۔"

توحید بھی ہنستے ہوئے۔ "ہاں بھئی اب تو شہر خموشاں سے بہت دور جانا چاہئے کیونکہ اب ہمیں ہماری زندگی مل گئی ہے۔" توحید نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے ہوئے مسکرایا تو صبا نے شرماتے ہوئے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں اور اپنا سر توحید کے بازو پر ٹکا دیا اور توحید کا دماغ باغ باغ ہوگیا اور گاڑی مزید فراٹے بھرنے لگی۔



گمنام اسٹیشن

گلاب خان سولنگی۔ کشمور

رات اپنے پچھلے پہر میں داخل ہوچکی تھی قرب و جوار کی ویرانی دل دہلا رہی تھی ہر طرف خوف مسلط تھا رات کے اندھیرا بھاڑ جیسا منہ کھولے آگے ہی آگے بڑھتا آرہا تھا کہ اچانک......

خوف کے افق پر رواں دواں عجیب وغریب دل گرفتہ دل شکستہ اور دل فریفتہ کہانی

طوفانی ہواؤں کا شور اوپر سے کالے بادلوں نے تو رات کی تاریکی میں مزید اضافہ کردیا تھا۔ شدید ہوا سے اڑنے والی دھول مٹی نے تو اچھا خاصا پریشان کردیا تھا سردی کی شدت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا جبکہ بارش کا امکان کم تھا۔

وہ ریلوے اسٹیشن صدیوں سے ویران پڑا تھا۔ بس اکا دکا ہی کوئی ٹرین وہاں رکتی ہوگی۔ جس کی وجہ سے گاؤں سے دور واقع اس ویران ریلوے اسٹیشن کا بوڑھا چوکیدار اپنی عمر کی طرح سروس کے آخری ایام پورے کررہا تھا جو سرشام ہوتے ہی ریلوے اسٹیشن کے ویران انتظار گاہ میں چارپائی لگا کر شاید ڈیوٹی کررہا تھا یا اس عمر میں گھریلو حالات و معاملات سے دور بھاگ کر ریلوے اسٹیشن کی ویرانی میں زندگی کے آثار لانے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔

پتا نہیں؟ مگر ہمیں فی الحال طوفانی ہواؤں نے پریشان کررکھا تھارات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ ہمیں وہاں دور سے آگ روشن نظر آئی اور تین سائے وہاں اپنے ہاتھ تاپ رہے تھے ہمیں بھی سردی نے آگھیرا تھا وہ تین لوگ تھے اور چوتھا میں بھی ان میں شامل ہوگیا۔

''آؤ پردیسی بابو! بیٹھو آگ تاپو۔'' خشک لکڑیوں کا ایندھن وافر مقدار میں موجود تھا، میں بھی آلتی پالتی مارکر زمین پر بیٹھ گیا اور سب کا سرسری جائزہ لینے لگا دو بوڑھے تھے ایک ادھیڑ عمر اور ایک نوجوان تھا جو بالکل میری طرح دکھائی دے رہا تھا ان سب میں ایک بات یکساں تھی سب ہی ایک دوسرے کو ڈرانے کی کوشش کررہے تھے اور ڈراؤنی قصے بیان کررہے تھے، میں بھی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہا تھا، شاید اس طرح قصہ خوانی سے رات گزر جائے اور صبح ہوتے ہی ہر کوئی اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوجائے۔

بوڑھے چوکیدار کی کھانسی میں سردی کی شدت کی وجہ سے اضافہ ہوگیا تھا ایسی طوفانی ہواؤں میں بھی دور اسے دھواں اٹھاتی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ زیرلب بڑبڑایا۔

''پتا نہیں یہ آگ کس نے جلائی ہے، یہاں تو اس وقت کوئی ٹرین نہیں آتی اور مسافر بھی نظر نہیں آرہے؟ مجھے کیا.....؟'' وہ پھر رضائی میں منہ کرکے سونے کی ناکام کوشش کررہا تھا پر نجانے آج نیند اس سے کوسوں دور تھی، اک عجیب سی بے چینی نے اسے آگھیرا تھا۔

وہ چاروں مسافر نما سائے بدستور آگ سینک رہے تھے۔ ایک بوڑھا مسلسل بولے جارہا تھا وہ اپنی خود نوشت سنا رہا تھا اور باقی ہم تین ہمہ تن گوش ہوکر اس کی کہانی سن رہے تھے۔

''تو دوستو.....! میری کہانی کافی طویل ہے چونکہ ہر کوئی اپنی اپنی کہانی بیان کرے گا اس لئے مختصراً میرا قصہ کچھ اس طرح ہے۔

''میں ایک تھانیدار تھا بے حد ظالم اور بے رحم۔ پتا نہیں کتنے مظلوم قیدیوں کو اپنے ظلم کا شکار بنا چکا تھا ان میں بے گناہ بھی تھے اور گناہ گار بھی میرے کاغذوں میں کسی کے لئے معافی نہیں تھی میرا اوڑھنا بچھونا بس وہی جیل خانہ تھا جہاں میں تعینات تھا۔ لیکن ان سب میں ایک قیدی مجھے ہمیشہ یاد رہے گا اور وہ تھا قیدی نمبر 53 جی یہاں قیدی نمبر 53 خاموش طبع، ڈرپوک اور سنجیدہ، لیکن میرا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں تھا اس پر الزام تھا کہ اس نے اپنے والد کا خون کیا تھا، کبھی کبھار اس کی بوڑھی والدہ اس سے ملنے آتی تھی ورنہ وہ ہر وقت چپ بیٹھا رہتا تھا مجھے صرف اتنا پتا چلا کہ ایک دن اس کے باپ نے اس کی ماں کو جوا پر بیچ دیا اور طیش میں آکر اس نے اپنے ہی باپ کا خون کردیا۔

عدالت نے اسے عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ قیدی نمبر 53 سے بلاوجہ نفرت ہوگئی تھی، ایک دن اس کی بوڑھی والدہ اس سے ملاقات کرنے آئی تھی میرا بھی دماغ گھوما ہوا تھا میں نے ایک زور کا دھکا دے کر اس کی بوڑھی والدہ کو گرادیا جس سے قیدی نمبر 53 کو بڑی تکلیف پہنچی پھر تو اس نے حد ہی کردی، دنیا جہان کی گالیاں مجھے سناڈالیں بھلا میں بھی کہاں چپ بیٹھنے والا تھا اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرسکا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک بڑا سا ڈنڈا لے کر جیل کے کمرے کے اندر گھس گیا اور اس پر ڈنڈوں کی برسات کردی کب اس کی موت واقع ہوگئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ دوسرے کانسٹیبل بھاگتے ہوئے اندر آئے اور میرا ہاتھ روکا لیکن تب تک دیر ہوچکی تھی ایک بوڑھی ماں کے سامنے اس کے قیدی بیٹے کی لاش خون میں ڈوبی ہوئی پڑی تھی۔

بوڑھی عورت رورو کر مجھے بددعائیں دے رہی تھی ویسے میرے کیریئر میں ایسے واقعات کی بہتات تھی اس لئے میں نے اپنے ماتحتوں کو لاش ٹھکانے لگا کر خودکشی کی رپورٹ بنا کر پیش کرنے کو کہا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آگیا ویسے میرا کمرہ جیل کے برابر والے ایریا میں ہی واقع تھا اور ویسے بھی میں سنگل تھا اور شادی بیاہ کو فضول رسم سمجھتا تھا ڈیوٹی کے بعد شراب وشباب کا اہتمام ریگولر ہی کرتا تھا۔''

میرے ماتحت روز کوئی نہ کوئی کال گرل پیش کرنے کا انتظام کرتے تھے اور بدلے میں وہ مجھ سے نرمی سے پیش آنے کی توقع کرتے تھے کیا بتاؤں دوستو! میں کتنا مکار ظالم شخص تھا اور ایک دن اس بوڑھی عورت کی بددعا نے کام کر دکھایا۔

رات کو ڈیوٹی سے فارغ ہو کر میں اپنے کمرے میں آیا تو ایک کمسن حسینہ کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے حسن وشباب کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا اس کی طلسماتی آنکھوں میں کھو سا گیا اس کمسن حسینہ کو اپنی بانہوں میں لینے کے لئے جیسے ہی اس کے قریب گیا اس نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔"

"اتنی بھی کیا جلدی ہے جیلر صاحب، شباب سے پہلے شراب کا مزہ نہیں چکھو گے......" اب شراب پینے کی ضرورت کسے تھی۔ بہرحال میں بستر پر دراز ہو گیا اور وہ دو پیک بنانے لگی کہ اچانک کمرے کی لائٹ چلی گئی۔

"ارے یہ لائٹ اس وقت جاتی تو نہیں ہے۔" وہ موم بتی ہاتھوں میں اٹھائے جانے کس طرح میرے دل کی بات سن لی۔

باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازوں میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا تھا بالکل ویسے جس طرح جیل میں کسی قیدی کے موت آجانے سے پہلے سارے کتے زور زور سے چلاتے تھے لیکن آج کسی کی موت تو نہیں ہوئی جیسے ہی وہ کم سن حسینہ میرے قریب آئی تو، تو موم بتی کی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے کیونکہ وہ اور کوئی نہیں قیدی نمبر 53 کا چہرہ تھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا اس کا چہرہ اور بھی بھیانک ہو گیا تھا۔

میں نے اپنا پسٹل اٹھانے کی کوشش کی لیکن حیرت انگیز طور پر میرے ہاتھ پیر سن ہو چکے تھے اور میں پتھر بنا خوف کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

قیدی نمبر 53 بولا۔"پہچانا جیلر...... آج کیوں نہ آپ کو بھی اپنی دنیا میں ساتھ لے جاؤں، ویسے تو بڑا ظالم بنا پھرتا ہے۔ میری بوڑھی ماں کی بددعاؤں نے اپنا اثر دکھایا ہے اور مجھے تم سے بدلہ لینے کی قوت مل گئی ہے بڑا شوق ہے ناں کال گرلز کو بلانے کا......"

وہ خنجر سے وار کرتا گیا اور میرے جسم کا ہر عضو الگ ہوتا گیا اور اس طرح مجھے زندگی سے نجات مل گئی اور قیدی نمبر 53 نے اپنا بدلہ لے کر ثابت کر دیا کہ ظالم کو اس دنیا میں ہی اپنے ظلم کا بدلہ چکانا پڑتا ہے۔

"میری روح تب سے بھٹک رہی ہے اور راہ نجات کے لئے یہاں وہاں بھٹکتا رہتا ہوں، تو دوستو یہ تھی میری کہانی۔"

اس کی کہانی سن کر ہم تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر خوب ہنسنے لگے۔

میں نے کہا۔"کیا شکل سے ہم لوگ آپ کو بے وقوف نظر آرہے ہیں جو آپ اس طرح ہمیں ڈرانے کی ناکام کوشش کریں گے۔"

"کیا کہا روح......!" دوسرا بوڑھا بول پڑا۔

"ساتھیو، ہمیں ڈرانا آسان نہیں ہے پر مجھے یقین ہے کہ میری کہانی سن کر آپ لوگ ضرور ڈر جائیں گے، تو وقت ضائع کئے بغیر میری کہانی سنو۔"

"میں ایک کامیڈین تھا اور مذاق کر کے پیٹ پالتا تھا کبھی تھیٹر میں کبھی فلم میں کبھی ڈرامے میں اور کبھی میلے میں...... میں ہر جگہ لوگوں کو ہنساتا تھا لیکن ایک چیز کو لے کر میں روتا تھا وہ تھا ایک خواب جو اکثر میں دیکھا کرتا تھا ایک جنگل ہے اور میں راستہ بھٹک گیا ہوں اندھیرا بڑھتا جارہا ہے اور ہر طرف جنگلی جانوروں کی آوازوں نے مجھے کافی ڈرا دیا تھا کہ اچانک ایک سفید ریش سفید پوش اجنبی میرے سامنے نمودار ہوا۔"

"ڈرو نہیں مسخرے تم لوگوں کو ہنساتے ہو اور آج کے دور میں یہ کام نہایت مشکل ترین کام ہے جو تم بخوبی سے سرانجام دیتے آرہے ہو، لیکن میری ایک بات یاد رکھنا، یہ دنیا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے تم اپنی تکلیفیں چھپا کر دوسروں کو ہنساتے ہو، لیکن جس اولاد اور بیوی کے لئے یہ سب کر رہے ہو وہی لوگ ایک دن تم کو رلائیں گے...... یاد رکھنا موت کو۔" سفید پوش اجنبی غائب

ہوگیا اور میری آنکھ کھل گئی۔ یہی بات مجھے ہر وقت رلا تی رہتی تھی۔

ایک دن میں ایک تھیٹر میں تماشہ کررہا تھا کہ اچانک مجھے دل کا شدید دورہ پڑا انتظامیہ والے مجھے شہر کے بڑے اسپتال لے کر گئے درد کم نہیں ہورہا تھا اور ڈاکٹر مجھے بچانے کی سرتوڑ کوشش کررہے تھے مجھے کوئی ہوش نہیں تھا میرے سامنے تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا بس یوں سمجھو کہ میرا آخری وقت تھا، قریباً 20 منٹ بعد مجھے ڈاکٹروں کی سرگوشی سنائی دی۔

''ہی از نو مور۔''

میں خود کو کافی ہلکا محسوس کررہا تھا، لگتا تھا جیسے کسی بھاری چیز کی دباؤ سے نجات مل گئی ہے۔

''ارے یہ کیا میں تو اندھیرے میں اڑتا جارہا تھا، لگتا ہے میں کسی انجانی دنیا میں داخل ہوگیا ہوں لیکن اندھیرا تھا کہ چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

اچانک ایک روشن چہرے والا سفید ریش میرے سامنے آگیا اس کے چہرے کی روشنی سے اندھیرے میں اجالا سا ہوگیا ارے میں تو اسے پہچانتا ہوں یہ وہی اجنبی سفید ریش تھے جو اکثر خواب میں مجھے دکھائی دیتے تھے وہ بہت ہی نرمی سے گویا ہوئے۔

''میاں مسخرے، حیران مت ہو، تم ابھی مرے نہیں ہو بس موت کی سرحد پر کھڑے ہو، تم نے واپس جانا ہے اور خواب میں دیکھے گئے دھکے مزید جھیلنے ہیں بس اتنا خیال رہے کسی کا دل نہیں دکھانا۔''

ایک زوردار ہوا کا جھونکا سا محسوس ہوا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہی پرانا وزن میرے ناتواں کندھوں پر آ گیا ہے۔

ڈاکٹروں کی آواز پھر گونجی۔''ناممکن، ارے یہ کیسے ہوگیا تھوڑی دیر پہلے اس مریض کے دل کی دھڑکن بند ہوگئی تھی اور ہم نے اسے مردہ قرار دیا تھا لیکن یہ اچانک اس کا دل کیوں دھڑک رہا ہے ارے یہ تو زندہ ہوگیا۔''

''میں کہاں ہوں۔'' میں نے آنکھیں کھولتے ہی سوال کیا۔ سارے ڈاکٹر وہاں جمع ہوگئے، کسی کو یقین نہیں ہورہا تھا کہ میں مر کر زندہ کیسے ہوگیا ڈاکٹرز کے استفسار پر میں نے اپنا مشاہدہ بیان کیا مگر کسی کو بھی میری باتوں کا یقین نہیں ہوا وہ سارے مادہ پرست اور منکر لوگ تھے جو سائنس کو ہی سب کچھ مانتے تھے اور سائنس روحانیت سے عاری ہے۔

خیر کچھ دن میں وہاں زیر علاج رہا اب میں بوڑھا ہوچکا تھا اور کامیڈی بھی چھوڑ دی تھی پوری زندگی جس اولاد کی خاطر دھکے کھائے، وہ اب مجھے فالتو پرزہ سمجھنے لگے تھے، میری بیٹی کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی، میری بیوی اپنے میکے چلی گئی اور میرے بڑے بیٹے نے تو کمال کردیا مجھے اولڈ ہاؤس میں بھرتی کردیا جہاں میرے جیسے سینکڑوں اولاد کے ستائے ہوئے بوڑھے اور بزرگ پہلے سے دھکے کھارہے تھے۔ میں اس غم میں بیمار رہنے لگا۔

خواب والی بات سچ ثابت ہوگئی اولاد کے ہاتھوں ملنے والے غم نے مجھے نڈھال کرکے رکھ دیا۔ میں برسوں وہاں پڑا رہا لیکن کوئی بھی مجھے ملنے نہیں آیا اور آخرکار سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی اور آج آپ کے سامنے بیٹھا ہوں۔''

مسخرے کی باتوں پر ہمیں خوب ہنسی آئی مگر ڈر کوسوں دور تھا۔ البتہ اس کے حالات جان کر سب افسردہ ضرور ہوئے۔ اب باری تھی نوجوان کی اس نے کچھ لکڑیاں آگ میں ڈالی پھر گویا ہوا۔

''میں کرکٹ کا مشہور کھلاڑی تھا کرکٹ کی وجہ سے میری طرز زندگی خاصی خوشحال تھی اور گھریلو حالات بھی خوشگوار تھے کھیل کود کو ہی میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا والد ایک سیاست دان تھے جو کرپشن سے الگ ہمارے لئے دولت اکٹھی کررہے تھے، میری والدہ ایک این جی او کی سربراہ تھیں والدین کی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے میرے لئے ٹائم کم تھا ویسے تو کرکٹ میں کافی کمائی ہورہی تھی لیکن جب سے سٹے بازی شروع کردی گئی تھی میری تو پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں میرے لئے دولت ہی سب کچھ تھی وطن سے

غداری کرکے دوسری ٹیم کو جتوانا جان بوجھ کر وکٹ پر آؤٹ ہونا اور بدلے میں بھاری دولت جوا کے ذریعے کمانا تو میرا مقصدِ حیات تھا۔

دین سے دوری کی وجہ سے دل زنگ آلود ہوگیا تھا پھر اچانک ایک دن دل کا دورہ پڑا اور والد صاحب اور میری بے پناہ دولت بھی مجھے بچا نہیں سکی اور نوجوانی کے عالم میں ہی خالی ہاتھ دنیا سے آنا پڑا اور اب یہاں آپ کو اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنے کی تلقین بھی کر رہا ہوں اور ڈرانے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔"

کرکٹر کی کہانی سن کر ہم لوگ کافی دیر خاموش رہے۔

رات اپنے پچھلے حصے میں داخل ہوچکی تھی۔ گمنام اسٹیشن کی ویرانی قابلِ دید تھی، اب میری باری تھی۔

"تو دوستو میری کہانی بھی زیادہ طویل نہیں ہے، میں ایک بے روزگار نوجوان تھا جو ایم اے کی ڈگری ہوتے ہوئے بھی نوکری کی تلاش میں دربدر بھٹکتا رہتا تھا، مگر سفارش، پرچی اور رشوت کے بغیر نوکری کی تمنا میرے دل کے اندر ہی دفن ہوگئی۔ اور ایک دن حد ہوگئی بیروزگاری کی وجہ سے میری منگیتر بھی مجھے چھوڑ گئی اور رشتے سے انکار کردیا۔ بعد میں پتا چلا کہ ایک ادھیڑ عمر بزنس مین سے اس کا افیئر ہوا اور بعد ازاں افیئر شادی میں بدل گیا، اسے دولت تو بہت ملی لیکن عزت......؟"

وہ بزنس مین اسے بھی بزنس کے طور پر چلانے لگا وہ اب ہائی سوسائٹی کال گرل بن چکی تھی شکر ہے میں ایسی عورت سے بچ گیا بے روزگار ہوا تو کیا ہوا، عزت تو تھی میں نے حالات کا کافی دنوں تک مقابلہ کیا مگر اب تھک چکا تھا، ملکی حالات ٹھیک نہیں تھے، سیاست کاروبار بن چکی تھی، مہنگائی کنٹرول سے باہر تھی فحاشی و عریانی کا دور دورہ تھا، لوگ درندے بن گئے تھے۔ معصوم بچے اور بچیوں سے زیادتی و قتل کے واقعات عام ہوچکے تھے انصاف کا پرندہ اڑ کر جنگلوں میں چلا گیا تھا۔

آخر کب تک ایک بے روزگار ایسے حالات کا مقابلہ کرتا، آخر کار شہر کے ایک مشہور چوک پر انٹرویو سے ناکام واپسی پر میرا ایکسیڈنٹ ہوگیا اور بے روزگاری سے ہمیشہ نجات مل گئی لوگوں نے مجھے اسپتال پہنچایا لیکن بہت دیر ہوگئی تھی۔

"ایک راز کی بات بتاؤں دوستو! لوگوں کے لئے تو وہ ایک ایکسیڈنٹ تھا لیکن حقیقت میں وہ ایکسیڈنٹ نہیں بلکہ خودکشی تھی...... ہاں میں نے خودکشی کی تھی اور جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آ گیا تھا لیکن اب مجھے پچھتاوا ہوتا ہے، کاش میں نے ایسا نہیں کیا ہوتا اور زندگی جیسی نعمت کی قدر کی ہوتی۔"

میری کہانی نے سب کو رلا دیا تھا۔ رات ابھی باقی تھی ایک سایہ ہماری طرف آتا دکھائی دیا، وہ کافی عمر رسیدہ اور لاغر تھا اس نے باری باری ہم سب کو دیکھا اور ہمارے ساتھ بیٹھ گیا، ہمارے پوچھے بغیر ہی خود وہ بول پڑا۔

"میں سامنے والے ریلوے اسٹیشن کا چوکیدار ہوں، کافی سردی لگ رہی تھی سوچا آپ لوگوں کے ساتھ آگ سینک لوں، ویسے رات کو یہاں گاڑی نہیں آتی، عمر بیت گئی اس پھاٹک کی نگہبانی کرتے، لیکن آج تک میں نے کسی ٹرین پر سفر نہیں کیا! کیا آپ لوگ بھی ٹرین کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

ہمیں خاموش پا کر وہ خود ہی بولا۔"میں بھی کتنا بھولا ہوں جو مسافروں سے اس طرح کے سوال پوچھ رہا ہوں......"

اچانک ایک ٹرین نمودار ہوئی لیکن اس کی ہولناک آواز سے ہماری روح تک کانپ گئی، جیسے کوئی زلزلہ ہو، پتھروں کی بارش ہو، ٹرین صدیوں پرانی معلوم ہو رہی تھی وہ عین ہمارے سامنے آ کر رکی اور باری باری ہم سارے لوگ اس پر سوار ہوئے، وہ طلسماتی ٹرین ایک جانب غائب ہوگئی۔

صبح گاؤں والوں کو بوڑھا چوکیدار ریلوے اسٹیشن کی انتظار گاہ میں اپنی چارپائی پر مردہ حالت میں ملا۔

اسرار

محمد خالد شاہان۔صادق آباد

قسط نمبر 21

نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنداں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہان کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

ایک چپو راج کماری نے اور دوسرا چپو شریم نے سنبھال لیا۔ اور کشتی کو لے کر چٹان سے آگے نکلے اب جنگلی لوگوں کی کشتیاں دائرہ بنا کر چکر لگا رہی تھیں جونہی انہوں نے ان کی کشتی کو آتے دیکھا تو وہ فوراً ایک طرف ہٹ گئے اب شریم کو خیال آیا کہ کیوں نہ ان لوگوں سے کھانے پینے کی چیزیں حاصل کی جائیں اس نے راج کماری کو پوری طرح سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ان جنگلی لوگوں کو کہو کہ وہ جزیرے پر چلیں......“

”میں تو ان کی زبان نہیں جانتی۔“

”تم اشاروں سے کام لو اور بولنا تمہارے لئے خطرناک ثابت ہوگا...... بات ہرگز نہ کرنا۔“

راج کماری نے کمال کی اداکاری شروع کردی وہ کشتی میں کھڑی ہوگئی اور اپنا ہاتھ اپنے منہ کے قریب لے جاکر کچھ اس قسم کا اشارہ کیا کہ وہ پانی پینا چاہتی ہے اتنا سننا تھا کہ سارے جنگلی اپنی اپنی کشتیاں لے کر راج کماری کی کشتی کے قریب آگئے پھر انہوں نے راج کماری کی کشتی کو اپنی کشتی کے ساتھ ساتھ نزدیک رکھا۔ اور بار بار اپنی کشتی میں جھک کر اسے کھینچتے ہوئے اپنے جزیرے کی طرف بڑھے جزیرہ وہاں سے بیس میل کے فیصلے پر تھا یہ بڑا سرسبز اور شاداب جزیرہ تھا۔

راج کماری اور شریم کشتی سے اتر کر کنارے کے ریت پر کھڑے ہوگئے جنگلی لوگوں کو شریم دکھائی نہیں دے رہا تھا انہوں نے راج کماری کے آگے گے چلنا شروع کردیا اور دیوی کے نعرے لگانے شروع کردیئے جزیرے کے دوسرے جنگلی بھی نکل آئے اور دیوی کا نام سن کر وہیں جھک گئے۔ راج کماری بڑی ٹھاٹھ سے گردن اکڑا کر چل رہی تھی شریم بھی اس کے ساتھ تھا راج کماری کی خدمت میں پھل اور دودھ پیش کئے گئے جسے راج کماری نے بڑے شوق سے کھایا اور پیا، جنگلیوں کا ایک مکار جادوگر بڑے حسد سے راج کماری کو دیکھ رہا تھا اسے شک ہوا کہ یہ کوئی انسان ہے اور جنگلی لوگوں کو بے وقوف بنا رہی ہے اس نے نیزہ اچھال کر کہا۔

”یہ دیوی نہیں ہے بلکہ کوئی عام عورت ہے اور ہمیں الو بنا رہی ہے۔“

شریم نے راج کماری کے کان میں کہا۔ ”گھبرانا نہیں میں اس کو سنبھال لوں گا پھر وہ مکار جادوگر بولا۔ اگر یہ دیوی ہوگی تو اس پر میرے حملے کا کوئی اثر نہ ہوگا...... اگر یہ جھوٹی عورت ہے تو میرا نیزہ اس کے سینے کے آر پار ہوگا۔“ سب جنگلی چپ ہوگئے جیسے ان کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگ گئی ہو۔

راج کماری گھبرا رہی تھی کیونکہ وہ اس پر تیر پھینکنے



کے لئے بالکل تیار تھا۔ شریم بھی چوکس ہو گیا تھا اس نے راج کماری کے کان میں سرگوشی کی اپنی جگہ سے مت ہلنا میں اس کو اس گستاخی کا مزہ چکھانے جا رہا ہوں...... اور شریم لپک کر جادوگر کے پیچھے آ گیا۔ اس نے نیزہ اوپر اٹھایا ہی تھا کہ شریم نے اس کی گردن پر اتنی زور سے اچھل کر لات ماری کہ وہ چیخ کر منہ کے بل گرا اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا اور وہ وہیں مر گیا۔ پھر شریم نے نیزہ اٹھا کر اس کے پیٹ میں گاڑھ دیا یہ بھیانک منظر دیکھ کر جنگلی دم بخود ہو کر رہ گئے پھر انہوں نے اس قدر بلند آواز میں دیوی زندہ باد کا نعرہ لگایا کہ سارا جنگل گونج اٹھا۔

دو روز راج کماری نے دیوی بن کر جزیرے کے جنگلی لوگوں کی مہمان نوازی کا مزہ اٹھایا تیسرے روز راج کماری نے انہیں اشاروں میں بتایا کہ وہ آسمان پر جا رہی ہے۔ جنگلیوں کے ناریل اور کیلوں کے گچھوں سے بھری ہوئی ایک بڑی کشتی راج کماری کی کشتی کے ساتھ رسی سے باندھ دی۔ راج کماری کشتی میں سوار ہو گئی شریم پہلے ہی اس میں بیٹھ چکا تھا۔ جنگلی لوگ اونچی آواز میں اپنے بھجن گانے لگے شریم ہنس رہا تھا۔ راج کماری خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ وہ ان آدم خور حبشیوں کے درمیان سے صحیح سالم واپس جا رہی ہے۔ جنگلی جزیرے سے کافی دور تک راج کماری کے ساتھ آئے اور اس کی کشتی خود کھینچتے رہے پھر جب کشتی کھلے سمندر میں آ گئی تو راج کماری سے شریم نے کہا۔

"ان الوؤں سے کہو کہ اب دفع ہو جاؤ۔" راج کماری نے ہاتھ سے اشارہ کر کے ان کو واپس جانے کو کہا۔ جنگلی اپنی اپنی کشتیوں میں ادب سے جھک گئے۔ اور پھر نعرے بلند کرتے واپس اپنے جزیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

راج کماری نے سکھ کا سانس لیا۔ اور ماتھے پر آیا ہوا پسینہ خشک کر کے بولی۔ "شریم بھائی تم کشتی میں ہو ناں۔"

"ہاں تمہارے ساتھ ہوں۔" شریم نے جواب دیا۔ اچھا ہوا کہ ان سے پیچھا چھوٹ گیا شریم نے کہا۔

"اب ایسا کرتے ہیں کہ کچھ پھل اور ناریل اپنی کشتی میں رکھ لیتے ہیں اور اس کشتی کو یہیں سمندر میں چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ رسی سے بندھی ہوئی یہ پھلوں سے بھری کشتی طوفان میں ہمیں بھی لے ڈوبے گی۔" انہوں نے تھوڑے بہت پھل اور ناریل اپنی کشتی میں رکھ کر دوسری کشتی کو کھول کر سمندر کی وسیع لہروں کے حوالے کر دیا کچھ دور تک وہ کشتی انہیں نظر آتی رہی پھر سمندر کی بڑی بڑی موجوں کی اوٹ میں کھو گئی اب ان کا ایک اور سمندری سفر شروع ہو گیا تھا۔

شریم نے کہا۔ "کم بخت ان جنگلیوں کی زبان ہماری سمجھ سے باہر تھی ورنہ ان سے پوچھتے کہ یہاں سے قریبی ملک کا ساحل کتنی دور ہے؟"

پھر شریم نے راج کماری سے پوچھا۔ "کہ وہ کچھ حساب لگا کر بتا سکتی ہے۔"

راج کماری نے آسمان پر چمکتی دھوپ اور نیلے سمندر میں چاروں طرف دیکھا اور کہا۔ "میرے حساب کے مطابق ہماری کشتی مشرق کی طرف جا رہی ہے اور ہمارا ملک ہندوستان اسی طرف ہے۔" شریم نے سر کو جھٹک کر کہا۔

"یہ تو تم نے پہلے بھی بتایا تھا اور ہم آتش فشاں پہاڑوں میں پھنس گئے تھے۔ خدا کے لئے اب کوئی اس قسم کی پیش گوئی نہ کرنا۔" سارا دن ان کی کشتی لہروں پر اپنے آپ بہتری رہی۔

کھلے سمندر میں پہنچ کر شریم کو دور ایک گول سی شے سمندر سے ابھرتی اور پھر ڈوبتی دکھائی دی۔ شریم نے سمجھا کہ شاید اس کا وہم ہو۔ راج کماری اپنے ماں باپ کی یاد میں اداس ہو گئی شریم اس کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔

اچانک دور وہ ہی گول چیز ایک بار پھر سمندر میں سے باہر کو نکلی شریم راج کماری سے بولا۔

"یہ کیا شے ہے راج کماری۔" راج کماری اس گول شے کو غور سے دیکھنے لگی دھوپ سمندر میں چمک رہی تھی لیکن ابھرتی ہوئی شے کافی فاصلے پر تھی راج

کماری ڈر گئی۔
"بھگوان کے لئے کشتی کا رخ موڑو۔ یہ کوئی بڑی خطرناک بلا لگتی ہے۔" جسے شریم غور سے دیکھ رہا تھا۔
سمندر سے ابھرتی گول سی چیز اب زیادہ بڑی ہوگئی تھی مگر صاف پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے کوئی ویل مچھلی ہے کہ سمندری عفریت ہے۔ شریم نے کشتی کا رخ دوسری طرف موڑنے کی کوشش کی لیکن لہروں کا رخ اچانک اس ابھرتی ہوئی بلا کی طرف ہوگیا۔ کشتی سمندری عفریت کی طرف تیز تیز جارہی تھی راج کماری نے گھبرا کر کہا۔
"ہم مصیبت میں پھنس گئے ہیں شریم بھائی۔"
شریم نے کہا۔ "حوصلہ مت ہارو راج کماری ہم مصیبت کا مقابلہ کریں گے۔" شریم کی نگاہیں ابھرتی ہوئی بلا پر لگی ہوئی تھیں کشتی اس کے قریب جارہی تھی یہ بلا اس سیاہ چٹان کی طرح سمندر کی لہروں سے آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہی تھی کیا سمندر میں کوئی نیا جزیرہ نمودار ہورہا تھا یا پھر دس لاکھ سال پہلے کا کوئی سمندری عفریت سمندر سے باہر نکل رہا تھا۔
شریم کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا وہ پریشان ضرور تھا کیونکہ اگر یہ کوئی عفریت ہوتی تو پھر اس سے چھٹکارا مشکل تھا چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا بس شریم کیا کرسکتا تھا ابھرنے والی بلا اب کچھ کچھ نظر آنے لگی تھی۔
اچانک شریم کانپ اٹھا اس بلا کے سر پر کالے کالے لمبے بال تھے جو سمندر کی لہروں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ پھر اس بلا کا سر موجوں سے اوپر ہوگیا اس کے ساتھ ہی عفریت نے اپنا سر باہر نکال لیا وہ ایک بہت بڑا سر تھا جس کی آنکھیں بڑے بڑے سرخ گنبدوں کی طرح باہر کو ابھری ہوئی تھیں اور لمبے لمبے دانت ہاتھی کے دانتوں سے بھی زیادہ لمبے تھے یہ کوئی پہاڑ جتنا بڑا جن یا دیو تھا جس کے دونوں بازو بہت لمبے تھے اور سمندر کی موجوں پر تیر رہے تھے۔ اس سمندری عفریت کو دیکھ کر راج کماری نے ایک چیخ ماری اور کشتی میں بے ہوش ہوکر گر پڑی۔ سمندری عفریت نے پورا منہ کھولا اور ایک ایسی چنگھاڑ کی آواز اس کے حلق سے نکلی کہ اس کے دھماکے سے سمندر میں طوفان آگیا۔
بڑی بڑی موجیں اٹھ کر سمندری عفریت کے پہاڑ جیسے جسم سے ٹکرانے لگیں ایک موج نے شریم کی کشتی کو نیچے سے اوپر اچھال دیا کشتی الٹ گئی اور شریم راج کماری سمیت سمندر میں گر پڑا۔ شریم نے سمندر میں آنکھیں کھول کر دیکھا وہ سمندر کی تہہ میں اگی ہوئی جھاڑیوں میں الجھی ہوئی تھی اس نے راج کماری کو بھی ایک جھاڑی میں پھنسے دیکھا شریم لپک کر ادھر گیا اور اس نے راج کماری کو جھاڑیوں سے کھینچ لیا وہ اسے اوپر اٹھائے پانی میں اوپر آنے کی کوشش کرنے لگا۔
سمندر کے پانی کا دباؤ اسے اوپر نہیں آنے دے رہا تھا۔
راج کماری غوطے کھارہی تھی شریم اپنے جسم کی ساری طاقت لگا کر راج کماری کو سمندر کی سطح پر لے آیا اس نے سمندر کے نیچے سمندری عفریت کی بڑی بڑی ٹانگیں دیکھیں جو اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھیں اس نے راج کماری کا منہ موجوں کے اوپر کردیا تاکہ وہ سانس لے سکے سمندر سے باہر آگے ہی اس نے دیکھا کہ وہ سمندری عفریت سے زیادہ دور نہیں بلکہ وہ اس کے قریب اور شریم راج کماری کی ٹوٹی ہوئی کشتی کے ایک بڑے سے ٹکڑے کو پکڑ کر چبانے کی کوشش کررہا تھا وہ بار بار دھاڑ رہا تھا جس نے سمندر میں ایک دہشت پھیلا رکھی تھی۔
شریم نے راج کماری کو کندھے سے پکڑ رکھا تھا جونہی وہ سمندر کے اوپر آیا ایک بہت بڑی لہر نے اسے پیچھے سے اٹھایا اور بہا کر کافی دور لے گئی عفریت اب اس سے کافی دور چلا گیا تھا شریم نے راج کماری کی طرف دیکھا وہ ابھی تک بے ہوش تھی۔
شریم اسے لے کر سمندر میں تیرنا شروع کردیا اس کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ کہیں کوئی چٹان بھی دکھائی نہ دے رہی تھی۔ راج کماری کو ساتھ لے کر

تیرنا مشکل ہو رہا تھا وہ اسے لے کر اڑ بھی جاتا تو ایک فرلانگ اڑنے کے بعد اسے دوبارہ سمندر میں اترنا پڑتا شریم نے محسوس کیا کہ راج کماری کو لے کر اگر وہ اسی طرح تیرتا رہا تو وہ جسم میں پانی بھر جانے سے مر جائے گی کیونکہ سمندر کی بڑی بڑی لہریں شریم کو تیرنے نہیں دے رہی تھیں پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور سمندری لہروں پر تیرتا چلا گیا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کس طرف جا رہا تھا اور یہ لہریں اسے کہاں لے جائے گی۔

بہت دور تیرنے کے بعد شریم کی طاقت بھی جواب دینے لگی وہ تھک گیا اس کے ہاتھ ہلکے پڑ گئے اور بے ہوش راج کماری اس کے ہاتھوں سے نیچے گرنے لگی۔ شریم گھبرا گیا۔ وہ خود تو ایک روح تھا اور مر نہیں سکتا تھا اگر وہ تیرنا چھوڑ بھی دیتا تو سمندر کی لہروں پر بے حس و حرکت لیٹ کر بھی زندہ رہ سکتا تھا مگر سب سے زیادہ پریشانی اسے راج کماری کی طرف سے تھی وہ راج کماری کو ہر حالت میں زندہ رکھنا چاہتا تھا اور یہ بات اسے ناممکن نظر آ رہی تھی راج کماری کے پیٹ میں سمندر کا کچھ پانی چلا گیا تھا اور وہ اس طرح بے ہوش تھی سمندری موجیں ان دونوں کو بہت دور لے آئی تھی۔

شریم نے اپنے سامنے راج کماری کو موت کے قریب دیکھا تو اس نے خدا سے دعا مانگی کہ اے خدا ہماری مدد کر دعا کے مانگتے ہی شریم کو ایسا محسوس ہوا جیسے سمندر کے نیچے اس کے پاؤں کسی ٹھوس شے سے لگ گئے ہیں اس سخت شے میں تھوڑی تھوڑی نرمی بھی تھی وہ حیران ہوا کہ اتنے گہرے سمندر میں یہ کون سی چیز ہے جس پر اس کے دونوں پیر ٹک گئے ہیں کیا یہ کوئی سمندری چٹان تھی اس نے سوچا لیکن ایسا بھی نہیں تھا اگر چٹان ہوتی تو وہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا۔ اور یہ وجود شریم کو اپنے سر پر اٹھائے سمندر میں آگے کو جا رہا تھا۔ پھر یہ کیا تھا شریم نے پہلا کام تو یہ کیا کہ راج کماری کو سمندر میں سے نکال کر اپنے کندھے پر اٹھا لیا اس کے پاؤں چونکہ سمندر کے اندر کسی مضبوط سی شے پر ٹکے ہوئے تھے اس لئے وہ بے فکر ہو گیا لیکن وہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے یہ کون سی چیز ہے جو اسے لے کر آگے ہی آگے جا رہی ہے۔

شریم نے دیکھا کہ سمندر میں وہ شے ایک خاص سمت کی طرف سفر کر رہی تھی پھر اس شے نے ہولے ہولے سمندر میں اوپر کو ابھرنا شروع کر دیا شریم نے راج کماری کو اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا وہ شے پانی سے باہر آنے لگی ہوتے ہوتے وہ سمندر سے بالکل باہر آ گئی اور شریم نے نیچے جھک کر دیکھنا چاہا کہ وہ کون سی چیز ہے کہ جس نے ان دونوں کو اٹھا رکھا ہے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ سمندر میں سفر بھی کر رہی ہے۔

جونہی شریم کی نظریں اپنے پاؤں پر گئی تو کیا دیکھتا ہے کہ وہ ایک سات منہ والے ایک بہت بڑے اژدھا کے پھن کے اوپر کھڑا ہے اور اژدھا سانپ اسے لے کر سکون سے لہروں کو چیرتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

اچانک شریم کو ناگن کا خیال آ گیا کہیں یہ ناگن تو نہیں۔ شریم نے ناگن کو آواز دی۔ "ناگن بہن کیا یہ تم ہو۔" اور اس کے ساتھ ہی شریم نے بے ہوش راج کماری کو اس اژدھا سانپ کے پھن کے اوپر لٹا دیا۔ وہاں اتنی جگہ تھی کہ شریم خود بھی لیٹ سکتا تھا یہ بہت بڑا اژدھا تھا۔ اژدھا نے اپنی زبان میں جیسے شریم سمجھتا تھا جواب دیا۔ "مجھے بھی ناگن ہی سمجھو بھائی شریم۔"

"کیا تم واقعی ناگن ہو۔ تمہاری آواز کیوں بدلی ہوئی ہے۔" شریم کے اس سوال پر اژدھا نے کہا۔

"شریم بھائی میں ناگن نہیں ہوں مگر ناگن کا دوست ہوں۔ اور میرا نام سمندر کا شیش ناگ ہے۔ اتفاق سے میں اس سمندر کے نیچے سے گزر رہا تھا تو مجھے تمہاری آواز سنائی دی میں تمہاری طرف بڑھا تو مجھے تمہارے جسم اور کپڑوں سے اپنے پرانے اور بہترین ساتھی ناگن کی خوشبو آئی اسی وقت میں نے تمہاری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

"یہ بتاؤ کہ تم ناگن کو جانتے ہو......؟"

شریم نے کہا۔ "کیوں نہیں وہ تو میری بہن ہے۔ اور ابھی اس سمندر میں میرے ساتھ تھی کہ آتش فشاں پہاڑ کے پھٹ جانے سے وہ مجھ سے بچھڑ گئی مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس حال میں ہے اور کہاں ہے...... میں اور ناگن راج کماری کو اس کے ماں باپ کے پاس ہندوستان لے کر جا رہے تھے۔"

"کیا ناگن سمندر میں نہیں ہے۔" اژدھا نے کہا۔

"نہیں شریم ناگن اس سمندر میں کہیں بھی نہیں ہے اگر وہ ہوتی تو مجھے سمندر کی ایک ایک لہر آ کر بتا دیتی پھر نہ جانے وہ کہاں جا چکی ہے وہ سمندر سے نکل کر ضرور کسی جزیرے یا کسی ساحلی ملک میں پہنچ گئی ہوگی اگر سمندر میں ہوتی تو میں ضرور تمہیں بتا دیتا۔"

شریم کہنے لگا۔ "کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ ہمارا دوسرا بھائی شاہان کہاں ہے۔"

اژدھے نے کہا۔ "شاہان کا نام سن کر مجھے خوشی ہوئی آج سے کئی سال پہلے ایک دریا میں میرا ناگن سے تعارف کرایا تھا مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ کہ شاہان اس وقت کہاں ہوگا...... ایسا کچھ معلوم کرنا میری طاقت سے باہر ہے کیا وہ بھی اس مہم میں تمہارے ساتھ تھا۔"

"ہاں وہ ہمارے ساتھ تھا۔ لیکن یہ بہت پہلے کی بات ہے اصل میں ہمیں اس سفر میں کئی نئی مہموں سے واسطہ پڑتا ہے اور کئی مصیبت میں پھنسے ہوئے لوگ ملتے ہیں جن کی ہم کی مدد کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد ہم پھر روانہ ہوتے ہیں۔ راج کماری کو بھی ہم بہت بڑی مصیبت سے نکال کر اس کے ماں باپ کے گھر لے جا رہے ہیں۔ اس کا باپ ایک ریاست کا راجہ ہے۔" اژدھا خاموشی سے شریم کی باتیں سنتا رہا۔ وہ برابر سمندر میں آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا شریم نے بات ختم کی تو وہ کہنے لگا۔

"شریم بھائی میں تم تینوں کی لمبی اور مصیبتوں سے بھری ہوئی آپ بیتی سے اچھی طرح واقف ہوں کاش میں تمہاری اس سے زیادہ مدد کر سکتا۔ کیونکہ ابھی میری زندگی کے صرف تین سو سال ہی گزرے ہیں دو سو سال اور گزر جانے کے بعد میں بھی ناگن کی طرح جو چاہے شکل بدل سکتا ہوں۔ لیکن ابھی میں تمہارے لئے صرف اور صرف اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ میں تمہیں اس سمندر سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پہنچا سکتا ہوں۔"

راج کماری اسی طرح اژدھے کے اوپر بے ہوش پڑی تھی۔ اژدھا نے کہا۔

"کیا میں اس راج کماری کو ہوش میں لے آؤں۔"

شریم نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ اگر اس وقت ہوش میں آ گئی تو شاید تمہیں، میرا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو ایک اژدھے کے اوپر لیٹے دیکھ کر پھر بے ہوش ہو جائے گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ کسی جگہ زمین پر پہنچنے کے بعد ہوش میں لایا جائے۔"

"اچھا خیال ہے۔" اژدھا نے کہا۔

شریم نے اس سے پوچھا۔ "اس طرح زیادہ دیر بے ہوش رہنے سے وہ مر تو نہیں جائے گی۔" اس کے جواب میں اژدھا نے کہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا راج کماری کے بدن میں جو پانی داخل ہوا تھا وہ میرے سر کی گرمی کی وجہ سے خشک ہو چکا ہوگا زمین پر اترنے کے بعد میں تمہیں ایک مہرہ دوں گا وہ مہرہ راج کماری کے گلے میں باندھ دینا پھر اسے کچھ نہ ہوگا اور اس پر زہریلے سے زہریلے سانپ کا بھی اثر نہ ہوگا۔"

شریم نے پوچھا۔ "لیکن یہاں اردگرد زمین کہاں ہے......؟"

اژدھا نے پوچھا۔ "تم لوگ کہاں جانا چاہتے ہو؟" شریم کہنے لگا۔

"ہمیں ہندوستان جانا ہے جیسا کہ میں نے پہلے تمہیں بتایا ہے کہ میں راج کماری کو اس کے راجہ باپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔"

اژدھا بولا۔ "شریم بھائی فکر نہ کرو ہندوستان کا

ساحل یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گا۔" دوپہر تک اسی طرح سمندر میں اژدھا کے پھن پر لیٹ کر تیرتے رہے اور تیسرے پہر کے قریب دور زمین کے ساحل کی کالی لکیر نظر آنا شروع ہوگئی اژدھا نے شریم سے کہا۔

"وہ سامنے لکیر دیکھ رہے ہو یہ ہندوستان کا ہی ساحل ہے مگر یہ جنوب مغربی ساحل ہے کیا تم اسی جگہ جانا چاہتے ہو۔" اژدھا نے شریم سے کہا۔

شریم نے کہا۔"بس ٹھیک ہے تم ہمیں اسی جگہ پہنچا دو کیونکہ راج کماری نے کہا تھا کہ اس کے باپ کی ریاست جنوب مغربی ساحل کے اندر کسی جگہ ہے۔"

یہاں شریم سے بھول ہوگئی تھی کیونکہ راج کماری نے شریم کو یہ بتایا تھا کہ اس کے باپ کی ریاست ہندوستان میں ایک جگہ ہے اور اژدھا انہیں جنوب مغرب کی طرف لئے جا رہا تھا جو کہ ہندوستان کا سب سے نچلا کنارہ ہے۔ اژدھا نے سمندر میں اپنی رفتار اور تیز کردی کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے وہ انہیں زمین پر پہنچا دے ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ اژدھا نے شریم کو ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر پہنچا دیا۔

شریم نے راج کماری کو ساحل کی ٹھنڈی ریت پر لیٹا دیا اژدھا اپنا زبردست چھ منہ والا سر سمندر سے باہر نکالے کھڑا تھا اس نے شریم سے کہا۔

"میں تمہیں مہرہ دیتا ہوں اسے سنبھال کر رکھنا تم جس کسی کو میرا مہرہ دو گے اس پر سانپ کے زہر کا اثر نہیں ہوگا......اور راج کماری کے ماتھے پر لگاؤ گے تو ہوش میں آ جائے گی۔" اس کے ساتھ ہی اژدھے نے اپنے منہ سے ایک سبز رنگ کا ایک چھوٹا سا پتھر شریم کے آگے اگل دیا۔

شریم نے اسے اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا اور اژدھا کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

"اگر تم نہ ہوتے تو ہمارا یہاں تک پہنچنا ناممکن تھا۔ کیونکہ میں راج کماری کو لے کر زیادہ دور تک پرواز نہیں کرسکتا تھا۔"

اژدھا نے کہا۔"شریم تم ناگن کے بھائی ہو۔ اس حساب سے تم میرے بھی بھائی ہو۔ اور بھائیوں کی مصیبت میں مدد کرنا ہر بھائی کا فرض ہوتا ہے کاش میں اس سے زیادہ تمہاری مدد کرسکتا۔ اگر مجھے زمین پر بسر کرتے پورے پانچ سو برس ہو چکے ہوتے تو اس وقت میں تمہاری اور بھی مدد کرسکتا تھا پر ابھی میری عمر کے دو سو سال باقی ہیں۔"

شریم کہنے لگا۔" اژدھا بھائی میں تو اب بھی تمہیں بھائی سمجھتا ہوں میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اژدھا نے کہا۔"اچھا خدا حافظ شریم بھائی اگر ناگن ملے تو اسے میرا بہت بہت سلام کہنا اور کہنا کہ کبھی اس کا اس سمندر میں سے گزر ہو تو مجھ سے ضرور ملتی جائے۔"

شریم نے کہا۔" میں تمہارا پیغام ناگن تک ضرور پہنچا دوں گا خدا حافظ۔" اور سات سروں والا اژدھا واپس سمندر میں گم ہوگیا اس کے جاتے ہی سب سے پہلا کام شریم نے یہ کیا کہ راج کماری کے ماتھے پر مہرہ آہستہ سے رگڑا اور وہ ہوش میں آ گئی اس کی طبیعت پہلے سے اچھی تھی پیٹ کا سارا سمندری پانی اژدھے کی گرمی نے جذب کرلیا تھا وہ آنکھیں کھولتی ہوئی بولی۔

"میں کہاں ہوں اور وہ......وہ......عفریت۔"

راج کماری نے سہم کر پھر سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس خیال سے کہ کہیں راج کماری پھر سے بے ہوش نہ ہو جائے شریم نے کہا۔

"وہ عفریت جا چکا ہے راج کماری ہم سمندر سے نکل کر ہندوستان کی سرحد پر آ چکے ہیں۔"

"ہندوستان میرے باپ کا ملک ہے۔" راج کماری نے آنکھیں کھول کر حیرانی اور خوشی سے کہا۔

"ہاں، ہاں دیکھ لو کیا تم اپنے ملک کی زمین اور درختوں کو نہیں پہچانتی۔" راج کماری نے اپنے اوپر جھکے ہوئے ناریل اور تاڑ کے لمبے ترچھے درختوں کو دیکھا

تو خوشی سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''لیکن ہم اس سمندری عفریت سے بچ کر کیسے آ گئے۔'' شریم نے ہنس کر کہا۔

''ہمیں ایک دوسرا سمندری عفریت یہاں تک لایا ہے۔'' راج کماری نے سہم کر پوچھا۔

''وہ کہاں ہے؟'' شریم نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا اس عفریت سے میں نے تمہیں بچالیا ہے اور میں اڑا کر تمہیں یہاں لے آیا۔'' پھر شریم نے راج کماری سے پوچھا کہ وہ اندازہ لگا کر بتائے کہ وہ ہندوستان کے جس ساحل پر اترے ہیں وہاں سے اس کے راجہ باپ کا شہر کتنی دور ہے۔ راج کماری نے بڑے غور سے چاروں طرف دیکھا پھر درختوں کی طرف نگاہ ڈالی اور کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں اپنے پتا کے شہر سے کافی دور ہوں ہم جنوبی علاقے میں ہیں جبکہ میرے پتا کی ریاست درمیانی علاقے میں ہے۔'' شریم کو کچھ پریشانی ہوئی کیونکہ راج کماری کو اتنے خطرناک اور درندوں سے بھرے ہوئے جنگلوں سے اکیلے لے کر جانا خطرے سے خالی نہ تھا مگر یہ کام شریم کا فرض بن چکا تھا اور وہ اسے اس کے باپ تک پہنچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے راج کماری سے کہا کہ کوئی بات نہیں ہمارا سفر جاری رہے گا ہم جنگل کی ہر مصیبت کا مقابلہ کریں گے اور شریم پھر ایک خطرناک سفر پر چل پڑا۔ اسے ابھی تک یہ تجربہ نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان کے گھنے جنگل کتنے خطرناک ہیں اور کیسے کیسے خوف ناک درندے اور بدروحیں رہتی ہیں وہ اس سے پہلے ان جنگلوں میں نہیں آیا تھا لیکن ناگن اور شاہان نے ان علاقوں میں کئی چکر لگائے تھے۔

راج کماری کو شریم نے اپنے پیچھے پیچھے رکھا ہوا تھا وہ شریم کو دیکھ نہیں سکتی تھی کہ اس خیال سے کہ راج کماری اپنے آپ کو اکیلی سمجھ کر گھبرا نہ جائے شریم تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس سے کوئی نہ کوئی بات کر لیتا تھا سہ پہر بھی ڈھل چکی تھی اور سمندر میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ پہلے شریم نے سوچا تھا کہ وہ رات سمندر کے کنارے کی ریت پر ہی بسر کریں اور اگلے روز دن کی روشنی میں جنگل کا سفر شروع کریں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کہ وہ ہر قسم کی مشکل کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اس لئے وقت ضائع کرنے کے بجائے یہی بہتر ہے کہ سفر جاری رکھا جائے تا کہ وہ جلد سے جلد اپنی منزل پر پہنچ سکے۔ انہوں نے کچھ فاصلہ سمندر کے ساحل پر جنگل کے ساتھ ساتھ طے کیا۔ پھر سورج کے حساب سے جنگل کے اندر جاتی ایک پگڈنڈی پر آ گئے۔

راج کماری کا حساب بالکل درست تھا وہ ہندوستان کے درمیانی علاقے کی طرف جا رہے تھے۔ لیکن راج کماری کا محل وہاں سے ہزاروں میل فاصلے پر تھا اور راہ میں کئی دشوار گزار گھاٹیاں شور مچاتے پتھروں سے ٹکراتے دریا آبشاریں، دلدلیں خونخوار درندے اور وحشی قبیلے تھے جو انسان کو دیکھ کر اس پر فوراً زہریلا تیر چلا کر ہلاک کر دیتے تھے۔

شریم ایک نوجوان تھا اسے کئی خطرناک دہشت ناک سفروں کا تجربہ تھا جنگل گھنا نہیں تھا تاڑ کے لمبے لمبے چھتریوں والے درخت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اگے ہوئے تھے۔ زمین پتھریلی اور ناہموار تھی سوکھی گھاس کی جھاڑیاں یہاں وہاں نظر آ رہی تھیں سورج کی سنہری روشنی دور چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے اوپر آ رہی تھی۔ کسی وقت درخت پر کوئی پرندہ بولتا تو جنگل کی خاموشی ٹوٹ جاتی شریم راج کماری سے باتیں کرتا جا رہا تھا یونہی چلتے چلتے جب شام ہو گئی تو راج کماری تھک گئی اور کہنے لگی۔

''شریم بھائی میں اب چل نہیں سکتی مجھے پیاس لگی ہے اور بھوک بھی ستانے لگی ہے۔''

شریم نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، ہم کوئی مناسب جگہ دیکھ کر وہاں رات بھر بھی آرام کریں گے اور تمہارے کھانے پینے کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔'' اس وقت دونوں ایک چھوٹے سے ٹیلے کے سائے میں چل رہے تھے۔

یہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا......بس ایک پگڈنڈی سی بنی تھی جس میں اگی ہوئی لمبی گھاس یہ ظاہر کررہی تھی کہ اس پر سے بہت کم کوئی گزرتا ہے یہاں جانوروں کے پاؤں کے بھی نشان نہ تھے ٹیلے کا موڑ گھوم کر شریم سامنے آیا تو اسے ایک چشمہ نظر آیا جو ٹیلے کے پتھروں سے نکل کر وادی میں جارہا تھا۔راج کماری نے چشمے کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی یہاں جنگلی بیروں کے بہت درخت تھے۔شریم نے راج کماری کو بیر توڑ کر دیئے جو اس نے بڑی مشکل سے کھائے۔محلوں میں رہنے والی راج کماری نے بھلا کب اس طرح کے کھٹے جنگلی بیر کھائے ہوں گے لیکن مجبوری تھی جب انسان پر کوئی بھاری مصیبت آتی ہے تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

''میرا خیال ہے کہ اسی جگہ رات بسر کرتے ہیں۔''شریم نے کہا۔

راج کماری درختوں کو دیکھ کر بولی۔''بہتر ہوگا کہ ہم کسی درخت پر بسیرا کریں کیونکہ زمین پر رات کو جنگلی درندوں کا خطرہ ہوگا۔اور ہمارے پاس تو ایک چھوٹا سا چاقو بھی نہیں۔'' ان کے پاس واقعی کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن شریم کو اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا۔اور خدا پر بھروسہ تھا وہ ہر مشکل کا مقابلہ کرسکتا تھا۔

کہنے لگا۔''تم کسی درخت پر چڑھ جاؤ میں یہاں زمین پر ہی رہوں گا۔'' اس پر راج کماری نے بڑی بہادری سے کہا۔''اگر تم زمین پر رہو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گی درخت پر سانپوں کا بھی خطرہ رہتا ہے۔''

''ٹھیک ہے آؤ مل کر اچھی سی جگہ بناتے ہیں۔''انہوں نے چشمے کے پاس ہی ایک جگہ سے پتھر صاف کئے ادھر ادھر سے خشک گھاس اور گرے پڑے پتے لاکر دو بستر تیار کئے اور ان پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔شام کے سائے جنگل میں اتر آئے تھے خاموشی اور زیادہ گہری ہوگئی تھی درختوں کے نیچے اندھیرا دھیرے دھیرے پھیلنے لگا تھا اور پھر رات آگئی چاروں طرف تاریکی کا راج ہوگیا جنگل سنسان ہوگیا درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے بھی خاموش ہوگئے اس خاموشی میں صرف چشمے کا پانی کے بہنے کی آواز آرہی تھی۔

راج کماری دل میں خوف سا محسوس کررہی تھی مگر اوپر سے وہ ایسے باتیں کررہی تھی جیسے کوئی خوف نہ ہو۔

شریم اس کے دل کا حال جانتا تھا اور اس کی حفاظت کا عہد کئے ہوئے تھا۔راج کماری کو اس لئے بھی زیادہ تنہائی اور خوف محسوس ہورہا تھا کہ شریم اسے دکھائی نہیں دیتا تھا۔وہ صرف اس کی آواز سن سکتی تھی۔

''شریم بھائی کیا تم مجھے نظر نہیں آسکتے؟''

شریم ہنس پڑا۔''کاش ایسا کرنا میرے اختیار میں ہوتا میں مجبور ہوں راج کماری خدا جانے وہ وقت کب آئے گا جب میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک دوسرے کو نظر آسکوں گا۔'' راج کماری نے کوئی جواب نہ دیا پھر خاموشی چھاگئی اس خاموشی سے اسے پھر سے خوف ہونے لگا وہ چاہتی تھی کہ شریم اس سے باتیں کرے۔شریم بھی اب بولتے بولتے تھک گیا تھا اس نے راج کماری سے کہا۔

''سونے کی کوشش کرو بہن اور ڈرو نہیں میں تمہارے پاس ہی بیٹھا ہوں میں سوؤں گا نہیں تمہارا پہرہ دوں گا۔''

راج کماری نے کہا۔''تم باتیں کرتے جاؤ میں سونے کی کوشش کرتی ہوں۔'' راج کماری نے آنکھیں بند کرلیں اسے شریم کی آواز برابر آرہی تھی وہ پرانے مصر کی ہزاروں سال پرانی کوئی کہانی سنا رہا تھا اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور پھر وہ سوگئی۔

شریم راج کماری کو آہستہ سے آواز دی۔''راج کماری جی سوگئی کیا۔''راج کماری نے کوئی جواب نہ دیا۔وہ سو چکی تھی۔

شریم نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ اگلے روز جنگل میں پیدل سفر کرنا تھا اور اس کے لئے راج کماری کا آرام کرنا بہت ضروری تھا شریم کو سونے کی

کبھی ضرورت پیش نہ آئی تھی مگر وہ کبھی کبھی شوقیہ سوجایا کرتا تھا کمال کی بات تھی کہ سوتے میں اسے کسی چیز کی خبر نہ رہتی تھی اور اسے کوئی خواب بھی نہ آتا تھا آخری خواب شریم نے کافی پہلے دیکھا تھا بہرحال راج کماری گہری نیند سو رہی تھی اور اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی تھی۔

شریم خوش ہوگیا اس نے بھی ایک پتھر سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کرلیں خدا جانے کیا بات ہوئی کہ شریم کی بھی آنکھ لگ گئی حالانکہ وہ اس قسم کے حالات میں کبھی نہ سویا تھا لیکن قسمت میں جو ہونا تھا اسے تو ہوکر رہنا تھا شریم گھاس پر راج کماری سے پانچ فٹ کی دوری پر دوسری طرف منہ کیے سو رہا تھا وہ سوتے ہوئے کسی کو بھی نظر نہ آسکتا تھا لیکن جہاں وہ سویا ہوا تھا وہاں سے خشک گھاس اور پتے دب گئے تھے یہ کوئی اندھیرے میں غور سے دیکھتا تو اسے معلوم ہوجاتا تھا کہ کوئی یہاں سویا ہے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر نیند کی دنیا میں گم ہوچکے تھے۔

رات خاموش اور سنسان تھی جنگل کے درختوں اور جھاڑیوں سے اور زیادہ ڈراؤنا بنادیا تھا سوائے چشمے کے بہتے پانی کے وہاں اور کوئی آواز نہیں تھی پھر اچانک دور درختوں میں کوئی جنگلی پرندہ پھڑپھڑایا جیسے وہاں درختوں کے نیچے سے کوئی شیر یا چیتا گزرا ہو کیونکہ شیر عام طور پر آدھی رات کو ہی اپنے شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں جنگل میں بہت دور کسی ہاتھی کے بولنے کی آواز سنائی دی اس کے بعد پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔ چند لمحوں کے بعد ذرا قریب کے درختوں پر کوئی الو بول کر چپ ہوگیا ،فضا اور زیادہ ڈراؤنی ہوگئی ایسا محسوس ہوتا تھا کے کوئی شے ان کی طرف بڑھتی چلی آرہی ہوں۔ یہ کیا شے تھی اس کی کسی کو بھی کچھ خبر نہ تھی۔

یہ جنوبی ہند کے ایک پراسرار قبیلے کے دو جنگلی تھے جو آدھی رات کو انسانی بو پا کر ادھر کو بڑھے آرہے تھے یہ قبیلہ جنوبی ہند کے گھنے جنگلوں کا سب سے بدنام اور ظالم قبیلہ تھا یہ لوگ نہ صرف یہ کہ انسانی گوشت بڑے شوق سے کھاتے تھے بلکہ انسان کا سر کاٹ کر اسے سکیڑ کر بلی کے سر جتنا بنانے کا فن بھی جانتے تھے۔ انسانی سر کاٹ کر یہ پندرہ دن اس پر کوئی ایسا عمل کرتے کہ کٹا ہوا انسانی سر کی کھوپڑی ناک منہ اور کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہوتے بلی کے سر جتنی ہوجاتی پھر وہ انسانی سر کو اپنی جھونپڑی کے باہر لٹکاتے اور ان کا سردار اپنے گلے میں انسانی سکڑی ہوئی کھوپڑی کا ہار بھی شوق سے پہنتا تھا۔

دونوں جنگلی انسان کی تلاش میں ساحل سمندر کی طرف جارہے تھے جہاں کوئی نہ کوئی ماہی گیر انہیں مل جاتا تھا اور وہ اسے پکڑ کرلے جاتے تھے پہلے اس کا سر کاٹتے اور پھر اس کا گوشت اُبال کر کھاتے۔

اچانک چلتے چلتے انہیں ہوا میں انسانی بو محسوس ہوئی جنگلوں میں ہی ساری زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کے ناک بڑی تیز ہوگئی تھی اور یہ بڑی دور سے انسان کی بو سونگھ لیتے تھے انہوں نے کافی دور سے راج کماری اور شریم کے جسم کی بو سونگھ لی تھی اور وہ خونخوار درندوں کی طرح جھاڑیوں اور ندی نالوں پر سے ہوتے ہوئے اس چشمے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں راج کماری اور شریم گہری نیند سو رہے تھے۔

جنگلیوں نے اپنے ہاتھوں میں لمبے نیزے تھام رکھے تھے کاندھے پر تیر کمان لٹکے ہوئے تھے ان کے تیر زہر بھرے تھے اور نشانہ ایسا کہ اڑتی چڑیا کو مار گرالیتے تھے۔

جب انسانی بو زیادہ تیز ہوگئی تو دونوں جنگلی رینگ رینگ کر چلنے لگے۔ آخر وہ جھاڑیوں میں سے اس جگہ نکل آئے، جہاں چشمے کے پاس خشک پتوں پر انہوں نے ایک عورت کو لیٹے ہوئے دیکھا اگرچہ وہاں اندھیرا تھا مگر ان کی آنکھیں الوؤں کی طرح اندھیرے میں ہر چیز کو دیکھ لیتی تھی سوئی ہوئی راج کماری کو دیکھ کر ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں ہونٹ پھیل گئے اور لمبے لمبے زرد دانت باہر نکل آئے جب کوئی عورت مل جاتی ہے تو ان کے ہاں بڑی خوشی کی

جاتی ہے۔
اب وہ آہستہ آہستہ سوئی ہوئی راج کماری کی طرف بڑھنے لگے راج کماری ہلکے ہلکے نیند کے خراٹے لے رہی تھی اس سے ذرا ہٹ کر شریم سو رہا تھا مگر شریم ان جنگلیوں کو دکھائی نہ دے رہا تھا وہ چیتے کی طرح اپنی تھوتھنیاں زمین کے ساتھ لگائے۔ رینگتے ہوئے راج کماری کے سر کے اوپر آ گئے۔
ایک جنگلی نے اپنے ہاتھ میں کسی بوٹی کے رس کو اچھی طرح رگڑا اور پھر اپنا ہاتھ راج کماری کے منہ پر رکھ کر زور سے دبایا راج کماری ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی مگر چونکہ اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا اس لئے وہ کوئی آواز نہ نکال سکی جونہی اس نے ناک کے ذریعے سانس لی اس کے پھیپھڑوں میں ایک بڑی ہی تیز ناگوار بو گھسی جس کی وجہ سے اسے زبردست چکر آ گیا۔ راج کماری آواز نکالے بغیر بے ہوش ہو گئی۔
وحشی سے اسے گھسیٹ کر ایک طرف لے گئے انہیں کسی دوسرے انسان کی بو ابھی تک آ رہی تھی اشاروں اشاروں میں ایک وحشی نے دوسرے سے پوچھا۔
”یہ کس انسان کی بو ہے اور وہ انسان کہاں ہے؟“ دوسرے نے اشاروں ہی اشاروں کہا۔
”وہ یہاں تو کسی دوسرے انسان کو نہیں دیکھ رہا۔ مگر ان کے ناک جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے شریم ان سے کوئی دس فٹ کے فاصلے پر گھاس کے بچھونے پر سو رہا تھا مگر وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے جب انہیں وہاں کوئی دوسرا انسان دکھائی نہ دیا تو وہ بے ہوش راج کماری کو کندھے پر ڈال کر جنگل میں گم ہو گئے۔
جنگل آگے جا کر اتنا گنجان ہو گیا تھا کہ آدمی اس کے اندر بڑی مشکل سے چلتا تھا سانپ اس جنگل میں جگہ جگہ تھے اور درختوں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے مگر وحشیوں کو سانپ پکڑنے میں بڑی مہارت حاصل تھی یہ سانپ کو لپک کر پکڑتے اور اس کی گردن کاٹ کر پھینک دیتے اور باقی جسم مولی کی طرح بڑے شوق سے کھاتے سانپ بھی شاید اپنے دشمنوں کو پہنچاننے لگے تھے وہ بھی ان وحشیوں کے جنگلی اور گندے بالوں بھرے جسم سے اٹھنے والی تیز بو کو فوراً محسوس کر لیا کرتے تھے اور جہاں سے یہ گزرتے وہاں سے وہ بھاگ جاتے تھے۔
دونوں وحشی گنجان جنگل کے گھرے اندھیرے میں یوں آسانی سے جھاڑیوں میں گزرتے چلے گئے جیسے وہ کسی شہر کی گلیوں میں سے گزر رہے ہوں جنگل میں ایک جگہ پہاڑی ٹیلے کی سرنگ آ گئی۔
دونوں اس سرنگ میں داخل ہو گئے اس سرنگ میں گھرا اندھیرا تھا اور کونوں سے سانپوں کی سیٹیوں اور اژدھوں کی پھنکاروں کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن دونوں وحشی بے فکر ہو کر چلے جا رہے تھے ہاں تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ منہ سے سیٹی کی ایک عجیب سی آواز نکالتے جس کے بعد سانپوں اور اژدھوں کی آوازیں بند ہو جاتی تھیں سرنگ آگے جا کر ایک اور جنگل میں نکل آئی یہاں اچانک ایک بہت بڑا ریچھ ان کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا دونوں وحشی رک گئے انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا ایک وحشی راج کماری کو زمین پر لٹا دیا پھر دونوں تیر کمان لے کر زمین پر گھٹنا رکھ کر نشانہ باندھنے لگے۔ ریچھ زور سے غرایا اور ان کی طرف بڑھا انہوں نے زہریلے تیر اس کی طرف چلا دیئے دونوں تیر ریچھ کی گردن میں آ کر لگے تو ریچھ کی گردن میں زہر داخل ہو گیا یہ زہر اس قدر خوفناک اور تیز تھا کہ ریچھ منہ کے بل گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر اسی وقت ٹھنڈا ہو گیا۔
دونوں وحشی راج کماری کو اٹھا کر دوبارہ جنگل میں داخل ہو گئے وہ ایک ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگے نیچے دور ایک جگہ درختوں کے جھنڈ میں آگ کا الاؤ روشن تھا اور شعلوں کی روشنی میں وہاں کے درختوں کے تنے چمک رہے تھے یہاں ان خونخوار وحشیوں کا قبیلہ رہتا تھا انہوں نے الاؤ کے پاس جاتے ہی کھڑے ہو کر منہ سے ایک خاص قسم کی آواز نکالی اور ارد گرد کی تنگ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں سے مرد اور عورتیں

www.urdusoftbooks.com

شور مچاتے باہر نکل آئے انہوں نے راج کماری کو دیکھا تو خوشی سے ناچنے لگے۔

سردار بھی اپنی جھونپڑی سے سر پر سینگوں والا تاج پہنے باہر نکل آیا سب وحشی خاموش ہو کر جھک گئے سردار نے بے ہوش راج کماری کے منہ پر ایک خاص قسم کی دوائی چھڑکی تو تھوڑی ہی دیر میں راج کماری کو ہوش آ گیا اس نے جو آگ کی روشنی میں اپنے اردگرد وحشیوں کو دیکھا تو خوف سے اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

سردار نے راج کماری کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کی کھوپڑی پر ہاتھ پھیر کر اپنی زبان میں وحشیوں سے بولا۔

"یہ کھوپڑی نرم ہے ایک ہفتے میں سکڑ جائے گی۔" راج کماری نے اپنے بال چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں راجہ کی بیٹی ہوں مجھے چھوڑ دو۔"

کوئی بھی وحشی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا انہوں نے راج کماری کی چیخ پکار کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔

"پہلے میں اس کے ساتھ شادی کروں گا پھر اس کا سر کاٹ کر اپنے گلے میں ڈال لوں گا۔" سردار نے کہا۔

"کل رات ہماری شادی ہوگی پرسوں میں خود اس کی گردن کاٹوں گا اور اس نیزے پر رکھ کر آگ میں بھونوں گا۔"

یہ سن کر وحشی نعرے لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے وہ روتی ہوئی راج کماری کو اٹھا کر لے گئے اور ایک برگد کے گھنے درخت کے نیچے بنے ہوئے جھونپڑے میں جا کر قید کر دیا چار وحشی جھونپڑی کے اردگرد پہرہ دے رہے تھے راج کماری جھونپڑی میں جاتے ہی سسکیاں بھر کر رونے لگی اسے شریم اور اپنے ماں باپ کی یاد آ گئی اور وہ غم سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی لیکن وہاں اس کے آنسوؤں میں ترس کھانے والا کوئی بھی نہیں تھا تھک ہار کر وہ گھاس پر نیم بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

دوسری طرف اچانک ہی شریم کی آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا کہ راج کماری وہاں سے غائب ہے پہلے تو وہ سمجھا کہ راج کماری شاید چشمے پر پانی پینے کے لئے گئی ہوگی اٹھ کر اس نے چشمے پر بھی دیکھا وہاں بھی وہ نہیں تھی شریم نے اردگرد ساری جنگل میں راج کماری کو تلاش کیا اسے آوازیں دیں مگر سوائے الوؤں کی آواز کے کسی نے بھی جواب نہ دیا۔

الو بھی شریم کو شاید یہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وحشی راج کماری کو پکڑ کر لے گئے ہیں لیکن شریم الو کی زبان نہیں سمجھتا تھا مگر ناگن جانوروں کی بولی سمجھ لیتی تھی لیکن ناگن تو شریم سے ہزاروں میل دور پرتگالی جہاز پر پڑتال کی طرف سفر کر رہی تھی اور شاہان بے چارہ ابھی تک سمندر کے بیچ میں پہاڑ کی چوٹی والے پراسرار نقاب پوشوں کے محل کے تہہ خانے کے کنویں میں پڑا باہر نکلنے کی تدبیر سوچ رہا تھا اور عمارہ کا بے ہوش جسم اسی تہہ خانے کے کونے میں رکھے ایک تابوت میں بند تھا۔

ادھر شریم بہت پریشان تھا۔ راج کماری کا اچانک غائب ہو جانا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا "کہیں اسے کوئی درندہ اٹھا کر نہ لے گیا ہو لیکن اگر درندہ اٹھا کر لے جاتا تو راج کماری ضرور چیخ مارتی اور شریم جاگ پڑتا یہ اتنی خاموشی اور اس پراسرار طریقے سے اسے کون اغوا کر کے لے جا سکتا ہے۔"

جنگل میں اندھیرا ہو گیا تھا اور آسمان پر چاند نکل آیا تھا جس کی روشنی شاخوں کے پتوں سے چھن چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی اس روشنی میں شریم نے دیکھا کہ جن پتوں پر راج کماری لیٹی ہوئی تھی وہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اور کہیں کہیں سے روندے گئے تھے شریم بہت ذہین تھا اس کی نظروں سے ایسے واقعات گزر چکے تھے وہ سمجھ گیا کہ یہاں کے جنگلی لوگ رات کو آ کر سوئی ہوئی راج کماری کو اٹھا کر لے گئے اور انہوں نے ضرور راج کماری کو کسی جنگلی بوٹی کی دوائی سونگھا کر پہلے بے ہوش کیا ہوگا شریم نے گھاس پر وحشی آدمیوں کے پاؤں

کے نشان بھی دیکھ لئے تھے وہ ان نشانوں کے تعاقب میں اس طرف روانہ ہوگیا۔

شریم اندازے سے آگے بڑھ رہا تھا کیونکہ گھاس پر جنگلیوں کے پیروں کے نشان اب کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

شریم اگرچہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر اس کے وجود کو جنگلی جانور اور کیڑے مکوڑے بڑی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

شریم جنگل میں آگے ہی آگے چلتا چلا گیا کافی آگے جا کر ایک بہت بڑا اژدھا اس کے راستے کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا شریم اس کے قریب سے ہو کر گزرنے لگا تو خدا جانے اژدھے کو کیسے محسوس ہوا کہ کوئی انسان اس کے پاس سے گزر رہا ہے اژدھے نے زور سے پھنکار ماری اور اس کے منہ سے آگ کے شرارے نکلنے لگے۔

شریم نے اژدھے کو کچھ بھی نہ کہا اور آگے کو روانہ ہوگیا آگے جا کر ایک ٹیلا آ گیا جس کے نیچے ایک سرنگ کا منہ کھلا ہوا تھا شریم وہاں کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ وہ سرنگ کے اندر جائے یا ٹیلے کی دوسری طرف سے ہو کر نکل جائے اس کے دماغ نے اہم فیصلہ کیا۔

اور وہ سرنگ کے اندر داخل ہوگیا انسان کی نیت نیک ہو اور دل میں دوسرے انسانوں کی بھلائی کا خیال ہو تو اللہ پاک دل میں نیک اور صحیح خیال ڈال کر رہنمائی کرتا ہے۔

ایسا ہی شریم کے ساتھ ہوا کیونکہ اس کا بھی دل صاف تھا اور نیت نیکی کی تھی وہ بغیر کسی غرض کے راج کماری کی مدد کر رہا تھا اگر کوئی خیال تھا تو صرف انسانی ہمدردی کا۔

سرنگ میں اندھیرا تھا لیکن شریم ایسے کئی اندھیری سرنگوں سے گزر چکا تھا یہ سرنگ اس کے لئے کوئی نئی سرنگ نہ تھی وہ آگے بڑھتا چلا گیا اندھیرے میں کافی دیر چلنے کے بعد شریم نے سرنگ میں روشنی کا دھندلا سا دھبہ دیکھا جو کہ کافی بڑا ہوتا چلا گیا یہاں سرنگ ختم ہو جاتی تھی اس سے آگے ٹیلے کے پار وحشیوں کی بستیاں تھیں۔

راج کماری بھی وہاں ہی قید تھی یہاں پہنچتے پہنچتے پو پھٹنے لگی اور آسمان پر نیلی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی شریم کو ابھی تک کوئی جنگلی بستی نظر نہیں آئی تھی وہ کچھ ناامید سا ہو گیا تھا کہ شاید وہ غلط طرف نکل آیا ہے اور اسے جنگل میں دوسری طرف جانا چاہئے تھا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں کالے ریچھ نے وحشیوں پر حملہ کیا تھا اور ریچھ ان کے تیر کھا کر مر گیا تھا اس جگہ ریچھ کی لاش پڑی تھی جس پر لاکھوں چیونٹیاں رینگ رہی تھیں شریم ریچھ کے پاس سے ہٹ کر آگے گزر گیا یہاں اس سے غلطی ہوگئی بجائے اس کے کہ وہ سامنے والے درختوں سے ہو کر ٹیلے کی طرف جاتا وہ مرے ہوئے ریچھ کی لاش کے پہلو سے ہو کر دوسری طرف نکل گیا۔ جدھر سے پانی کے چشمے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی اس کا خیال تھا کہ جہاں چشمہ ہوگا وہاں وحشیوں کی آبادی ضرور ہوگی اس طرف چھوٹی چھوٹی چٹانیں ضرور کھڑی تھیں جن کی دیواروں پر گہری سبز اور سیاہ کائی جمی ہوئی تھی۔

صبح کی ہلکی روشنی نے جنگل کے اندھیرے کو دور کر دیا تھا جنگل کی ہر چیز نظر آنے لگی تھی۔

شریم ایک چشمے پر آ کر رک گیا اور جسے وہ چشمہ سمجھ رہا تھا وہ ایک چٹان کی دراڑ تھی جس کے اندر سے پانی کے قطرے نیچے چھوٹے تالاب میں گر رہے تھے۔

شریم نے ایک جھرجھری سی لی اور ایک پتھر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ کہیں وہ غلط سمت کو تو نہیں نکل آیا۔

اتنے میں اسے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی جھاڑیوں میں سے گزر کر اس چٹان کی طرف آ رہا ہو جس کے پاس وہ بیٹھا ہوا تھا اس نے جھاڑیوں کی طرف دیکھا تو ایک جگہ جھاڑیاں ہل رہی تھی کوئی ادھر کو ہی آ رہا تھا شریم کو تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا ویسے تو شریم کو تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا وہ اسی جگہ بیٹھا رہا اتنے میں جھاڑی سے ایک وحشی باہر نکلا شریم

www.urdusoftbooks.com

نے اسے دیکھا۔

اب اس کی ہمت بندھی کہ راج کماری کا پتہ چل جائے گا وہ اس جنگلی کا پیچھا کرے گا راج کماری ضرور ان جنگلیوں کی قید میں ہوگی شریم غور سے وحشی کو تکنے لگا وحشی چٹان والے پانی کی طرف آ رہا تھا شاید وہ پانی پینے آیا تھا۔

اتنے میں اچانک شیر کی دھاڑ گونجی تو وحشی جہاں تھا وہیں کا وہیں کھڑا ہوگیا شریم بھی چونکنا ہوگیا شیر تالاب پر پانی پینے آ رہا تھا وحشی نے پیچھے ہٹ کر ایک درخت کی آڑ لی اور نیزے پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی اتنے میں ایک دھاری دھار شیر درختوں میں سے نکلا اور تالاب پر آ کر رک گیا۔

فضاء میں شیر نے بھی انسانوں کی بو سونگھ لی تھی۔

شیر نے خطرہ محسوس کر لیا تھا وحشی نے یہاں ایک زبردست حماقت کی کہ نیزہ لے کر درخت کی آڑ سے باہر نکل آیا اور شیر کو للکارا یہ اس کی بہادری بھی تھی شیر نے جو اپنے پیچھے ایک نوجوان کی للکار سنی تو پلٹ کر دیکھا۔

اور وہ دھاڑا اور ست کر جو اس نے چھلانگ لگائی تو سیدھا وحشی کے اوپر جا گرا اور وحشی کو دبوچ لیا اس کی کھوپڑی کو دانتوں سے چباڈالا لیکن وحشی کا نیزہ بھی شیر کا کام کر چکا تھا نیزہ شیر کے پیٹ میں پیوست ہو کر دوسری طرف سے آر پار ہوگیا تھا تھوڑی دیر بعد دونوں نے دم توڑ دیا شریم اس خونی کھیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور اس قسم کا بہادرانہ کھیل اسے بہت پسند تھا۔

شریم اپنی جگہ سے اٹھا اور اس طرف روانہ ہوگیا جدھر سے وحشی آیا تھا اس کا خیال تھا کہ وحشیوں کی جھونپڑی اسی طرف ہوگی لیکن یہ بھی اس کی بھول تھی جنگل کے وہ جس راستے پر چلا جا رہا تھا وہ ایک بہت ہی چالاک جادوگر کے غار کی طرف جاتا تھا اس جادوگر کا نام نگوتا تھا وہ جادو کے زور سے آدمی کو پتھر کا بنادیتا جانور بنادیتا تھا وہ روحوں کو آتے جاتے دیکھ لیتا تھا اس وقت نگوتا اپنے غار کے باہر آگ جلائے ہوئے اور آنکھیں بند کئے کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔

شریم جنگل میں چلتے چلتے جب اس غار کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک کالا کلوٹا بن مانس قسم کا آدمی جو کہ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا سر پر مرغ کے پروں کا تاج پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔

شریم نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ اس آدمی نے راج کماری کو غار میں چھپا رکھا ہوگا شریم اس آدمی کی طرف بڑھا کہ اس ادمی کے پیچھے سے ہو کر غار کے اندر جائے اور راج کماری اگر وہاں ہو تو ساتھ لے آئے۔

شریم درختوں کے پیچھے سے نکل کر غار کے سامنے آیا تو جادوگر کو فوراً ہی پتہ چل گیا کہ یہ کوئی غیبی روح ہے اور سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے بھی جادو کے ضرور سے اسے دیکھا تھا۔ جادوگر نے اب ایک چال چلی وہ چپکے سے بغیر کوئی حرکت کئے آگ کے پاس بیٹھا رہا۔

جیسے اس نے شریم کو دیکھا ہی نہیں۔ شریم بڑے مزے اور بے فکری سے ناگو کے پاس سے گزر کر غار کے اندر چلا گیا۔ غار کے اندر جادوگری کا سامان پڑا ہوا تھا الو کا سر انسانی کھوپڑی کوے کی چونچ شیر کے پنجے اور ریچھ کے ناخن اور ہڈیوں کی مالائیں وہ سمجھ گیا کہ یہ شخص کوئی جنگلی جادوگر ہے۔ اور اپنے جھوٹ موٹ کے جادو سے جنگلی لوگوں پر اثر ڈال کر ان سے کھانے پینے کی چیز اینٹھ لیتا ہوگا۔ راج کماری غار کے اندر نہیں تھی شریم باہر آ گیا۔

ناگو آگ کے پاس اکڑو بیٹھا خالی آنکھوں سے شریم کو دیکھ رہا تھا۔ شریم کچھ دیر غار کے پاس کھڑا جنگل کی طرف دیکھتا رہا وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اب کس طرف جائے اور راج کماری کو تلاش کرے دن ڈھل رہا تھا اور شام سر پر آ رہی تھی اسے معلوم تھا کہ رات اگر سر پر آ گئی۔ تو پھر اتنے گھنے جنگل میں راج کماری کو تلاش کرنا مشکل کام تھا۔ ناگو نے تھیلے میں سے کچھ ہڈیوں کے ٹکڑے نکال کر اپنے سامنے زمین پر پھینکے جیسے وہ کوئی فال نکال رہا ہو ہڈیوں کے زمین پر گرنے

کی آوازسن کر شریم ناگو کے قریب آ گیا۔

اس وقت ناگو زمین پر گری ہوئی ہڈیوں کو تک رہا تھا پھر اس نے وہ ہڈیاں اٹھالیں۔ تھوڑی دیر بعد چار ہڈیاں اور اٹھالیں شریم کو شرارت سوجی اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر زمین پر سے باقی ہڈیاں اٹھالیں ہڈیاں اس کے ہاتھ میں جاتے غائب ہوگئیں وہ مسکرا رہا تھا ناگو شریم کو اپنے پاس بیٹھا صاف دیکھ رہا تھا وہ اس طرح سے مگن تھا جیسے وہ شریم کو نہیں دیکھ رہا شریم بھی خوش تھا کہ اس نے ناگو کو پریشان کیا ہے۔ شریم نے چاروں ہڈیاں دوبارہ زمین پر گرادیں، ناگو انہیں اٹھانے لگا تو شریم نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر ہڈیوں کو غائب کردیا اس کا خیال تھا کہ ناگو حیرت سے دنگ رہ جائے گا مگر اس پر جیسے کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ شریم کو تعجب ہوا کہ اس شخص پر ہڈیوں کے اچانک غائب ہونے پر اثر کیوں نہیں ہوا شریم ہاتھ میں یہ ہڈیاں تھامے یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ناگو نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ شریم کو دیکھ رہا ہو شریم گھبرا گیا ناگو نے کہا۔ ''میری ہڈیاں واپس کردو۔''

اب تو شریم کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

کتنے ہی سالوں کے بعد یہ موقع آیا تھا کہ کسی نے شریم کو دیکھ لیا تھا اس نے جھٹ ہڈیاں ناگو کے آگے پھینک دیں اور حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا...... کیا تم مجھے دیکھ رہے ہو......''

''کیوں نہیں تم ایک سانولے اور خوب صورت لڑکے ہو اور تمہارے کپڑے آج سے کافی برس پہلے کے زمانے کے ہیں تمہارا نام کیا ہے۔'' اب تو شریم پریشان ہوگیا۔ اسے ایک دم خیال آیا کہ کہیں اس پر جادو کا اثر ختم تو نہیں ہوگیا کہ اب ایسا تو نہیں ہے کہ اب ہر کوئی اسے دیکھے گا اس نے ناگو سے کہا۔ ''تم نے مجھے کیسے دیکھ لیا میرا نام شریم ہے۔''

ناگو نے کہا۔ ''میں اس علاقے کا سب سے بڑا جادوگر ہوں میرے اس جادو کی اتنی طاقت ہے کہ میں جن بھوت بدروح اور ڈائن کو دیکھ سکتا ہوں۔'' شریم ناگو سے ذرا دور ہٹ گیا اب وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا کیونکہ نظر آنے کے بعد وہ ایک عام اور کمزور لڑکا بن گیا تھا۔

اور اسے ناگو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ناگو نے شریم کو کھسکتے ہوئے دیکھا تو اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

''شریم تم یہاں سے بھاگ نہیں سکتے۔ میرے جادو نے تمہارے سب راستے بند کردیئے ہیں۔ تمہارے اندر اب پہلے والی طاقت نہیں رہی۔ تم اب عام کمزور لڑکے بن چکے ہو اس لئے بہتر یہی ہے کہ جس طرح میں کہتا ہوں ویسے ہی کرو۔'' شریم نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی تو اسے ایسا لگا جیسے اس کے چاروں طرف درختوں کو آگ لگی ہو اور وہ اس آگ میں سے باہر نہیں نکل سکتا تھا وہ اپنے آپ کو پہلی بار مجبور محسوس کرنے لگا۔ ناگو نے کہا۔

''میرے ساتھ اس غار کے اندر چلو۔''

شریم نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔''

ناگو بڑی مکاری سے بولا۔ اس کے ٹیڑھے دانت آگ کی روشنی میں چمکنے لگے۔ ''یہ ایک راز ہے اور یہ راز میں تمہیں غار کے اندر جاکر بتادوں گا ایک بات یاد رکھنا تم اب یہاں سے بھاگ نہیں سکتے اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ آگ جو تمہیں جنگل کے درختوں پر نظر آرہی ہے وہ تمہیں جلا کر راکھ کردے گی یہ میرے جادو کی آگ ہے اور اس کا وار کبھی خالی نہ گیا بولو اب تم کیا کہتے ہوں۔'' شریم نے ہتھیار پھینک دیئے وہ ناگو کے شکنجے میں بری طرح پھنس گیا تھا۔ اسے جنگل کی طرف سے آگ کے شعلے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔ اس نے جھٹ کہا۔

''تم جیسا کہوگے میں ویسا ہی کروں گا میں تمہارے غار میں جارہا ہوں اور شریم سر جھکائے ایک بے بس قیدی کی طرح غار کے اندر چلا گیا۔

غار میں جہاں جادوگر کا سامان رکھا تھا۔ وہاں ایک دیا جل رہا تھا اس کی روشنی بھیانک اور ڈراؤنی تھی کھوپڑیوں کے سائے سامنے دیوار پر پڑ رہے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ناگو بھی غار کے اندر آ گیا۔ اس

نے آتے ہی پتھر کے چبوترے پر سے ایک کھوپڑی اٹھا کر اس کے اندر بیٹھے ہوئے مکڑے کو باہر نکالا اور اسے ہوا میں شریم کی طرف اچھال دیا مکڑے نے بجلی جیسی تیزی کے ساتھ فرش سے لے کر چھت تک شریم کے آگے ایک جالا بن دیا ناگو نے مکڑے کو پکڑ کر واپس کھوپڑی میں ڈالا اور شریم کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اسے تم مکڑے کا کمزور جالا مت سمجھنا یہ اتنا مضبوط ہے کہ اگر ساری رات سارا دن اس پر تلوار کا وار کرتے رہو تو یہاں سے نکل کر باہر نہیں جاسکتے۔ یہ جال لوہے کی تاروں سے بھی مضبوط ہے۔" شریم نے تار کو ہاتھ لگایا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس نے فولاد کے موٹے تاروں پر ہاتھ لگا رہا ہو۔

جال اپنی جگہ پر فولاد کا جنگلہ بن کر اس کے سامنے آن گرا تھا اور وہ اس کے اندر قید ہو کر رہ گیا تھا۔ شریم پہلے مکا مار کر ہاتھی کی گردن توڑ دیا کرتا تھا لیکن اس کے جسم میں وہ اب طاقت نہ رہی تھی وہ اب اپنے آپ کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا اس نے زچ ہو کر ناگو سے کہا۔

"آخر تم نے مجھے یہاں کیوں قید کرلیا ہے تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔" ناگو نے کہا۔

"ابھی بتاتا ہوں پھر وہ انسانی کھوپڑی کو اٹھا کر اس پر آنکھیں بند کر کے کوئی منتر پڑھتا رہا۔

منتر پڑھ کر کھوپڑی میں پھونک ماری تو وہ کھوپڑی ہڈیوں کا پورا ڈھانچہ بن گئی اس ڈھانچے کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اور وہ فولادی جال کے آگے کھڑا ہو کر پہرہ دینے لگا ناگو نے ڈھانچے کو حکم دیا۔

"اس لڑکے کی پہرہ داری کرنا اگر اس نے کسی طریقے سے بھاگنے کی کوشش کی تو اس کی گردن ایک پل کے اندر اندر اتار دینا۔" ہڈیوں کے ڈھانچے نے ہوا میں زور سے تلوار لہرا کر اپنی سر کی کھوپڑی لہرائی۔ اور اس کے منہ کے سوراخ میں سے آواز آئی۔

"میں اس کی گردن کاٹ دوں گا......" اور ڈھانچہ کھڑا کھڑانے لگا۔ شریم ڈر گیا اتنی مدت بعد اسے کسی شے سے ڈر محسوس ہوا تھا وہ سچ مچ بہت کمزور ہو گیا تھا ناگو نے شریم کے پیر میں لوہے کی ایک زنجیر ڈال دی اور زنجیر کو پتھر میں جکڑ دیا۔ "آخر تم مجھے کس لئے قید کر رہے ہو۔" شریم نے تنگ آ کر پوچھا۔

"اس لئے کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔" ناگو مکاری سے ہنسا۔ شریم سر پکڑ کر پتھروں پر بیٹھ گیا خدا نے ضرور اس کے کسی بڑے بول کی سزا دی تھی اس نے دل ہی دل میں خداوند کریم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور دعا کی کہ وہ اسے پھر اس کی طاقت دے دے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

ناگو نے کہا۔ "شریم میں جادوگروں کے بادشاہ افراسیاب کا ایک طلسم کر رہا ہوں اس طلسم کی کامیابی کے بعد میں سارے افریقہ کے جن بھوت اور بدروحوں کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ لیکن اس طلسم کی ایک شرط تھی جو مجھ سے پوری نہیں ہو رہی تھی کہ کسی ایسے لڑکے کا سر کاٹ کر میں اس کا خون کالی بلی کو پورے چاند کی رات کو پلاؤں جو لڑکا کسی کو دکھائی نہ دیتا ہوں میں ایک عرصے سے ایسے لڑکے کی تلاش میں تھا یہ تو اچھا ہوا کہ تم خود ہی غار میں آ گئے اب میں تمہیں ہرگز ہرگز نہ چھوڑوں گا دو روز بعد پورے چاند کی رات ہے۔ اور میں اس رات کو تمہاری گردن کاٹ کر تمہارا خون کالی بلی کو پلاؤں گا۔ اور پھر سارے افریقہ کے جن بھوت اور بدروحیں میرے قبضے میں آجائیں گی۔ اور ناگو مکروہ انداز میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا شریم اس کی باتیں سن کر سمجھ گیا کہ یہ شخص اس کو زندہ نہ چھوڑے گا اب دنیا کی کوئی طاقت اسے اس ظالم انسان سے نہیں بچا سکتی اسے راج کماری کا خیال آ گیا کہ جانے وہ کس حال میں ہو گی اس نے ناگو سے کہا۔

"میں تمہارے قبضے میں آ گیا ہوں اب بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا کیا تم میری بہن راج کماری کے بارے میں بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟" ناگو نے ہڈیاں پھینک کر زمین پر دو لکریں بنائیں اور اپنی لال لال آنکھیں اٹھا کر بولا۔

"راج کماری اس وقت اس جنگل کے سب

سے خوف ناک وحشی قبیلے کے قبضے میں ہے اور وہ لوگ آج رات کے آخری حصے میں اس کا سر کاٹ کر اس کی کھوپڑی سیکڑنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

شریم کانپ گیا...... یا خدا وہ دونوں کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں اس سے تو بہتر تھا کہ ہم ہندوستان کے اس ساحل پر نہ آتے یہاں آتے ہی دونوں کی جان خطرے میں پڑ گئی ہے بلکہ اب تو یہ کہنا چاہئے کہ زندگی کے چراغ کی لو ٹمٹما رہی ہے زندگی کوئی دم کی محتاج ہے۔" ناگو سے شریم نے کہا۔

"کیا تم میری بہن کی جان بچا سکتے ہو۔" ناگو نے دانت نکال کر کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا کہ میں اپنے دوست وحشی قبیلے کے سردار کے خلاف کوئی کام کیسے کر سکتا ہوں بلکہ میں تو تمہاری بہن کی ہڈیاں حاصل کر کے اس کا ہار بنا کر گلے میں ڈالوں گا کیونکہ جوان لڑکی کی ہڈیاں ہمارے طلسم کو زیادہ طاقتور بناتی ہے......" شریم خاموش ہوگیا اس شیطان سے انسانی ہمدردی کی امید رکھنا فضول تھا شریم نے شاہان اور ناگن کو بہت یاد کیا خدا جانے کہ وہ کہاں چلے گئے ہیں کاش انہیں خبر ہو جائے کہ ان کا بھائی شریم کس مصیبت میں پھنس گیا ہے اور صرف دو دن کا مہمان ہے پورے چاند کی رات کو اس کا سر کاٹ دیا جائے گا اور اس کے جسم کے بہتے لہو کو کالی بلی چاٹ رہی ہوگی۔

رات ڈھل رہی تھی مگر رات کی خاموشی اور اندھیرا جنگل میں اس طرح چھایا ہوا تھا۔ ادھر راج کماری جھونپڑی میں قید تھی وہ جاگ رہی تھی اس کی جھونپڑی کے باہر چار وحشی چل پھر کر پہرہ دے رہے تھے راج کماری کی موت اس کے سامنے کھڑی تھی آخر وہ راجہ کی بیٹی تھی اس کی شاہی خون کھول اٹھا اور اس نے زندگی بچانے کے لئے آخری داؤ لگانے کا فیصلہ کر لیا مرنا تو تھا ہی اسے تو پھر کیوں نہ ایک بار فرار ہونے کی بھرپور کوشش کی جائے راج کماری نے جھونپڑی کے بانسوں میں سے باہر دیکھا ایک جنگلی عورت راج کماری کے لئے کوئی شے تھال میں لئے اس کی جھونپڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جنگلی عورت راج کماری کی جھونپڑی میں داخل ہوئی اسے کسی نے نہ روکا راج کماری کی آج گردن اتار دی جانے والی تھی اور یہ جنگلی عورت سردار کی جانب سے ایک رسم پوری کرنے آئی تھی جو کہ بہت ضروری تھی اس رسم میں ہلاک ہونے والی کنواری لڑکی کے گلے میں قتل ہونے والی رات کے پچھلے پہر سرخ گلاب کے پھولوں کی مالا پہنائی جاتی تھی آج راج کماری کے قتل کی رات تھی آج صبح صبح اسے ہلاک کر دیا جانا تھا۔ چنانچہ سردار نے رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں ایک جنگلی عورت کو گلاب کی مالا دے کر راج کماری کے پاس بھیجا تاکہ آخری رسم پوری کر سکے۔ جنگلی عورت کو دیکھتے ہی راج کماری کے دل میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا۔

اور اس نے اس خیال کو پورا کرنے کا اسی وقت فیصلہ کر لیا معلوم ہوا کہ جنگلی عورت گونگی ہے اور صرف غوں غاں میں ہی بات کرتی ہے جھونپڑی میں اس وقت سوائے راج کماری اور اسی جنگلی عورت کے اور کوئی نہیں تھا۔

جنگلی عورت نے تھال میں سے گلاب کے پھولوں کا ہار اٹھایا۔ اور آگے بڑھ کر راج کماری کے گلے میں ڈال دیا اور پھر غوں غاں کر کے ہنسنے اور خوش ہونے لگی اور پھر اس نے ہاتھ سے اپنی گردن کی طرف ایسا اشارہ کیا جیسے چھری پھیر رہی ہو گویا راج کماری سے کہہ رہی تھی کہ صبح اس کی گردن کاٹ دی جائے گی اور کھوپڑی آگ میں ڈال کر چھوٹی کر دی جائے گی اور پھر خود بھی ہنس پڑی گویا راج کماری کی ہونے والی موت پر خوش ہو رہی ہو۔ راج کماری کے جسم میں خدا جانے کہاں سے یہ پھرتی یہ جرأت یہ طاقت آ گئی تھی شاید اس لئے بھی کہ جب چراغ بجھنے والا ہوتا ہے تو بڑی زور سے بھڑکتا ہے راج کماری نے جنگلی عورت کو اشارے سے قریب بلایا جب وہ قریب آئی تو چیتے کی طرح اچھل کر اس کی گردن کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اتنی مضبوطی سے دبوچ لیا کہ جنگلی عورت کے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہ نکل سکی یہ راج کماری چاہتی تھی

اگر ذرا سی بھی آواز نکل جاتی تو اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل جانا تھا یہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا اس جنگلی عورت راج کماری کے ہاتھوں کو اپنے ناخنوں سے نوچ رہی تھی لیکن راج کماری کی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی ہونے کے بجائے اور زیادہ سخت ہو رہی تھی راج کماری تو جیسے زیادہ خونخوار شیرنی بن گئی تھی جنگلی عورت کا گلا بند ہو گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں اور ایک منٹ کے اندر اندر اس کا دل بھی بند ہو گیا یہ سارا کام ڈیڑھ منٹ میں ہو گیا تھا کوئی آواز نہیں نکلی تھی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی جھونپڑی کا دیا اسی طرح جل رہا تھا باہر اسی طرح وحشی پہرہ دے رہے تھے رات اسی طرح ڈھل رہی تھی ہر طرف ویسی ہی خاموشی تھی کسی کو معلوم تک نہ ہو سکا تھا کہ ان کے قبیلے کی ایک جنگلی عورت کم ہو گئی ہے اور اس کی لاش جھونپڑی کے اندر پڑی ہے اور راج کماری بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے راج کماری کی اسکیم کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا اور بڑی کامیابی سے مکمل ہو گیا تھا اب اس کی اسکیم کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا اس نے جلدی جلدی اپنے سارے کپڑے اتار کر کونے میں پھینک دیئے پھر جنگلی عورت کی لاش کے کمر کے گرد بندھی ہوئی کیلے کے پتے اتار کر اپنی کمر کے گرد باندھے اور اپنے گلے کا گلاب کا ہار اتار کر پھینک دیا جنگلی عورت کے گلے سے منکوں اور ہڈیوں کی مالائیں اتار کر اپنے گلے میں ڈالی۔ مٹی کے دیئے کے نیچے سے کالک نکال کر اپنے جسم اور چہرے پر زور زور سے ملا جس سے راج کماری کا رنگ سیاہ ہو گیا سر کے بالوں کو بکھیر کر جنگلی عورت کے بالوں کی طرح بنایا۔ زمین پر سے مٹی اٹھا کر اپنے جسم پر ڈالی کچھ بالوں میں ڈالی گویا بالکل میلی کچیلی کالی کلوٹی وحشی عورت بن گئی راج کماری کی اسکیم کا اب سب سے آخری مرحلہ اور سب سے خطرناک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ اس نے تھال اٹھا کر سر پر رکھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ جھونپڑی سے باہر آ گئی چاروں پہرے دار رات کے کم ہوتے اندھیرے میں باری باری پہرہ دے رہے تھے اور اس کے قریب سے گزرے کسی نے اس پر شک نہ کیا وہ بھی سمجھے کہ جنگلی عورت راج کماری کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر یعنی موت کا ہار پہنا کر ایک ضروری رسم پوری کر کے واپس جا رہی ہے۔

راج کماری تھالی اپنے سر پر اٹھا رکھی تھی اور جنگلی عورت کی طرح اٹھلا اٹھلا کر چلتی پہرہ دینے والے وحشیوں کے قریب سے گزری ایک ذرا سی غلطی ایک ذرا سا غلط قدم اسی وقت اس کی موت کی وجہ بن سکتا تھا چاروں طرف سے خنجر اور نیزے اس کے جسم میں آر پار ہو سکتے تھے لیکن راج کماری بہت حوصلے اور ہمت سے کام لے رہی تھی وہ ہر حالت میں زندہ رہنا چاہتی تھی اور اپنے ماں باپ سے ملنا چاہتی تھی ماں باپ کی محبت اور ان سے ملاقات کرنے کی شدید خواہش تھی اور اسی خواہش نے راج کماری کے جسم میں فولادی طاقت بھر دی تھی وہ درختوں کے نیچے سے واپس جا رہی تھی کہ ایک وحشی نے اسے چھیڑا اور ہنسا جنگلی عورت یعنی راج کماری نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہنستے ہوئے غوں غاں کیا اور بھاگ گئی وحشی ایک پل کے لئے بڑا حیران ہوا کہ اس عورت کو آج کیا ہو گیا ہے کیونکہ اس سے پہلے کبھی اس نے ایسی حرکت نہ کی تھی وہ جب بھی اسے چھیڑتا تھا وہ اس کے منہ پر ایک زبردست تھپڑ مار دیا کرتی تھی وحشی کا دماغ کچھ نہ سمجھ سکا اور اپنی راہ ہو لیا راج کماری اب بڑے سردار کی جھونپڑی کے سامنے سے ہو کر گزر رہی تھی جھونپڑی کے باہر دو وحشی تلواریں لئے پہرہ دے رہے تھے اندھیرے کی وجہ سے وہ راج کماری کو نہ پہچان سکے انہوں نے اسے جنگلی عورت ہی خیال کیا اور خاموش آنکھوں سے جنگل میں عورتوں کی جھونپڑیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔

راج کماری جھونپڑی سے نکل گئی آگے درختوں کا گھنا جنگل شروع ہوتا تھا یہاں آ کر اس نے ایک طرف بے تحاشہ بھاگنا شروع کر دیا بھاگتے بھاگتے دن چڑھ آیا درختوں میں سے دن کی روشنی چھن چھن کر جنگل میں آنے لگی راج کماری نے صرف کمر کے گرد کیلے کی

ٹہنی لپیٹ رکھی تھی اسے کوئی دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ جنگلی وحشی کی بیوی یا بہن جنگل میں جارہی ہے اس کا سارا جسم کالا ہورہا تھا بال بکھرے ہوئے تھے اوران میں مٹی جمی ہوئی تھی اب تو وہ یوں لگ رہی تھی جیسے جنگل میں بدروح چلی جارہی ہوں راج کماری بھاگتے بھاگتے چلتے چلتے اس جگہ پہنچ گئی جہاں شریم اور وہ سوئی ہوئی تھی اس نے دیکھا کہ شریم وہاں نہیں تھا چشمے کا پانی اسی طرح دراڑ میں سے نکل کر چھوٹے سے تالاب میں گر رہا تھا راج کماری نے وہاں سے ایک درخت کی شاخ اتار کر اسے اپنے جسم کے اوپر والے حصے پر لپیٹ لیا اور سوچا کہ یا اسے شریم کی تلاش میں جانا چاہیے لیکن اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ شریم کہاں اور کدھر گیا ہے وہاں رکنا بڑا ہی خطرناک تھا دن چڑھ آیا تھا اب کسی بھی وقت وحشیوں کو راج کماری کے فرار کا پتہ چل سکتا تھا اور وہ اس کی تلاش میں طوفان بن کر جنگل میں نکلنے والے تھے۔

راج کماری نے اس طرف چلنا شروع کردیا جس طرف سے وہ شریم کے ساتھ جنگل میں داخل ہوئی تھی وہ سمندر کے ساحل پر پہنچ کر چٹانوں کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف نکل جانا چاہتی تھی کیونکہ اس کے راجہ باپ کی ریاست شمال کی طرف ہی تھی اگرچہ وہاں سے وہ ریاست کافی دور تھی لیکن راج کماری کھوپڑیاں سیکڑ دینے والے وحشی کی دنیا سے دور نکل جانا چاہتی تھی وہ بھاگتی چلی گئی جب تھک گئی تو ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر اپنا سانس درست کیا اور پھر بھاگنا شروع کردیا۔

ادھر دن چڑھا تو جنگلی وحشیوں میں شور مچ گیا راج کماری کے کپڑے ان کی اپنی گونگی جنگلی عورت کی لاش کے پاس پڑے تھے اور راج کماری غائب تھی سردار کا غصے کے مارے برا حال ہو رہا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی شکار ان کے چنگل سے نکل بھاگا تھا اس نے نیزا اٹھا کر چیخ مار کر کہا ”وہ جہاں کہیں بھی ہے اس کی گردن کاٹ کر میرے پاس لے آؤ۔“

وحشی نیزے لہراتے شور مچاتے جنگل میں راج کماری کی تلاش تلاش میں بھاگ نکلے دس ایک طرف، دس ایک طرف اور دس وحشی ایک طرف جنگل میں گھس کر گم ہوگئے راج کماری جنگل میں بھاگی جارہی تھی سمندر کا ساحل اب قریب تھا وحشی بھی اس کے تعاقب میں دوڑے چلے آرہے تھے دوسری طرف شریم بے بسی کی حالت میں اپنی موت کا انتظار کررہا تھا۔

اچانک اسے اپنی قمیض کے اندر سینے کے ساتھ کسی سخت سی چیز کا احساس ہوا اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا کہ یہ کیا ہے اچانک امید کی ایک کرن اس کے چہرے پر روشن ہوگئی کیونکہ یہ وہ سانپ کا مہرہ تھا جو اسے چھ منہ والے اژدھے نے دیا تھا کہ مصیبت کے وقت تمہارے کام آئے گا شریم نے دیکھا کہ ناگو غار کے باہر کڑاہی میں سے ابلا ہوا بدبودار پانی نکال کر ایک مٹکے میں ڈال رہا تھا پھر وہ مٹکے لے کر شاید اسے کسی خفیہ جگہ رکھنے جنگل کی طرف چلا گیا اس کے جاتے ہی شریم نے سانپ کے مہرے کو گلے میں سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اے میری بہن ناگن کے دوست اژدھا اگر تو میری آواز سن رہا ہے تو میری مدد کر میں ناگن دیوی کا بھائی ہوں یا اسے میرے حال کی خبر کر یا تو میری جان بچا۔“

شریم مہرے کو ہتھیلی میں رکھے غور سے دیکھ رہا تھا غار میں گہری خاموشی چھا گئی تھی کہ اچانک اس کی نظروں کے سامنے ہتھیلی پر سانپ کا مہرہ ہلنے لگا ہلتے ہلتے مہرہ ایک دم سے الٹا ہو کر ہتھیلی پر رک گیا اس کے ساتھ ہی شریم نے دیکھا کہ غار کے کونے میں اس کے سامنے وہی چھ منہ والا اژدھا کھڑا ہے اژدھا نے شریم سے کہا۔ ”شریم بھائی میں ناگن کا دوست ہوں تم ناگن کے بھائی ہو تو میرا بھی بھائی ہو جب تک میں زندہ ہوں تمہیں ناگن سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہونے دوں گا تمہیں یہاں کس نے قید کر رکھا ہے۔“ شریم نے اسے ناگو کا سارا قصہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ اس نے اسے دیکھ لیا ہے اژدھے نے کہا۔

”وہ کہاں ہے.....“ شریم نے بتایا کہ جنگل میں گیا اور بہت طاقتور جادوگر ہے۔

اژدھا نے کہا۔ "تمہارے پاس جو مہرہ ہے اسے اپنے جسم میں مل کر جیب میں رکھ لو تم اس جادوگر کی نظروں سے دوبارہ غائب ہو جاؤ گے اور یہ بھی تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔"

شریم نے اسی وقت اس مہرے کو اپنے سارے جسم پر رگڑ رگڑ کر ملنا شروع کر دیا اس کے ساتھ ہی شریم کو اپنے اندر بے پناہ طاقت کا احساس ہوا اسے ایسا لگا جیسے اسے اس کی ساری کھوئی ہوئی طاقت واپس مل گئی ہے۔

اژدھا نے کہا...... "میں تو تمہیں ہر حالت میں ہمیشہ دیکھ سکتا ہوں لیکن اب تمہیں ناگو نہیں دیکھ سکے گا۔" شریم نے کہا۔

"کیا ناگو کا جادو اب مجھ پر اثر نہیں کرے گا......"

"ہرگز نہیں شریم بھائی اس کا جادو اب تمہارے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھ سکتا تم پھر سے وہی پہلے والے شریم بن گئے ہو۔ طاقت ور اور کسی کو نہ دکھائی دینے والا شریم۔ اگر یقین نہ ہو تو ابھی ناگو واپس آئے تو آزما لینا ۔ اب میں تمہاری اور کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" شریم نے ناگن کے بارے میں پوچھا تو اژدھا نے کہا۔

"کہ اسے ناگن کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی سمندر میں جہاز میں سفر کر رہی ہے اور یہ جہاز پرتگال کی طرف جا رہا ہے۔" شریم نے راج کماری کے بارے میں دریافت کیا تو اژدھا بولا۔

"میری آنکھیں تمہاری ہم سفر راج کماری کو اس وقت یہاں سے دور جنگل میں پریشانی کی حالت میں بھاگتے ہوئے دیکھ رہی ہیں خونخوار وحشی نیزہ لہراتے ہوئے اس کے پیچھے لگے رہے تاکہ اس کا سر کاٹ لیں۔" شریم نے جلدی سے کہا۔

"کیا تم اسے بچانے میں میری مدد نہیں کرو گے۔"

"ضرور مدد کروں گا شریم بھائی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے دوست ناگن کے بھائی کی کوئی مدد نہ کر سکوں لیکن مجھے آج ہی شام سمندر کے نیچے سانپوں کے ملک میں ضرور پہنچنا ہو گا وہاں ہمارے بادشاہ کا دربار لگ رہا ہے۔"

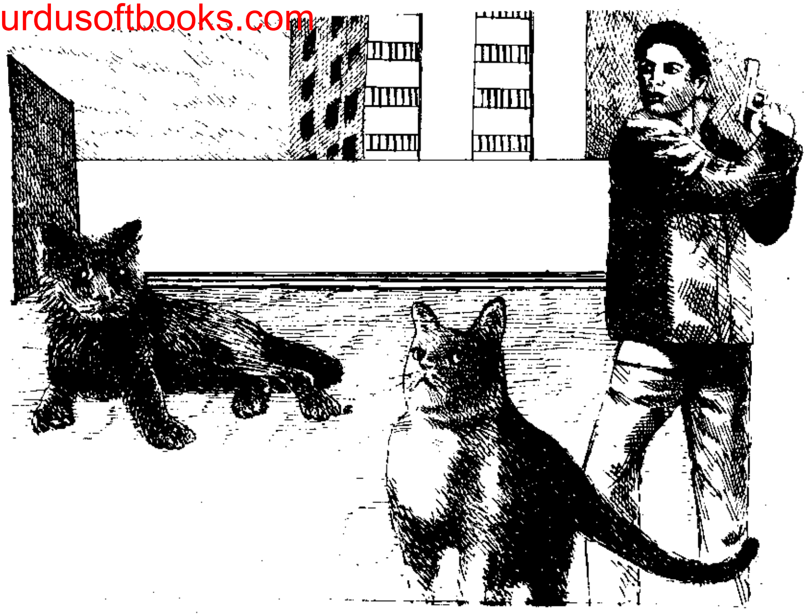
شریم نے کہا۔ "مجھے راج کماری کے پاس پہنچا کر تم بے شک واپس چلے جانا، ناگو آ رہا ہے تم اس فولادی جال سے بڑی آسانی سے نکل جاؤ گے وہ تمہیں نہیں دیکھ سکے گا بے شک آزما لینا۔ میں غائب ہوتا ہوں اور ہاں تم اس ظالم ناگو کو کچھ نہ کہنا اس کی خبر میں لوں گا۔" اتنا کہہ کر اژدھا غائب ہو گیا۔

شریم فولادی جال کی طرف بڑھا تو جال کے سخت تاروں نے اسے نہ روکا وہ بڑی آسانی سے جال میں سے دھوئیں کی لہر کی طرح نکل گیا اس میں اور دھوئیں میں یہ فرق تھا کہ دھواں نظر آ رہا تھا اور شریم نظر نہیں آتا تھا شریم غار کے باہر آ کر کھڑا ہو گیا سامنے سے ناگو چلا آ رہا تھا وہ شریم کے قریب سے گزر گیا اور شریم کو نہ دیکھ سکا حالانکہ شریم اس کے راستے میں غار کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ دوبارہ غائب ہو گیا ہے اگر ناگو اسے نہیں دیکھ سکا تو پھر کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا ناگو سیدھا غار کے اندر چلا گیا اس نے جاتے ہی دیکھا کہ کٹہرے کے جال کے دوسری جانب سے شریم غائب تھا اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے بھاگ کر غار سے باہر آ گیا باہر بھی کوئی نہیں تھا ۔ شریم قریب ہی کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا اس نے زمین پر سے ایک پتھر اٹھا کر ناگو کے آگے پھینک دیا اور کہا۔

"ناگو یہ میں ہوں شریم اب تم اپنے انجام کے لئے تیار ہو جاؤ۔" ناگو جلدی سے اس طرف دیکھنے لگا جہاں سے آواز آئی تھی۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا وہاں اسے شریم بالکل نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ وہاں شریم کھڑا تھا، شریم زور سے ہنس پڑا۔ "مجھ پر تمہارا جادو اب اثر نہیں کرے گا تم نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔"

(جاری ہے)



خونخوار بلی

ملک فرخ ندیم-لاہور

نوجوان اپنے بستر پر محو خواب تھا کہ اچانک کوئی وزنی چیز اس پر گرگئی اور جب نوجوان کی آنکھیں کھلیں تو مارے دہشت کے اس کی گھگھی بندھ گئی ایک خوفناک انگارہ برساتی بلی اس پر سوار تھی۔

خوف کے شکنجے میں جکڑی ہوئی عجیب وغریب اپنی نوعیت کی دلخراش کہانی

میں نے فرخ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور تیزی سے کہا۔ ”چلو بھئی باری باری اس کے اوپر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھو۔اور جلدی کرنا پھر ہم بھی اوپر آئیں گے اور سارے مل کر یہ مہم سرانجام دیں گے۔“

سب سے پہلے احمد نے ایک پاؤں ہمارے ہاتھ پر رکھا اور اور اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ کر اوپر چڑھا اور باآسانی دیوار پر چڑھ گیا۔اس کے بعد خرم آگے بڑھا میں نے کہا نہیں تو ابھی نہیں کیونکہ تو بھاری ہے پہلے قیصر کو چڑھنے دے پھر تیری باری آئے گی اور آگے کی طرف بڑھتا ہوا خرم شرمندہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا اور قیصر بندر کی سی پھرتی سے اس آٹھ فٹ کی دیوار پر چڑھ گیا۔پھر خرم آیا اور اس کو اوپر چڑھاتے چڑھاتے جو ہمارا زور لگا وہ ہم ہی جانتے تھے۔اس کا وزن کم از کم ساٹھ کلو تھا۔کسی نہ کسی طرح اس کو بھی دیوار پر چڑھا

دیا اور پھر قیصر اور احمد نے باری باری ہم دونوں کو اوپر کھینچا۔ اور دس منٹ کی مشقت کے بعد ہم سب گرلز اسکول کے اندر تھے۔ اس وقت سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ اتوار کا دن تھا اور اتوار کے دن ہم سب شیطان مل کر گورنمنٹ گرلز اسکول کے اندر لگی بیری کے بیر توڑنے کے لیے آئے تھے۔ اس وقت ہماری عمریں فرخ ندیم یعنی میں پندرہ سال کا فرخ اقبال میرا کزن اور دوست جس کی تاریخ پیدائش اور نام بھی میرے ہی جیسا تھا۔ اس کے بعد احمد جو اس وقت بارہ سال کا تھا میرا سگا بھائی ہے۔ خرم میرا پھوپھوزاد تھا اور وہ اس واقعے کے چند ماہ بعد ہی وفات پا گیا تھا اور قیصر فرخ اقبال کا چھوٹا بھائی تھا اور وہ بھی بارہ سال کا تھا۔

اس سے پہلے ہم لوگ اپنے گاں کے کئی باغوں میں جامن اور آم کے کامیاب ڈاکے ڈال چکے تھے۔ بہرحال اس وقت اسکول کے تمام کمروں پر تالے لگے تھے اور چوکیدار کو ہم نے مسجد کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا اس کی آمد کا ہمیں علم تھا کہ دو گھنٹے لگا کر ہی آئے گا۔

اس وقت بیری کا وہ عظیم الشان درخت ہمارے سامنے تھا جس پر موٹے موٹے بیر ہمارا راستہ دیکھ رہے تھے۔ ہم تیزی سے آگے بڑھے اور ادھر ادھر سے موٹے موٹے پتھر اکٹھا کرنے لگے ۔نشانہ صرف میں اور فرخ اقبال ہی لگاتے تھے۔ پہلا نشانہ میں نے باندھا اور پتھر اس انداز سے پھینکا کہ وہ مختلف بھری بھری شاخوں سے ٹکراتا ہوا جائے اور ایسا ہی ہوا اور دس بارہ بیر نیچے گرے جنہیں خرم اور قیصر نے جلدی سے چھاپ لیا اور اپنی اپنی جیبوں میں منتقل کر دیا۔ دوسری باری فرخ اقبال کی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خاصا موٹا پتھر تھا اور اس نے پوری قوت سے مارا۔ اس کا نشانہ ایک ایسی پتلی ڈالی تھی جس پر بیروں کی بہتات تھی اس کا نشانہ کارگر رہا اور وہ ٹہنی ہی ٹوٹ کر نیچے آ پڑی۔ دو ہی منٹ میں شکاریوں نے اسے بھی خالی کر لیا اس کے بعد میں نے بھی اسی قسم کا نشانہ بنایا اور اس بار بھی ایک ٹہنی ہی گری مگر اس کے ساتھ ہی کسی بلی کی زوردار آواز بھی سنائی دی۔

ہم نے چونک کر درخت کی طرف دیکھا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ مجھے لگا شاید ہماری سماعتوں کو دھوکہ لگا تھا۔ میں نے دوسرا پتھر سنبھالا اور جیسے ہی اوپر کی طرف دیکھ کر نشانہ باندھنے لگا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک کالے رنگ کی بلی بیری کے درخت کی ایک شاخ پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھیں دوسری بلیوں کے برعکس گہرے سرخ رنگ کی تھیں اور وہ ہمیں گھور رہی تھی۔ فرخ اقبال نے منہ سے زور کی آواز نکالی ”۔۔۔۔۔۔۔شی۔۔۔شی۔۔شی۔“

ہمیں لگا کہ شاید اس طرح بلی بھاگ جائے گی مگر ہوا اس کے برعکس بلی تو آہستہ آہستہ نیچے کی طرف بڑھنے لگی۔

قیصر نے کہا۔ ”فرخ ایک پتھر زور سے اسے مارو اس طرح ہی یہ بھاگے گی۔“ اور میں نے بھی جوش میں آکر ایک بڑا سا پتھر ہاتھوں میں تولا اور پوری قوت سے اس بلی کا نشانہ باندھا۔ پتھر تیر کی سی تیزی سے بلی کی طرف بڑھا اور اور پھر ہماری آنکھوں میں خوف کے آثار ابھر آئے۔

جیسے ہی پتھر بلی کے قریب پہنچا بلی نے چھلانگ لگائی مگر اس انداز سے کہ اس پتھر کو اپنے پنجوں میں پکڑ لیا اور اس کے ساتھ ہی وہ بیری کے ساتھ موجود کلاس روم کے شیڈ پر پہنچ گئی۔ اب تو ہم سب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور بغور دیکھ کر تو اور ہی برا حال ہوا کیونکہ بلی کے سر پر دونوں آنکھوں کے درمیان ایک سبز رنگ کا سینگ ابھرا ہوا تھا۔ اس بار بلی نے زور سے ”میاؤں ......میاؤں کی آواز نکالی اور ساتھ ہی پنجوں میں پکڑا پتھر ایک سائیڈ پر پھینکا اور اس سے پہلے کہ وہ جست لگاتی ہم پانچوں چیختے ہوئے گیٹ کر طرف بھاگے۔ اس وقت ہمیں یقین آ گیا تھا کہ یہ کوئی بلی نہیں ضرور کوئی آسیب ہے۔ پیچھے

سے بلی نے اس بار انسانی آواز میں چلا کر کہا ! ! ٹھہرو ! ! ! بھاگتے کہاں ہو۔"

اور شیڈ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ ہم اندھا دھند دوڑے اور جس دیوار پر چڑھنے کے لیے ہم کو اتنی محنت کرنا پڑی تھی اس پر اس بار ہم یوں چڑھے جیسے پیچھے بلی نہیں بلکہ موت لگی ہو۔

جیسے ہی ہم نے دیوار پھلانگی۔ سامنے ہی گوشت مارکیٹ تھی مگر اس وقت وہ بھی سنسان نظر آ رہی تھی۔ ہم اندھا دھند گھر کی طرف بھاگے۔ بھاگتے بھاگتے میں نے مڑ کر دیکھا تو بلی اس وقت اسکول کی چھت پر کھڑی ہمیں خوفناک نظروں سے گھور رہی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھوں سے کوئی آگ نکل رہی ہے جس میں میں جھلس رہا ہوں۔ اسی حالت میں ہم گھر پہنچے امی نے مجھے ایسی حالت میں دیکھا تو گھبرا گئیں اور پوچھا کیا ہوا۔ میں نے من وعن سارا واقعہ انہیں سنایا تو بجائے ہمیں تسلی ملنے کے خوب چھترپریڈ ہوئی۔

کچھ دن یونہی گزر گئے۔ پھر ایک رات میں جب گرمیوں میں چھت پر سویا ہوا تھا تو رات کے کسی پہر یکدم مجھے لگا جیسے کوئی میرے اوپر کودا ہو۔ اس وقت میرے اوپر ایک چادر تھی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسی وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرا جسم اس وقت کسی بھی قسم کی حرکت کرنے سے قاصر ہو چکا تھا۔ پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ اسی وقت وہ چیز میرے اوپر حرکت کرتے ہوئے میرے چہرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں نے اپنا پورا زور لگا کر ہاتھوں کو حرکت دینے کی کوشش کی اور اس میں کسی قدر کامیاب بھی رہا۔ میں نے ہاتھوں سے چہرے پر پڑی چادر کو ہٹانا چاہا۔ اس کام میں میرے دو منٹ گزر گئے اور یہ دو منٹ مجھے یوں لگا جیسے گھنٹوں گزر گئے ہوں۔ بالآخر اپنی اس کوشش میں میں کامیاب ہوا اور جیسے ہی میری آنکھوں سے چادر ہٹی۔

دہشت کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہی بلی اس وقت میرے اوپر سوار تھی اور اس کا خونخوار چہرہ لال انگارہ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ یکدم بلی نے اپنا منہ کھولا اور اس کے لمبے لمبے دانت میرے چہرے کی طرف بڑھنے لگے۔ خوف کی شدت سے اس وقت میرا جسم حرکت کرنے لگ پڑا اور میں نے پوری قوت سے بلی کو سامنے کی طرف اچھال دیا۔

بلی اڑتی ہوئی چھت سے نیچے جا پڑی جہاں اس وقت دادا جان سو رہے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور جونہی انہوں نے بلی کو دیکھا۔ پتہ نہیں کیا ہوا بلی زور سے چلانے لگی اور ایک طرف کو بھاگ گئی۔

دادا جی تیزی سے اٹھے اور بلی کی طرف لپکے مگر بلی بھاگتے بھاگتے یکدم اوجھل ہو گئی۔ دادا جی نے پوچھا۔ "اوپر کون ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "دادا جی میں ہوں۔" تو وہ جلدی سے چھت پر آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے۔ "کیا ہوا۔"

میں نے تمام واقعہ انہیں بتا دیا۔ دادا جی نے مجھے خوب ڈانٹا اور سختی سے تاکید کی کہ دوبارہ اس طرف مت جانا۔ یہ بلی نہیں بلکہ ایک جن تھا جو گرلز اسکول کی بیری پہ رہتا ہے اور دوبارہ اس طرف گئے تو تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔" اسی وقت فجر کی اذان ہونے لگی اور دادا جی مجھے اپنے ساتھ مسجد نماز کے لئے گئے اور پھر نماز کے بعد امام مسجد سے ایک تعویز بنوا کر میرے گلے میں باندھا۔

اگلے دن دادا جی نے ابا جان سے کچھ کہا اور اس طرح ہم لاہور شفٹ ہو گئے۔ اس واقعے کو پندرہ سال بیت گئے ہیں مگر یہ مجھے آج بھی یاد ہے اور اکثر راتوں کو مجھے اس واقعے کی یاد چین سے سونے نہیں دیتی۔

بے چین روح

شانزہ اعوان۔ راولپنڈی

خوف و ہراس کے سمندر میں غوطہ زن اور دلوں پر سکتہ طاری کرتی اپنی مثال آپ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو طویل مدت تک اپنے شکنجے میں جکڑی رہے گی۔

ایک ایسی کہانی...... جو کہ پڑھنے والوں کو کسی کروٹ بھی چین سے نہ رہنے دے گی

رانی ایک گاؤں کی رہنے والی تھی اس کی ماں چار سال قبل فوت ہو چکی تھی وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی اس کا اور کوئی بہن بھائی نہیں تھا اس کا باپ رحمت ایک مزدور تھا وہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بہت شریف اور بزرگوں کا ادب کرنے والی لڑکی تھی اس کا باپ اس سے بہت پیار کرتا تھا وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتا تھا مگر رانی نے مڈل تک پڑھا کیونکہ اس کے گاؤں میں صرف مڈل تک اسکول تھا ہائی اسکول گاؤں سے باہر تھا۔ رانی نے ایک روز باپ سے بولی۔

''ابو میں آگے بھی پڑھنا چاہتی ہو۔'' اور رانی کے ساتھ ساتھ اس کا باپ بھی چاہتا تھا کہ رانی زیادہ پڑھے۔

مگر وہ سوچتا تھا کہ اتنی دور رانی اکیلی کیسے جائے گی۔ اور جب اس نے رانی سے ذکر کیا۔

''میری بچی تو اکیلی اتنی دور کیسے جائے گی؟''

تو رانی نے جواب دیا۔ ''ابو میری سہیلی عابدہ بھی جائے گی۔'' اس طرح اس نے اور عابدہ نے داخلہ لے لیا عابدہ اس کی بہت اچھی سہیلی تھی اس کے گھر کے ساتھ اس کا گھر تھا اسکول کے بعد بھی اکثر عابدہ اسی کے ساتھ اس کے گھر آجاتی تھی۔

رانی اور عابدہ دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتی تھیں اکثر عابدہ رانی کے ساتھ مل کر اس کے گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتی رہتی تھی، رانی کا باپ بھی بہت خوش تھا کیونکہ رانی عابدہ کے ساتھ بہت خوش رہتی تھی۔

اور اسی طرح ایک سال گزر گیا، رانی پاس ہو کر میٹرک میں داخل ہوگئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ کہنے لگی۔

''عابدہ اب ہم دونوں میٹرک پاس کر کے شہر کے کالج میں داخلہ لے لیں گے۔''

عابدہ نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں بھی چاہتی ہوں کہ آگے پڑھائی جاری رکھوں۔'' دونوں اپنے آپ میں بہت خوش رہا کرتی تھیں۔

رانی کو ایک دن محسوس ہوا کہ کچھ دنوں سے دو لڑکے اس کا پیچھا کرتے ہیں پھر وہ سوچتی کہ آخر میرا پیچھا کیوں کریں گے۔

دوسرے دن وہ اور عابدہ جا رہی تھی کہ وہی لڑکے پھر اسے نظر آگئے۔ جب اس کے پاس سے گزرے تو ایک نے کہا۔

''واہ یار کیا کمال کی چیز ہے پتہ نہیں کب ملے گی ہمیں۔''



عابدہ نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا تو رانی نے کہا۔" آگے چلو کیوں دیکھ رہی ہو کم بخت آوارہ بدمعاش ہیں۔"

پھر کچھ دن وہ لڑکے نظر نہ آئے تو رانی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان چھوٹی۔

ایک دن وہ اسکول کے لئے تیار ہوئی عابدہ کا انتظار کر رہی تھی اور عابدہ نہ آئی تو رانی نے بیگ اٹھایا اور عابدہ کے گھر چلی گئی۔

عابدہ کی امی سے پوچھا تو وہ کہنے لگیں۔" عابدہ کو بخار ہے وہ آج اسکول نہیں جائے گی۔"

رانی عابدہ کے پاس گئی تو حقیقت میں عابدہ کو بخار تھا۔ رانی نے عابدہ سے کہا۔

" اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے اسکول سے واپس آتے ہی تمہارے پاس آجاؤں گی۔"

عابدہ نے کہا۔" ٹھیک ہے۔" پھر رانی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اسکول کے لئے چل پڑی ابھی وہ اسکول سے تھوڑی دور تھی کہ وہ لڑکے پھر اسے سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ مگر رانی سر جھکائے تیز تیز چلتی رہی۔ جب وہ قریب آئے تو ایک بولا۔

"واہ کیا مست جوانی ہے کبھی ہمیں بھی تو موقع دے دو۔"

رانی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا پھر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اسکول پہنچی۔ پورا دن وہ سوچتی رہی کاش وہ آج نہ آتی پھر چھٹی ہوئی تو وہ بیگ اٹھا کر گھر کی طرف چل دی۔

اور ابھی کچھ ہی دور گئی تھی کہ اچانک دونوں لڑکے ایک درخت کے پاس کھڑے نظر آئے تو وہ جلدی جلدی آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگی وہ کسی کو مدد کے لئے پکار بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ بستی سے کافی دور تھی۔

اچانک لڑکوں نے اس کا راستہ روک لیا تو رانی نے کہا۔

"چھوڑ دو میرا راستہ مجھے جانے دو اگر مجھے ہاتھ لگایا تو میں گھر جا کر بتاؤں گی، ہٹ جاؤ میرے راستے سے۔"

رانی کی بات سن کر ایک لڑکا غصے سے دوہرا ہو گیا۔" بے شرم زبان لڑا رہی ہے مجھ سے آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔" وہ رانی کو گھسیٹتا ہوا درختوں میں لے گیا دوسرا بھی اس کے ساتھ تھا رانی روتی رہی ہاتھ جوڑتی رہی خدا کا واسطہ دیتی رہی۔

"مجھے چھوڑ دو......" مگر ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا انہوں نے زبردستی رانی کی عزت تار تار کردی اور بعد میں اس کا گلا دبا کر اسے مار ڈالا۔

☆......☆......☆

شام کا اندھیرا اپھیل چکا تھا، رانی کا باپ رحمت رانی کو ڈھونڈ کر تھک چکا تھا مگر رانی نہ ملی۔

دوسرے دن جنگل میں ایک آدمی لکڑیاں کاٹنے گیا تو اس نے دیکھا کہ رانی درختوں کے پاس مردہ پڑی ہے رانی کو دیکھ کر وہ آدمی خوف زدہ ہو گیا کیونکہ وہ بہت بری حالت میں تھی اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔

وہ آدمی بھاگتا ہوا گاؤں میں آیا اور گاؤں والوں کو بتایا تو رانی کا باپ پاگلوں کی طرح اس جگہ کی طرف دوڑ پڑا جہاں رانی مردہ پڑی تھی رانی کا باپ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"میری بچی تیرے ساتھ یہ ظلم کس نے کیا......"

گاؤں والے رانی کے باپ کو دلاسہ دے رہے تھے اور گاؤں والوں کو پتہ نہیں تھا کہ رانی کے ساتھ ایسا سلوک کن لوگوں نے کیا ہے اور پھر عابدہ نے اس خونی واقعہ کے بعد اسکول جانا چھوڑ دیا وہ رانی کو یاد کر کے ہر وقت روتی رہتی تھی۔

پھر اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا تو ایک دن عابدہ کو رانی کی یاد بہت ستا رہی تھی۔ عابدہ نے جلدی سے گھر کا کام ختم کیا اور اپنی امی سے اجازت لے کر قبرستان جانے لگی۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ہی قبرستان تھا جہاں رانی کی قبر بھی اسی قبرستان میں تھی ابھی رانی قبر پر پہنچی نہیں تھی کہ قبرستان کے ساتھ ہی گھنے درختوں سے اسے کسی کے رونے کی آواز آئی۔ وہ آواز کسی لڑکی کی تھی جو درد بھری آواز سے آہستہ آہستہ سسک رہی تھی۔

عابدہ نے سوچا۔ "کون ہو سکتا ہے چلو دیکھوں تو سہی کون ہے وہاں؟"

وہ آواز کی سمت بڑھنے لگی۔ اور پھر وہ اس جگہ جا پہنچی اس نے دیکھا کہ ایک لڑکی گھٹنوں میں اپنا سر دیئے رو رہی ہے عابدہ کا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔

آخر کار اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ "کون ہو تم اور کیوں رو رہی ہو......؟"

عابدہ کی آواز سن کر اس لڑکی نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا تو اسے دیکھ کر عابدہ دہل گئی کیونکہ وہ لڑکی کوئی اور نہ ہی عابدہ کی سہیلی رانی تھی اور جب رانی پر نظر پڑی تو مارے خوف کے عابدہ کی چیخ نکل گئی۔

اس کا پورا جسم پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ خوف کے مارے اس کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا اور وہ بھاگنے لگی تو جھٹ سے رانی اس کے آگے آ کر کھڑی ہو گئی۔

عابدہ نے کہا۔ "پلیز رانی میرے قریب مت آؤ خدا کے لئے مجھے جانے دو۔"

عابدہ اتنی ڈر گئی تھی کہ گڑگڑا کر اسے واسطے دینے لگی۔ تو رانی بولی۔

"عابدہ تم ڈرومت میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی کیونکہ تم میری اچھی بہن اور ایک اچھی دوست تھی۔ تمہیں مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے بس میری ایک بات سنو۔"

عابدہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "رانی تم تو مر گئی ہو پھر یہاں کیسے۔"

عابدہ اب بھی ڈر رہی تھی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا رانی نے کہا۔

"ہاں عابدہ تم ٹھیک کہتی ہو کہ میں مر گئی ہوں مگر مجھے چین نہیں مل رہا اس لئے کہ میری روح بھٹک رہی ہے۔"

عابدہ نے کہا۔ "کیوں......؟"

پھر رانی بولی۔ "تم میری سب سے اچھی دوست ہو اس لئے تمہیں بتا رہی ہوں۔" اور پھر رانی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ سب عابدہ کو بتا دیا۔

عابدہ اس کی بات سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر بولی۔

"بتاؤ رانی میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

رانی نے کہا۔ ”عابدہ آج نہیں بلکہ کل میں ان دونوں سے انتقام لے لوں گی میں ان کو چھپنے نہیں دوں گی۔“ عابدہ کا سارا ڈر ختم ہو چکا تھا عابدہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی پھر کچھ دیر کے بعد عابدہ نے کہا۔

”رانی تم مجھے روزانہ مل سکتی ہو؟“

تو رانی بولی۔ ”عابدہ کل کے بعد میں تمہیں کبھی نظر نہیں آؤں گی کیونکہ کل میں ان دونوں کو انجام تک پہنچا دوں گی۔“ پھر رانی نے کہا۔

”عابدہ اب تم گھر جاؤ کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کرنا جب تک میں ان سے بدلہ نہیں لے لیتی۔“

اتنا کہہ کر رانی قبرستان کی طرف چل پڑی۔

قبرستان میں داخل ہونے کے بعد وہ ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئی تو عابدہ گھر کی طرف چل دی۔ رانی کی داستان سن کر اسے بہت دکھ ہوا تھا وہ گھر جا کر سوچنے لگی۔

”کل رانی سے ضرور ملوں گی۔ اس سے ڈھیروں باتیں کروں گی۔“

دوسرے دن دونوں لڑکے عارف اور حمید ایک ساتھ کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے حمید عارف کے گھر آیا تھا عارف وہی لڑکا تھا جو روزانہ رانی کو تنگ کیا کرتا تھا، اس کی اس حرکت میں حمید بھی برابر کا شریک تھا۔ اتنے میں عارف کی امی اندر آئیں اور چائے ٹیبل پر رکھی تو عارف اور حمید نے اپنے اپنے کپ اٹھا لئے اور پھر حمید نے کہا۔

”آنٹی مبارک ہو کل حمید کی شادی ہو رہی ہے، میں بہت خوش ہوں عارف کی شادی پر خوب دھوم دھڑکا کروں گا۔“

وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے جب حمید جانے لگا تو عارف نے کہا۔

”یار میں تجھے نہیں جانے دوں گا تو یہیں رک جا......“

تو حمید نے کہا۔ ”گھر والے پریشان ہوں گے میں کل وقت سے پہلے آجاؤں گا۔“ مگر عارف نے اس

یہ وقت......!

کبھی لوگ ظالم ہو جاتے ہیں اور کبھی زمانہ کبھی حالات اور کبھی اپنا آپ ہی مگر میرے خیال میں سب سے ظالم چیز وہ ہے جو گزرتے سے اپنا احساس تک نہ ہونے دے اور وہ ہے ”وقت“ یہ کبھی اتنا اچھا ہوتا ہے کہ برے رنگ، برے لوگ، برا موسم سب کچھ اچھا لگنے لگتا ہے اور ہم وقت کی خوش گمانی میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔

اور یہ وقت ہی ہے کہ جب برا ہو جاتا ہے تو اچھے رنگ، اچھے لوگ، اچھے موسم سب کچھ برا لگتا ہے۔ یہ وقت ایسا کرتا ہے کہ جن لوگوں کو مسکراہٹ کی عادت پڑی ہو انہی کی آنکھوں میں طنز دکھاتا ہے۔ جن سہاروں کے ساتھ زندگی گزارنے کی لگن دلاتا ہے، ان ہی لوگوں کو ہم سے چھین لیتا ہے، اس وقت کی چالاکی تو دیکھئے کہ دھیرے دھیرے دبے پاؤں گزر بھی جاتا ہے، پھر بھی ہم سب اس کی قدر کرتے ہیں اور اسے کتنا احساس سے اپنے قیمتی ہونے کا۔

کاش ہم وقت کو روک سکتے لیکن یہ میرے ہاتھوں میں دبی ریت کی طرح پھسلتا جا رہا ہے۔ یہ خالی جاتا تو ٹھیک تھا مگر اپنے ساتھ میرے سنہری خواب، میری آنکھوں کے روشن چراغ، میری دعاؤں کے سارے سیپ، میرے ستارے، میرے استعارے، میرے دوست، میرے مسکراتے رہنے کی ساری وجوہات اپنے ساتھ لئے جا رہا ہے۔ میں لمحہ لمحہ ان سب چیزوں کے پیچھے بھاگتا ہوں، کبھی کبھی کسی کو روکتا ہوں تو کبھی کسی کو، لیکن میری بے بسی تو دیکھئے کہ میں ان سے کسی بھی چیز کو روک نہیں پا رہا ہوں اور نہ ہی اس وقت کو۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

کی ایک نہ سنی اور جلدی سے کال کر کے اس کے گھر بتا دیا۔

"حمید آج میرے پاس رہے گا۔"

اندھیرا کافی پھیل چکا تھا عارف کی امی نے آواز لگائی۔ "آؤ بیٹا کھانا کھالو۔"

تو دونوں نے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا پھر وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔ باتیں کرتے کرتے انہیں ٹائم کا پتہ ہی نہ چلا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے اتنے میں اچانک تیز ہوا چلنا شروع ہو گئی حمید نے کہا۔

"ابھی تو موسم اچھا تھا اچانک یہ ہوائیں۔" پھر بجلی اتنے زور سے کڑکی کہ دونوں کانپ کر رہ گئے۔ ساتھ ساتھ بارش بھی شروع ہو گئی۔

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ "عارف بیٹا دروازہ کھولو۔" یہ اس کی امی کی آواز تھی وہ جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھولا تو سامنے کوئی بھی نہ تھا۔

اس نے دروازہ بند کیا اور حمید کی طرف دیکھا۔ "حمید امی کی آواز تمہیں سنائی دی تھی کیا؟" اس نے کہا۔

"ہاں آواز تو میں نے بھی سنی ہے۔"

ایک بار پھر دروازے پر دستک ہوئی تو اس بار دروازہ حمید نے کھولا مگر سامنے کوئی نہ تھا تو وہ دونوں گھبرا گئے، جلدی سے کمرے سے نکلے اور امی کے کمرے میں پہنچے تو وہ سو چکی تھیں۔

اچانک بجلی پھر کڑکی تو لائٹ بھی چلی گئی۔ وہ دونوں واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر عارف نے موبائل کی لائٹ سے دروازہ بند کیا۔ جب دونوں بیڈ کے قریب آئے تو کوئی لڑکی بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔

عارف کی خوف کے مارے جان نکلی جا رہی تھی حمید بھی ڈر رہا تھا عارف نے آخر پوچھا۔

"کون ہو تم......؟"

تو اس لڑکی نے جب اپنا چہرہ ان دونوں کی طرف کیا تو خوف کے مارے دونوں کی چیخ نکل گئی۔

"ت......ت......تم......تو مر گئی تھی۔" عارف نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میں مر چکی ہوں مگر مجھے چین آج ملے گا جب تم دونوں کی جان لوں گی۔" وہ کوئی اور نہیں رانی تھی۔

وہ دونوں بھاگے مگر فرش پر گر گئے پھر اٹھے تو وہ ان کے سامنے آ گئی دونوں خوف سے کانپ رہے تھے بار بار واسطہ دے رہے تھے اس نے کہا۔

"جب میں تمہیں واسطہ دیتی رہی تو تم نے میری بات مانی تھی؟" اتنا کہہ کر اس نے قدم آگے بڑھا دیئے اور اس کی شکل ایسی ہو گئی تھی کہ وہ دیکھ کر بے ہوش ہونے والے تھے کہ پھر اس نے ایک ہاتھ سے ایک کی اور دوسرے ہاتھ سے دوسرے کی گردن پکڑ کر اوپر اچھال دیا۔ دونوں کی چیخ سے کمرہ دہل رہا تھا مگر اچنبھے کی بات یہ تھی کہ ان کی آواز کمرے سے باہر نہیں جا رہی تھی دونوں کے سر چھت سے لگے اس کے بعد وہ دونوں دھڑام سے نیچے فرش پر گر گئے تو دونوں کا سر دو حصوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

صبح ان دونوں کی موت کی خبر پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی عابدہ کو یاد آیا تو وہ قبرستان گئی تو رانی نے کہا۔

"عابدہ میں نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ اب میں جا رہی ہوں۔"

عابدہ نے کہا۔ "پلیز! رانی مجھ سے ملتی رہنا۔"

مگر رانی نے کہا۔

"اب یہ نہیں ہو سکتا۔" اور رانی نے قبرستان کی طرف اپنے قدم بڑھا دیئے اور وہ قبرستان جا کر غائب ہو چکی تھی۔ عابدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے پھر عابدہ آہستہ آہستہ گھر کی طرف چل دی۔



طوفانی رات

مریم فاطمہ۔کراچی

اچانک بدروح نمودار ہوئی اور چشم زدن میں خوبرو حسینہ کو دبوچ لیا کہ اتنے میں حسینہ کی زور دار آواز حلق سے نکلی کہ اتنے میں ایک انہونی ہوئی اور پھر......

بدلے اور انتقام کی......لرزہ براندام کرتی......لہولہو خوف کے لبادے میں لپٹی کہانی

"**وانگ** کہاں رہ گیا......؟" جنگسوا نے لاکر کھولتے ہوئے اپنے دوستوں سے سوال کیا۔

"ہاں پتا نہیں کہاں رہ گیا نکمہ......" ریئشو نے بے زار لہجے میں کہا۔

"اب رہنے بھی دو وانگ تمہاری طرح نہیں ہے بلکہ وہ ایک اچھا اور ڈیسنٹ انسان ہے۔" چناؤ نے ریئشو کی طرف ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہمیشہ ریئشو سے چڑتی تھی کیونکہ وہ ہر وقت اس سے فری ہونے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اور ریئشو پورے گروپ میں وہ واحد لڑکا تھا جس سے چناؤ بری طرح خار کھاتی تھی۔

"چناؤ آخر میں نے کیا کیا ہے کیوں تم میرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔" ریئشو ضدی لہجے میں بولا۔

"اب تم لوگ پھر سے نہ شروع ہو جانا

پلیز۔" جیا نے انہیں روکا۔

جنگسوا اپنے لاکر کے اندر دیکھ کر ایک دم ٹھٹکی۔

"ارے یہ کیا ہے......" اندر سفید رنگ کا ایک لفافہ موجود تھا۔ اور لفافے پر جنگسوا کا نام تھا۔

"لکھائی تو وانگ کی لگ رہی ہے۔" اس نے کہا اور لفافہ کھول ڈالا۔ اندر سے ایک کارڈ برآمد ہوا اس پر لکھا تھا۔

"فاریسٹ پارٹی ...... وانگ کی طرف سے۔" جنگسوا نے سب کو وہ کارڈ دکھایا۔

چتاؤ نے بھی جلدی سے اپنا لاکر کھولا کہ شاید اسے بھی ویسا ہی دعوت نامہ دیا گیا ہو۔ اس کے لاکر میں بھی ایک ویسا ہی لفافہ تھا۔ وہ خوشی سے اچھلنے لگی۔

"واہ! بہت خوب بزدل دو دو لڑکیوں کو ایک ساتھ ڈیٹ پر لے جا رہا ہے۔" ریشو افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"بکواس بند کرو یہ کوئی ڈیٹ نہیں ہے۔" چتاؤ غصے سے بھنا گئی جیا ہنسنے لگی اور اس نے بھی اپنا لاکر کھولا تو توقع کے عین مطابق اس کے لاکر میں بھی دعوت نامہ تھا۔

پھر ریشو نے غصے میں آکر اپنا لاکر کھولا اور خوشی سے چلا اٹھا......

"ہاں یہ ہوئی ناں بات یہ واقعی ڈیٹ نہیں ہے......اسے بھی دعوت نامہ ملا ہے۔"

اچانک وانگ ایک طرف سے نکل آیا۔

"دوستو! کیسا لگا سرپرائز۔" اس نے پوچھا۔

"تیرا تو جواب نہیں وانگ۔" ریشو اسے گلے لگاتے ہوئے بولا۔

یہ پانچوں دوست چین کے باشندے تھے ۔اور اس وقت اسکول سے چھٹی کا وقت تھا وانگ نے جنگلات کی سیر کا پروگرام ترتیب دے دیا کل صبح انہیں جنگل کی طرف روانہ ہونا تھا اور شام سے پہلے واپس لوٹ آنا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے روز صبح کے وقت وہ پانچوں اکٹھے ہوئے اور وہ سب گاڑی سے سفر کر کے ایک مقام پر پہنچے پھر اس کے بعد آگے کا سفر پیدل طے کرنا تھا۔

سردیوں کے دن تھے ہر طرف دھند چھائی ہوئی تھی آسمان پر بھی کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی موسم کے تیور بھی اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ انہوں نے سردی سے بچاؤ کے لئے گرم کپڑے وغیرہ پہن رکھے تھے۔ ان لوگوں کو راستے کی بھی کچھ خبر نہ تھی بس ان کے پاس ایک نقشہ تھا جس میں سے وہ راستہ تلاش کرتے آگے بڑھ رہے تھے۔

"میں تو چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔" چتاؤ نے شکایت کی۔

"اگر میرے بس میں ہوتا تو تمہیں گود میں اٹھا کر یہ سفر طے کرا دیتا۔" ریشو نے ہمدردی سے کہا۔

"بکواس بند کرو سمجھے...... میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔" چتاؤ کو شدید غصہ آیا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کچھ دیر آرام کر لینا چاہئے۔" جیا نے رکتے ہوئے کہا۔

"ہاں میں بھی بہت تھک گئی ہوں۔" جنگسوا نے بھی اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے...... اگر تم لوگ بھی چاہتے ہو تو ایسا ہی سہی۔" وانگ نے کہا اور پھر وہ سب ایک جگہ اکٹھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"اف کتنی سردی ہے۔" جنگسوا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرتے ہیں کہ لکڑیاں اکٹھی کر کے یہاں تھوڑی سی آگ جلا لیتے ہیں۔" وانگ نے مشورہ دیا۔

"ہاں یہ صحیح رہے گا مجھے بھی بہت سردی کا احساس ہو رہا ہے۔" ریشو نے کہا اور پھر وہ اور وانگ لکڑیاں اکٹھی کرنے لگے۔

لکڑیاں اکٹھی کر کے انہوں نے آگ جلالی

اور سارے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ تیز سرد ہوا چل پڑی تھی ان کے بال بری طرح ہوا سے اڑ رہے تھے۔

"اب کس طرف جانا ہے۔" جیا نے آگ تاپتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں بس تھوڑی دور اس طرف۔" وانگ نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ شاید وایدا کا چکر چھوڑو اور پکی بات بتاؤ۔" جیا نے پھر کہا تو وانگ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور اپنے پاس سے نقشہ نکالا اور دیکھنے لگا۔

"اس نقشے کے مطابق ہمیں مشرق کی طرف جانا ہے۔" وانگ نے اپنے سیدھی طرف اشارہ کیا۔

"لیکن وہاں سے تو ہم آئے ہیں۔" رینشو نے حیرت و بے یقینی سے کہا اور نقشہ جھپٹ کر وانگ کے ہاتھ سے لے لیا اور غور سے پڑھنے لگا۔

اچانک ہوا کا تیز جھونکا آیا اور نقشہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر سامنے جلتی آگ میں جا گرا اور پھر نقشے کو جلنے میں دیر نہیں لگی اور یہ دیکھ کر ان پانچوں نے شور مچا دیا۔

"کچھ کرو آگ بجھاؤ۔" چتاؤ گھبرا کر بولی۔

وہ سارے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے وہ ہاتھ مار مار کر آگ کو بجھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہزار کوشش کر ڈالیں مگر سب بے سود نقشہ لمحوں میں جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

"اب کیا کریں نقشے کے بغیر ہم تو آگے نہیں بڑھ سکتے ......" وانگ نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے احمق انسان۔" جنگسوا نے رینشو کو گھورتے ہوئے کہا۔

"احمق میں نہیں بلکہ احمق ہوا ہے...... بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے اگر نقشہ ہوا سے اڑ گیا تو۔" رینشو نے بھی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"سارا پروگرام چوپٹ کر کے رکھ دیا تم نے سیر کا۔ اب چلو واپس۔" چتاؤ منہ بسور کر بولی۔

پھر پانچوں دوست واپسی کے لئے مڑ گئے۔

"ہم اس طرف سے آئے تھے ...... ہے نا......؟" رینشو نے پوچھا۔

"نہیں ہم اس طرف سے آئے تھے۔" وانگ نے دوسری جانب اشارہ کیا اور پھر وہ پانچوں آپس میں بحث کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

اب ہوا پہلے سے بھی تیز ہو گئی تھی۔ انہیں چلتے چلتے خاصی دیر ہو گئی تھی مگر اب تک وہ جنگل سے باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہو پائے تھے۔ آخر ایک جگہ تھک کر وہ سارے رک گئے۔

"دوستو! یہ ہم کہاں آ گئے اس جگہ تو ہم پہلے بھی آ چکے ہیں۔" جنگسوا نے ہانپتے ہوئے کہا، وہ چل چل کر تھک چکی تھی۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ ہم راستہ بھٹک چکے ہیں۔" رینشو نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"ایسا مت کہو پلیز......! میرا دل گھبراتا ہے۔" چتاؤ نے کہا۔

"اتنی جلدی ہار مت مانو دوستو! ایک بار پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔" وانگ نے ان کی ہمت بندھائی اور وہ سارے ایک بار پھر چل پڑے۔

لیکن کافی دور چلنے کے بعد بھی وہ وہیں پہنچ گئے جہاں سے چلنا شروع کیا تھا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہم بھٹک چکے ہیں۔" جیا نے لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن اب کیا کریں گے ہمارے پاس تو کھانے پینے کے لئے بھی کچھ نہیں ہے۔" جنگسوا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تھوڑی دیر یہاں آرام کرتے ہیں اس کے بعد پھر سے واپسی کا سفر شروع کریں گے۔" وانگ نے کہا۔ وہ سب تھک ہار کر زمین پر بیٹھ گئے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا سردی بڑھتی

جا رہی تھی۔

''میرے خیال میں اب ہمیں چلنا چاہئے ورنہ رات ہو جائے گی۔'' جیا نے کہا تو وہ سب ایک بار پھر چل پڑے۔ آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شام سے رات ہو گئی سردی زیادہ بڑھ چکی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔

اچانک بجلی کڑکنے کی آواز سنائی دی اور موسلادھار بارش بھی شروع ہو گئی اور وہ بارش طوفان میں بدل گئی تیز سرد ہوا سے پیڑ بری طرح ہل رہے تھے۔ وہ لوگ پوری طرح پھنس چکے تھے اب وہ پانچوں پچھتا رہے تھے کہ وہ جنگل کی سیر کو کیوں آ گئے۔ وہ سب تیز بارش سے بچنے کے لئے ایک گھنے درخت کے نیچے جمع ہو گئے مگر بارش کا بے تحاشہ پانی وہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا وہ لوگ پوری طرح بھیگ چکے تھے۔

اچانک وانگ کے چہرے پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

''دوستو......! دیکھو ہم لوگ بچ گئے۔'' اس نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب کیسے بچ گئے......؟'' رینشو نے حیرت سے پوچھا اسے وانگ کی ذہنی کیفیت پر شبہ ہونے لگا تھا۔

''اس طرف دیکھو۔'' اس کے کہنے پر سب نے اس سمت دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہا تھا تو ان لوگوں کی بھی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اندھیرے میں دور سے ایک گھر نما عمارت نظر آ رہی تھی۔

''چلو وہاں چل کر بارش سے پناہ لیتے ہیں۔'' وانگ نے کہا اور وہ چاروں اس کے پیچھے چل دیئے۔

نزدیک پہنچے ہی تھے کہ زور سے بجلی کڑکی...... اس کی روشنی میں انہوں نے اس گھر کے پاس ایک بورڈ لگا ہوا دیکھا جس پر ''ہوٹل'' تحریر تھا۔

''ارے اس ویرانے میں بھلا کون ہوٹل کھولے بیٹھا ہے۔'' جیا نے حیرت سے پوچھا۔

''اس کو چھوڑو اور اندر چلو۔'' رینشو نے سردی سے کانپتے ہوئے کہا۔

ہوٹل بہت خستہ حالت میں تھا وانگ نے دروازے کا ہینڈل گھمانا چاہا مگر وہ اندر سے بند تھا مجبوراً اس نے دروازہ زور سے پیٹا تو ذرا سی دیر میں دروازہ چرر کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ تو سب نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولنے والے کی طرف دیکھا وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو گہرے سبز رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔

''کیا ہم اندر آ سکتے ہیں......؟'' وانگ نے مودبانہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں بالکل، بچو! اندر آ جاؤ۔'' اس بوڑھی عورت نے ہمدردی سے کہا اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا تو وہ پانچوں آگے پیچھے ہو کر اندر داخل ہوئے اندر آ کے انہیں سردی کا احساس کچھ کم ہوا لیکن پھر بھی وہ بارش میں بھیگے ہوئے تھے اس لئے جسم پر کپکپی طاری تھی۔

''تم لوگ اتنے طوفان میں باہر کیا کر رہے تھے ایسے موسم میں تو کوئی بھی اس جنگل کا رخ نہیں کرتا۔'' بوڑھی عورت نے پوچھا۔

''آنٹی ہم دراصل راستہ بھٹک گئے ہیں۔'' جیا نے سردی سے کانپتے ہوئے بتایا۔

''چلو کوئی بات نہیں اب تم لوگ یہاں آ گئے ہو جب تک طوفان تھم نہیں جاتا تم لوگ یہاں رہ سکتے ہو۔'' بوڑھی نے کہا۔

''آنٹی کیا لائٹ گئی ہوئی ہے۔'' چناؤ نے ہوٹل میں موم بتیاں جلتے دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں بیٹا یہ تو جنگلات ہیں یہاں بجلی جیسی کوئی چیز نہیں...... یہ ہوٹل یہاں سیاحت کے لئے آئے لوگوں کے لئے بنایا گیا ہے تم سے پہلے بھی کئی بار یہاں کوئی بھولے بھٹکے مسافر آ چکے ہیں مجھے اچھی

طرح یاد ہے وہ دونوں میاں بیوی تھے۔" بوڑھی عورت نے بتایا۔

"تم لوگ اپنے کپڑے تبدیل کرلو پوری طرح بھیگ چکے ہو۔ میں تمہیں اپنے پاس سے دوسرے کپڑے لاکر دیتی ہوں۔" بوڑھی عورت نے نرمی سے کہا۔

ان پانچوں نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ گیلے کپڑوں میں واقعی انہیں بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ عورت گئی اوران سب کے پہننے کے لئے خشک کپڑے لے آئی ان سب نے غسل خانے میں کپڑے تبدیل کئے اورایک کمرے میں جمع ہوگئے یہ غالباً ڈائننگ روم تھا وہاں بیچ میں لکڑی کی ایک میز اوراس کے گرد کرسیاں رکھی تھیں وہ پانچوں آرام سے بیٹھ گئے باہر سے مسلسل تیز بارش کا شورسنائی دے رہا تھا۔

اچانک تیز ہوا سے کھڑکی کھل گئی بوڑھی عورت نے جلدی سے کھڑکی بند کی۔

"یہ طوفان تو کسی کی جان لے کر رہے گا۔" بوڑھی عورت بڑبڑائی۔

"آنٹی آپ کا نام کیا ہے......" جیا نے پوچھا۔

"میرا نام منکشیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"تم لوگوں کو بھوک لگی ہوگی...... میں تم لوگوں کے کھانے کے لئے کچھ لے کر آتی ہوں۔" منکشیا نے کہا۔

"بالکل آنٹی جلدی سے کچھ کھانے کو دیجئے صبح کا ناشتہ کیا ہوا ہے......"

"ویسے اس وقت کیا وقت ہورہا ہے۔" ریشو نے کہا تو منکشیا نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولی۔

"اس وقت رات کے دس بجے ہیں پھر وہ کچن کی طرف چل دی۔

پیچھے یہ لوگ باتوں میں مصروف ہوگئے۔" میرے گھر والے میرے لئے بے حد پریشان ہوں گے میں نے ان سے کہا تھا کہ میں شام سے پہلے لوٹ آؤں گی۔" جگنسو افکرمندی سے بولی۔

"ویسے آنٹی منکشیا ہم پر بے حد مہربان ہیں۔" وانگ نے کہا۔

ابھی یہ لوگ مزید کوئی بات کرتے کہ منکشیا ہاتھ میں کھانے کی ٹرے لئے چلی آئی کھانے میں گرما گرم چکن کارن سوپ تھوڑی سی سبزی اورنوڈلز تھے اتنا شاندار کھانا دیکھ کرسب کی بھوک جاگ اٹھی منکشیا نے کھانا ان کے سامنے میز پر رکھ دیا وہ سب مزے لے کر کھانے لگے۔

"آنٹی یہ طوفان ویسے کب تک تھم جائے گا۔" چتاؤ نے پوچھا۔

"بیٹا یہ جنگل کا طوفان اور بارش اتنی آسانی سے نہیں تھمتا۔ بعض اوقات کچھ دن بھی لگ جاتے ہیں۔" منکشیا نے بتایا۔

"ارے نہیں تب تک کیا ہم یہاں پھنسے رہیں گے۔" ریشو سوچتے ہوئے بولا۔

"بالکل نہیں کوئی نہ کوئی بندوبست تو ہو ہی جائے گا۔" وانگ نے تسلی دی۔

"کھانا واقعی بہت لذیذ ہے۔" جیا نے کھانے کی تعریف کی۔

"شکریہ......" منکشیا نے کہا۔

جب وہ لوگ کھانا کھا چکے تو منکشیا نے برتن سمیٹ لئے ریشو نے اپنا چھوٹا سا بیگ جو کہ وہ کندھے پر لٹکائے ہوئے تھا نکالا اور اس میں سے شراب کی بوتلیں نکالیں۔

"سرپرائز یہ میں نے تم لوگوں کے لئے چھپا کررکھی تھیں۔"

"بڑے کمینے ہو ہمیں خبر تک ہونے دی۔" چتاؤ بولی۔

"آنٹی آپ بھی پئیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں شکریہ میں نہیں پیتی......" اور پھر پارٹی شروع ہوگئی...... وہ لوگ ایک گلاس کے بعد ایک پیے

جارہے تھے تب ہی جیا نے انہیں روک دیا۔

"بس کرو دوستو...... ہم اس وقت کسی نائٹ کلب میں نہیں بلکہ ایک ہوٹل میں ہیں۔" وہ بولی اور اس نے شراب کی بوتلیں ان کے سامنے سے ہٹالیں۔

"تم لوگ ضرور تھک گئے ہوگے میں تمہیں تمہارے کمرے دکھادیتی ہوں تاکہ تم لوگ آرام کرسکو۔" سنگھیا نے کہا اور انہیں ساتھ لے کر باری باری ان کے کمروں تک چھوڑ دیا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی ابھی تک نہیں سوسکا تھا جیا بھی اپنے کمرے میں اکیلی بے چین ہورہی تھی اس نے کمبل ایک طرف ہٹایا اور بستر سے باہر نکل آئی کمرے میں ہلکی ہلکی موم بتی کی روشنی ہورہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو باہر ابھی تک موسلا دھار بارش جاری تھی۔ اس نے جلدی سے کھڑکی دوبارہ بند کی اور چتاؤ کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہاں پہنچ کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کھلا ہے آجاؤ......" اندر سے چتاؤ کی آواز سنائی دی جیا نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور اندر چلی آئی۔

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی تو سوچا کہ تمہارے پاس چلی آؤں۔"

"ہاں مجھے بھی نیند نہیں آرہی۔" چتاؤ نے تھکے تھکے انداز میں کہا۔

"سوچتی ہوں یہ طوفان آخر کب تھمے گا۔" جیا نے بجلی کے کڑکنے کی آواز پر کہا۔

"جیا تم نے ہوا کا یہ شور سنا......" چتاؤ نے پوچھا۔

"ہاں ظاہر ہے۔" جیا نے جواب دیا۔

"یہ شور آنے والے طوفان اور ہونے والی کسی انہونی کا پتا دے رہا ہے۔" چتاؤ نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیوں گھبرا رہی ہو کچھ نہیں ہوگا۔" جیا نے تسلی دی۔

"جیا تمہیں اس بھیانک رات اور گھنے جنگل سے خوف محسوس نہیں ہورہا......؟" چتاؤ نے پھر پوچھا۔

"ہاں...... ایسی جگہ اور موسم سے ڈرنا تو فطری چیز ہے۔" جیا نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں تم بھی سونے کی کوشش کرو۔" جیا نے کہا اور اٹھ کر باہر آگئی۔

رات کا نامعلوم کون سا پہر تھا جب جیا کی آنکھ کسی کے چیخنے کی آواز سے کھل گئی وہ گھبرا کر اٹھی اور پیروں میں چپل اڑستی کمرے سے باہر نکلی۔ باہر آئی تو دیکھا کہ ریشو، وانگ اور جنگسوا بھی اپنے کمروں سے نکل رہے ہیں۔

"کیا ہوا یہ آواز کیسی تھی......؟" جنگسوا نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"آواز چتاؤ کے کمرے سے آئی تھی کہیں وہ مشکل میں نہ ہو۔" ریشو نے گھبرا کر کہا اور جلدی سے آگے بڑھ کر چتاؤ کے کمرے کا دروازہ کھول دیا باقی سب بھی وہیں اکٹھے ہوچکے تھے اندر کا منظر بالکل نارمل لگ رہا تھا چتاؤ بستر پر سونے کے انداز میں لیٹی تھی۔

"چتاؤ کیا تم ٹھیک ہو......؟" وانگ نے پوچھا۔

لیکن چتاؤ نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سب اندر چلے آئے جنگسوا نے اس کے نزدیک جاکر دیکھا تو چیخ پڑی۔ چتاؤ کے گلے میں بستر کی چادر بندھی ہوئی تھی جیسے کسی نے اس کا دم گھونٹنے کی کوشش کی ہو۔ وانگ نے جلدی سے آگے بڑھ کے اس کے گلے سے چادر کھولی لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی۔

"یہ سب کس نے کیا......؟" ریشو نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جیا اور جنگسوا ایک دوسرے کے ساتھ لگی

کھڑی تھیں۔

"ہو نہ ہو ضرور کوئی ہوٹل میں گھس آیا ہے ہمیں چل کر منکشیا کو خبردار کرنا ہوگا......" وانگ نے کہا پھر وہ سارے منکشیا کے پاس پہنچے وہ اس وقت کچن میں ہی ایک طرف زمین پر بستر لگائے سو رہی تھی جیا نے اسے اٹھایا اور ہوٹل میں پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا۔

منکشیا یہ سن کر بہت پریشان ہوئی اس نے ان سب کو ساتھ لیا اور موم بتی کی روشنی میں پورا ہوٹل چھان مارا لیکن وہاں ان پانچوں اور چتاؤ کی ڈیڈ باڈی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ سب بے حد پریشان اور اداس تھے سب کی نیند اڑ چکی تھی۔

باہر بارش میں بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی اور جیسے جیسے رات گہری ہو رہی تھی سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ منکشیا نے مشورہ دیا کہ وہ سب واپس اپنے کمروں میں جا کر آرام کریں صبح دیکھی جائے گی کہ کیا کرنا ہے۔ ان چاروں نے اس کی بات مان لی اور واپس اپنے کمروں میں آرام کرنے کی نیت سے چلے گئے۔

رات کے ڈھائی بجے جیا پانی پینے کمرے سے باہر نکلی اس کا رخ کچن کی طرف تھا تب ہی اس کی نظر رینشو پر پڑی وہ جنکسوا کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس نے کوئی توجہ نہ دی اور پانی پی کر دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ جنکسوا کے کمرے سے اس کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سارے اس کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ منکشیا بھی جاگ رہی تھی وہ بھی موقع پر پہنچ گئی۔

وانگ نے ہمت کر کے دروازہ کھول ڈالا سامنے فرش پر جنکسوا آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھی اس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔

جیا کے حلق سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔ رینشو اپنا سر تھام کے فرش پر بیٹھ گیا جیا نے رونا شروع کر دیا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے رینشو...... میں نے آج اس واقعہ سے پہلے تمہیں جنکسوا کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا اور آج نقشہ بھی تمہاری وجہ سے آگ میں جلا تھا ضرور تم نے جان بوجھ کر وہ نقشہ آگ میں پھینکا ہوگا تاکہ ہم یہاں بھٹک جائیں تو تم ہمیں ایک ایک کر کے مار سکو۔" جیا نے روتے ہوئے کہا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ بھلا میں ایسا کیوں کروں گا۔"

"یہ مجھے نہیں پتا۔" جیا چیخی...... جیا کی بات سن کر وانگ بھی چکر میں پڑ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے اگر تم نے یہ سب نہیں کیا اور تم واقعی ہمارے دوست ہو تو ہماری بھی ایک شرط ہے۔ ہم آج رات تمہیں تمہارے کمرے میں بند کر دیں گے اگر تم بے قصور ہو تو اس کام میں ہمارا ساتھ دو ورنہ دوسری صورت میں ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔" وانگ نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر تم لوگوں کو میری دوستی کا ثبوت چاہئے تو ایسے ہی سہی۔" اور پھر وانگ نے اسے اس کے کمرے میں بند کر دیا۔

پھر وانگ اور جیا ایک کمرے میں اکٹھے بیٹھ گئے تب ہی منکشیا ان کے پاس آئی اور بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ صبح سویرے ہی تم لوگ میرے ہوٹل سے چلے جاؤ...... جب سے تم لوگ یہاں آئے ہو کچھ نہ کچھ برا ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم صبح سورج کی پہلی کرن نکلتے ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔" وانگ نے جواب دیا۔

منکشیا وہاں سے چلی گئی تھوڑی دیر میں جیا اور وانگ کو رینشو کے کمرے سے ہاتھا پائی اور مزاحمت کرنے کی سی آوازیں سنائی دینے لگیں ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جلدی سے اٹھ کر رینشو کے کمرے کی طرف آئے وانگ نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھول دیا سامنے رینشو کی لاش فرش پر پڑی تھی اس کی گردن پر کسی نے چھری پھیر دی

تھی جیا اور وانگ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے دروازہ باہر سے بند تھا پھر اسے کس نے مارا اور میں نے اسے بند کرنے سے پہلے کمرے کو اچھی طرح چیک بھی کیا تھا۔ یہاں کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا پھر یہ کیسے ہوگیا؟ کس نے کیا۔'' وانگ نے کہا۔

''میں بتاتی ہوں کہ یہ سب کیسے ہوا اور کس نے کیا۔''

پیچھے سے منکشیا کی آواز سنائی دی تو ان دونوں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اچانک منکشیا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی چھری وانگ کے پیٹ میں گھونپ دی وانگ زمین بوس ہوتا چلا گیا جیا نے ایک ڈری ڈری چیخ ماری اور اپنی جگہ سے گر پڑی۔

''جانتی ہو میں نے ایسا کیوں کیا آج سے تیس سال پہلے تمہاری ماں اور میں پکی سہیلیاں تھیں ہم دونوں ان ہی جنگلات کی سیر کرنے آئے تھے۔ راستے میں طوفان آگیا تمہاری ماں نے مجھے تنہا چھوڑ دیا اور خود یہاں سے چلتی بنی میں طوفان اور اس گھنے جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے آخر اپنی جان گنوا بیٹھی اور تب سے میری آتما اسی جنگل میں بھٹک رہی ہے آج جب میں نے تمہیں یہاں بھٹکتے دیکھا تو مجھے لگا کہ بدلہ لینے کا یہ بڑا اچھا موقع ہے یہ ہوٹل جو تم دیکھ رہی ہو اب بالکل ویران ہو چکا ہے اب یہاں کوئی نہیں آتا۔ میں نے ہی تمہارے دوستوں کو ایک ایک کر کے ختم کیا ہے ایسے تمہیں بھی جان سے مار ڈالوں گی۔'' منکشیا نے کہا۔

جیا اپنی ساری ہمت جمع کر کے اٹھی اور اوپر سیڑھیوں کی طرف بھاگی اوپر پہنچ کر سیدھے ہاتھ پر ایک کمرہ تھا کچھ سمجھ نہیں آیا تو وہ اندر چلی گئی اور اپنے بچاؤ کے لئے کچھ ڈھونڈنے لگی لیکن کچھ نہ ملا وہ پریشان ہوگئی تب ہی اسے سیڑھیوں پر منکشیا کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ مجبوراً اسے ایک ہی حل سمجھ آیا کہ کھڑکی سے باہر کود کر اپنی جان بچالے ورنہ وہ بوڑھی آتما اس کے باقی ساتھیوں کی طرح اسے بھی مار دے گی وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہناتے ہوئے کھڑکی کی چوکھٹ پکڑ کے لٹک گئی اس نے نیچے زمین کی طرف دیکھا تو اسے چکر سا آگیا۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نیچے کودے یا نہیں کہ منکشیا سر پر پہنچ گئی اسے دیکھ کر جیا نے ایک چیخ ماری منکشیا نے چھری اس کے سیدھے ہاتھ پر ماری تو اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور بائیں ہاتھ سے چوکھٹ پکڑ کے لٹکی رہی۔ منکشیا نے اس کے بائیں ہاتھ پر چھری پھیرنی چاہی تو مجبوراً اس نے بایاں ہاتھ بھی ہٹا دیا اور نیچے جا گری گرنے کی وجہ سے اسے تھوڑی بہت چوٹیں آئی تھیں۔

وہ بارش کے پانی میں پوری طرح بھیگ چکی تھی وہ ہمت کر کے اٹھنے لگی کہ تب ہی نامعلوم کہاں سے منکشیا آن پہنچی اور اس کے پیٹ میں ایک زبردست لات ماری جیا بری طرح کراہ کر رہ گئی پھر منکشیا نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھانا چاہا تو عین اسی وقت وانگ پیچھے سے آگیا اس نے منکشیا کا رخ اپنی طرف کیا اور ہاتھ میں پکڑا خنجر پوری قوت سے منکشیا کے سینے میں اتار دیا۔ منکشیا زمین بوس ہوگئی۔ اس کی روح کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وانگ تھکے تھکے انداز میں زمین پر بیٹھ گیا۔

''وانگ تم زندہ ہو۔'' جیا خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''وانگ میں بتا نہیں سکتی کہ تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے کتنی خوشی محسوس ہو رہی ہے۔'' جیا نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

صبح تک امدادی ٹیمیں وہاں پہنچ گئیں جیا اور وانگ زندہ بچ کر نکل آئے تھے وہ ہوٹل آج بھی اس جنگل میں موجود ہے لیکن اب وہاں کوئی نہیں جاتا۔

جیا اور وانگ نے تین سال بعد آپس میں شادی کرلی، آج بھی جنگل میں گزاری وہ طوفانی رات یاد کر کے ان دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

جو ہوسکے تو میری روح میں سما جاؤ
دل و نگاہ کے رشتے تو ٹوٹ جاتے ہیں
(ایس حبیب خان......کراچی)

اس جہاں میں کب کسی کا درد اپناتے ہیں لوگ
رخ ہوا کا دیکھ کر اکثر بدل جاتے ہیں لوگ
(انتخاب:سمیرہ عباس......حیدرآباد)

چوٹ پڑی ہے دل پر تو آہ لبوں تک آئی ہے
یونہی چھن سے بول اٹھنا تو شیشے کا دستور نہیں
(انتخاب:حافظ عابد علی......کراچی)

تنہائیوں کا درد لئے میرے دل کے ساتھ
شب بھر تیرے خیال میں جلتی ہے زندگی
(انتخاب:ارشد خان......کراچی)

روز نہ سہی کسی دن یاد کرلینا
کبھی نیند نہ آئے تو ہمیں بھی جگالینا
کبھی بھی کچھ بھی کہنا ہو بلا جھجک کہنا
اگر کچھ دینا چاہو تو ہمیں اپنے غم دینا
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

عشق سے کہہ دو ابھی بات نہ کرے
اس نگاہ کو ابھی جاگنے کی عادت نہیں ہے
عشق سے کہہ دو ابھی خواب نہ دے
ابھی ستاروں پہ چلنے کی ہمت نہیں ہے
(محمد بلال نصیر......کراچی)

تیری یاد نے ستایا دل ملنے پر آیا
نیناں برسے یوں جیسے ساون جھڑی لایا
(ڈاکٹر رانا عامر شہزاد......ننکانہ صاحب)

کاگا سب تن کھائیوں اور چن چن کھائیوں ماس
دو نیناں مت کھائیوں جنہیں پیا ملن کی آس
(انتخاب:شمس الحق شمسی......ننکانہ صاحب)

کبھی نہ ہاتھوں سے ہاتھ چھوٹے خیال رکھنا
کبھی نہ چاہت کا مان ٹوٹے خیال رکھنا
جو ہو محبت تو رنجشوں سے گریز کرنا
کسی کا نازک سا دل نہ ٹوٹے خیال رکھنا
(شہریار رفیق......کھپرو سندھ سے)

ہم برے کیا تھے کہ اک صدق کو سمجھے تھے سپر
وہ بھی اچھے تھے کہ بس یار کہا وار کیا
(مہر پرویز احمد دولو......میاں چنوں)

رات گئے تک گھائل نغمے کرتے ہیں اعلان یہاں
یہ دنیا ہے سنگ دلوں کی کوئی نہیں انسان یہاں
پیار بھیک میں بھی مانگو تو کوئی پیار نہ ڈالے جھولی میں
بن مانگے مل جاتے ہیں رسوائی کے سامان یہاں
(محمد حنیف شاکر......بھاگووالی، ننکانہ صاحب)

کیا لکھوں دل کی حقیقت آرزو بے ہوش ہے
خط پر آنسو گر رہے ہیں مگر قلم خاموش ہے
(انتخاب:عبدالحمید عرف پپو......دیپالپور)

میرے زخموں کا علاج کچھ اس طرح کیا اس نے اے موت
مرہم بھی لگائی تو خنجر کی نوک سے
(خضر حیات......روڈہ تھل، خوشاب)

میں ویکھاں میرا یار نہ ویکھے جے میں نا ویکھاں تے اوہ ویکھے
پوچھے یار دے مریئے، اوہ ویکھے نہ یا نہ ویکھے
(محمد دانیال......روڈہ تھل، خوشاب)

پہلے تو میری یاد سے آئی حیا انہیں
پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو
(محمد سلیم......بھیڑ سوڈیاں)

نہ وہ اقرار کرتا ہے نہ وہ انکار کرتا ہے
ہمیں پھر بھی گمان ہے وہ ہمیں پیار کرتا ہے
(ساجدہ ہناخ اے ڈی......کھڈیاں خاص)

پتھروں سے دوستی کا یہ صلہ کم تو نہیں
اک شکستہ آئینہ جوڑتا رہتا ہوں میں
(اسحاق انجم......کنگن پور)

وہ شخص بچھڑتا ہے تو برسوں نہیں ملتا
ملتا ہے پھر ٹوٹ کے ملتا بھی بہت ہے
(محمد کمال......روڈہ تھل، خوشاب)

☆☆

غزل

تجھ سے سب کچھ کہہ کے بھی کچھ ان کہی رہ جائے گی
گفتگو اتنی بڑھے گی کچھ کمی رہ جائے گی
اپنے لفظوں کے سبھی تحفے تجھے دینے کے بعد
آخری سوغات میری خامشی رہ جائے گی
کشتیاں مضبوط سب بہہ جائیں گی سیلاب میں
کاغذی اک ناؤ میری ذات کی رہ جائے گی
حرص کے طوفان میں ڈھے جائیں گے سارے محل
شہر میں درویش کی اک جھونپڑی رہ جائے گی
رات بھر جلتا رہا ہوں میں سہیل اس آس میں
میں تو بجھ جاؤں گا لیکن روشنی رہ جائے گی
(انتخاب: ایس حبیب خان......کراچی)

آنکھ سے آنسو نمایاں نہیں ہوتے
تیری بے وفائی سے ہم پریشاں نہیں ہوتے
تم سلامت رہو ہمیشہ پھولوں کی طرح
گزرے ہوئے لمحے پھر مہرباں نہیں ہوتے
تیری دید میں کئی زخم پائے ہیں
کسی طرح ہم یوں بھی حیراں نہیں ہوتے
بدلی ہے آسمان نے نگاہ ہم سے آج
اپنی سوچوں سے ہم جواں نہیں ہوتے
سحر ہوئی تو ہمیں نیند آنے لگی پھر
فاصلے وفا کے تیرے میرے درمیاں نہیں ہوتے
فریب دے گیا کسی کا سایہ بھی ہمیں جاوید
بھولے سے تیری ذات سے ہم بدگماں نہیں ہوتے
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

رضائے خالق برحق بدل نہیں سکتے
جو حادثات مقدر ہیں ٹل نہیں سکتے
بہت سے لوگ ہیں کوشاں مگر یہ کون کہے

چراغ تیز ہواؤں میں جل نہیں سکتے
گزار زندگی اب قبر میں اسیر ہوس
یہ وہ بھنور ہے کہ جس سے نکل نہیں سکتے
جہاں تصرف شر ہو وہاں زمینوں سے
کبھی بھی خیر کے چشمے ابل نہیں سکتے
ڈھلے بغیر نہیں ہے کوئی سبیل مگر
زمانے ہم تیرے سانچے میں ڈھل نہیں سکتے
رواں دواں ہے زمانہ انہیں کچلنے کو
گریں جو راہ سفر میں سنبھل نہیں سکتے
سمجھ میں آیا نہ واجد نظم باغ جہاں
شجر کچھ ایسے یہاں ہیں جو پھل نہیں سکتے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

بارش کی تیز بوندوں نے جب دستک دی دروازے پر
محسوس ہوا تم آئے ہو انداز تمہارے جیسا تھا
ہوا کے ہلکے جھونکے کی جب آہٹ ہوئی کھڑکی پر
محسوس ہوا تم آئے ہو انداز تمہارے جیسا تھا
میں تنہا چلا جب بارش میں اک جھونکے نے میرا ساتھ دیا
میں سمجھا تم ہو ساتھ میرے احساس تمہارے جیسا تھا
پھر رک گئی وہ بارش بھی رہی باقی نہ آہٹ بھی
میں سمجھا مجھے تم چھوڑ گئے انداز تمہارے جیسا تھا
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

رم جھم کرتی بادل آنکھیں
ترے پیار میں پاگل آنکھیں
کیسے کیسے سپنے دیکھیں
روئی روتی کاجل آنکھیں
کس نے آخر روگ لگایا
کیوں ہیں تیری جل تھل آنکھیں
تیری یاد میں جاگ رہی ہیں
میری بوجھل بوجھل آنکھیں
مجھ کو فلک یاد ہے اب تک
اس کی قاتل قاتل آنکھیں
(فلک زاہد......لاہور)

جو پورا ہوجائے وہ کام کیسا
جو آدھا رہ جائے وہ انتقام کیسا
جو کام نہ آئے وہ پڑھنا کیسا
جس میں منزل نہ ہو وہ آگے بڑھنا کیسا
جو راہ سے بھٹک جائے وہ راہی کیسا
جس میں ہمت نہ ہو وہ سپاہی کیسا
جو چھوڑ جائے وہ سہارا کیسا
جب چھپ جائے وہ بنانا کیسا
جو پورا ہوجائے وہ خواب سہانا کیسا
کہہ دے اس فانی دنیا کو اے الماس
جو ہمت نہ دے وہ حوصلہ کیسا
(الماس تنویر...... لاہور)

وہ کرتے رہے ہم پہ ستم کرنے کی تمنا
ہم کرتے رہے ان پہ سدا مرنے کی تمنا
ملاحوں نے خود کشتی کو ڈبونے کی ہے ٹھانی
کشتی کو ہے موجوں پہ ابھرنے کی تمنا
آوارہ تیرے شانوں پہ زلفوں کی گھٹائیں
ہے میرے ہاتھ سے ان کو بھی سنورنے کی تمنا
کلیوں کی تمنا ہے کہ میں نوچ لوں اس کو
گل کی ہے کچھ روز نکھرنے کی تمنا!!
جو سر کبھی اونچوں کو دکھاتا رہا نیچا
اس سر کو ہے اب جاں سے گزرنے کی تمنا
اک دل کی محبت کی قسم کھائے نہ بدلے
ہر گام ہے دل کو مکرنے کی تمنا
شاکر یہ الگ بات کہ خود گل ہی اڑادے
خوشبو کب کرتی ہے بکھرنے کی تمنا!
(محمد حنیف شاکر...... بھاگووالی ننکانہ صاحب)

چاند کی سمت نظر جائے تو کیا ہوتا ہے
رات کسی کی یاد میں گزر جائے تو کیا ہوتا ہے
کتنی معصوم ادا سے وہ مجھ سے پوچھتا ہے یارو
جب کوئی دل میں اتر جائے تو کیا ہوتا ہے
اے میرے مولا ذرا سا تو بتادے اس کو
آدمی جیتے جی مرجائے تو کیا ہوتا ہے
کوئی انجان سے شخص کا پھر کسی پچھلے پہر
عکس آنکھوں میں ٹھہر جائے تو کیا ہوتا ہے
درد دے کر وہ مجھے ہنستا رہا اور بولا
درد جب حد سے بڑھ جائے تو کیا ہوتا ہے
عشق میں جان چلی جاتی ہے چلی جائے گی
اس راہ گزر کا تو آصف شہزاد یہی انجام ہوتا ہے
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی...... قصور)

ہر وقت تیری ہی باتیں، تیرا ہی ذکر کرنا
اب کام ہمارا ہے تیری ہی فکر کرنا
کبھی تو تم ہم غریبوں کی صدا سنا کرو
کس جرم کی سزا ہے اتنا تو بتادو
مانا کہ ہوئی خطا، جو چاہا تجھے خود سے زیادہ
اقرار جرم کرلیا ہے، در گزر ہماری خطا کرو
یہی سوچ رہے ہیں ہم آفرین
کریں گفتگو کی کہاں سے ابتدا
کوئی گستاخی نہ ہوجائے کرنے میں الفاظ ادا
وہ ہیرا اور ہم کوئلہ ہیں وہ کہاں اور ہم کہاں!
کریں ہم گفتگو ساتھ ان کے آفرین
ہماری اتنی اوقات ہے کہاں!
جی چاہتا ہے آنکھوں میں چھپالوں تم کو
بسا کے دل میں پلکوں پہ سجالوں تم کو
(رابعہ آفرین...... لاہور)

محبت چیز کیا ہے سوچتی ہوں میں
کبھی مدہوش ہوجاتی ہوں اس کو کھوجتی ہوں میں
کبھی شک کی نظر سے دیکھتی ہوں میں
محبت جان بھی ہے اور دشمن جان کی بھی
کبھی یہ چین دیتی ہے کبھی یہ درد کا خنجر دلوں میں گاڑ دیتی ہے
کلیجہ پھاڑ دیتی ہے یہ کبھی ہمدرد ہوتی ہے
ہمارے ساتھ ہنستی ہے ہمارے ساتھ روتی ہے

کبھی یہ سایہ بن کر ساتھ چلتی ہے
کبھی یہ آگ بن جاتی ہے
اور جسم و جاں میں جلتی ہے
ہمارے ہی لہو کو پی کر پلتی ہے
محبت چیز کیا ہے سوچتی ہوں میں
(رشک نور......فیصل آباد)

لگی دل لگی ہو تو کیا کیجیے
اگر غم خوشی ہو تو کیا کیجیے
ہنسوں کھل کھلا کے یہ سوچا تو نے
ہنسی چیخ سی ہو تو کیا کیجیے
یہ دل رو رہا ہے مگر درد سے
لبوں پر ہنسی ہو تو کیا کیجیے
ترے پاس سب کچھ ہے فضل خدا
وفا کی کمی ہو تو کیا کیجیے
پتنگ کی طرح کٹ کے اڑتے رہے
ہوا سر پھری ہو تو کیا کیجیے
امتیاز یاس حسرت تڑپ اور غم
بھی شاعری ہو تو کیا کیجیے
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

جتنے ملے ہم سفر سب مہرباں ملے
جتنے بھی زخم ملے سب بے نشاں ملے
پیاسے تھے جب تو ایک قطرہ بھی نہ ملا
اب کے تو دریا بھی سب بے کراں ملے
یوں تو رہے ساتھ وہ سائے کی طرح
مگر جب آواز دی رستے ویراں ملے
بھولنا بھی چاہیں نہ بھول پائیں گے
ہم کو اپنوں سے ایسے کچھ احساں ملے
رو رو کے سنائیں گے یہ میری کہانی
میرے لفظوں کو کبھی جو زباں ملے
جاں اس لیے دی ہم نے وفا کے نام پر
میدانِ عشق میں ہماری داستاں ملے
(انتخاب: ڈاکٹر رانا عامر شہزاد......ننکانہ صاحب)

دل کی بات لبوں پر لا کر لب تک ہم دکھ سہتے ہیں
ہم نے سنا ہے اس بستی میں دل والے بھی رہتے ہیں
بیت گیا ساون کا مہینہ موسم نے نظریں بدلیں
لیکن ان پیاسی آنکھوں سے اب تک آنسو بہتے ہیں
ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں!
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں
جن کی خاطر شہر بھی چھوڑا جن کیلئے بدنام ہوئے
آج وہی ہم سے بیگانے بیگانے سے رہتے ہیں
وہ جو ابھی اس راہ گزر سے چاک گریباں گزرا تھا
اس آوارہ دیوانے کو جالب جالب کہتے ہیں
(انتخاب: محمد اسحاق انجم......کنگن پور)

میں نے تمہیں بہت چاہا مگر تم ملے ہی نہیں
بہت کوششیں کیں مگر یہ فاصلے مٹے ہی نہیں
جھولی پھیلا کر تمہیں مانگا خدا سے میں نے
مگر خدا نے میری کسی دعا کو سنا ہی نہیں
ہر ایک سے پوچھا تیرا نہ ملنے کا سبب
ہر ایک نے بتایا وہ تیرے لئے بنا ہی نہیں
میں نے تمہیں بہت چاہا مگر تم کسی اور کے ہوگئے
شاید کے اس جہاں میں وفا کا سلسلہ ہی نہیں
(محمد شبیر بوسن......مہرے والا)

میری نظر سے اس وطن کو دیکھو
رنگین پھولوں کی بہاروں کو دیکھو
پیاس صحراؤں کی سیراب میں دیکھو
پانچ دریاؤں کو آبشاروں میں دیکھو
صبا پنجاب کے کشور میں دیکھو
صورت جنت کی اس کی ضیا میں دیکھو
مذہب کا جمال ظہور دیکھو
دروازہ آمد اسلام کا وہ دیکھو
موسموں کی نو بہار دیکھو
باد صبا اور رُت بہار دیکھو
طنطنہ چاروں صوبوں کے دیکھو
آدرش کوکب کوبہ کوبہ دیکھو
شام سہانی لاہور شہر میں دیکھو

تن من دھن دیس پہ فدا دیکھو
کبھی 65 کبھی 71 کی جنگوں کے جذبات دیکھو
اب تو اور بھی دشمن کو منہ توڑ جواب دیکھو
ایٹمی دھماکہ یا پھر غوری میزائل کا شباب دیکھو
(غلام مصطفیٰ بادل۔قصور)

تجھے زندگی کا شعور تھا تیرا کیا بنا
تو خاموش کیوں ہے کچھ تو بتا تیرا کیا بنا
وہ نصیب سے جو تیری جنگ تھی میری بھی تو تھی
میں تو کامیاب نہ ہوسکا تیرا کیا بنا
نئی منزلوں کی تلاش تھی سو بچھڑ گئے
میں بچھڑ کے تجھ سے بھٹک گیا تیرا کیا بنا
میں تو مقابلے میں شریک ہوا تھا اس لئے
کوئی مجھ سے آکر پوچھتا تیرا کیا بنا
مجھے معلوم تھا شکایت میرا نصیب ہے
تو تو امیدوار تھا حبیب کا تیرا کیا بنا
(محمد دانیال۔روڈہ تھل،خوشاب)

وہ میرے بارے میں سوچتی ہے یہی بہت ہے
اس کو میں دیکھوں تو وہ دیکھتی ہے یہی بہت ہے
وہ خود کو میرا نہیں سمجھتی تو کوئی غم نہیں
وہ مجھ کو اپنا تو مانتی ہے یہی بہت ہے
حقیقتوں میں اس کا مجھ سے ملنا ضروری نہیں
وہ مجھ سے خوابوں میں ملتی ہے یہی بہت ہے
اگر وہ میری نہیں ہوئی تو یہ میرا مقدر
مگر میں تو اس کا ہوں یہی بہت ہے
وہ "اداسی" کو نہیں چاہتی تو کوئی بات نہیں
میری چاہت کو تو مانتی ہے بس یہی بہت ہے
(عجب گل اداسی۔ٹنڈوالہ یار)

بھول گیا وہ مجھ کو
اس طرح کہ کبھی یاد بھی نہ کیا
تنہا چھوڑ گیا وہ مجھ کو
اس طرح کہ کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا
اس کی یادوں کا پہرہ کچھ اس طرح تھا مجھ پر
کہ کھو گئی تھی میں، صبح وشام اس میں رہ کر

درد بڑھتا ہی گیا اور
کبھی کم نہ ہوا
میری سانسیں ختم گئیں پر اس کا
انتظار کبھی ختم نہ ہوا
لکڑیاں مجھ پر رکھ کر سب نے
مردہ سمجھ کر مجھے جلا دیا
اور اس کے اعتبار کی قبریں
مجھ کو دفنا دیا!
مجھ کو دفنا دیا!
(کائنات رشک نور۔لاہور)

تجھے عشق ہو خدا کرے
کوئی تجھ کو اس سے جدا کرے
تیرے ہونٹ مسکرانا بھول جائیں
تیری آنکھیں پرنم رہا کریں
تیرے خواب بکھریں ٹوٹ کر
تو کرچی کرچی چنا کرے
تجھے عشق ہو پھر یقین کرے
اسے تسبیحوں پر پڑھا کرے
میں کہوں عشق ڈھونگ ہے
تو نہیں نہیں کہا کرے
تجھے عشق ہو خدا کرے
(خضر حیات۔روڈہ تھل)

تیری جانب اگر چلے ہوتے
ہم نہ یوں در بدر ہوئے ہوتے
ساری دنیا ہے میری مٹھی میں
کون آئے گا اب تیرے ہوتے
اور اب کیوں نہیں نبھاتے تم
اتنے وعدے نہیں کیے ہوتے
پالیا میں نے ساری دنیا کو
کوئی خواہش نہیں تیرے ہوتے
اس کی آنکھوں میں بار پانے کو
کاش ہم خواب بن گئے ہوتے
(انتخاب: ماسٹر محمد خالد عباس۔ننکانہ صاحب)

☆☆

ویران مندر

شہزاد خان۔صادق آباد

سادھو کے مرتے ہی عجیب و غریب آوازیں تہ خانے میں گونجنے لگیں، کان پھاڑ آوازیں جسم و جاں پر سکتہ طاری کررہی تھیں اور پھر سادھو کا سیدھایا ہوا جادوئی انسانی بھیڑیا چیخنے لگا اور پھر......

دل دہلاتی ہوش اڑاتی رگوں میں لہو منجمد کرتی تحیر انگیز اور حیرت ناک کہانی

بگھی گھوڑوں کی بگھی پر سیاہ لبادہ اوڑھے اور لمبا گھونگٹ نکالے ایک پراسرار شخص تیزی سے چابک لہراتے گھوڑوں کو بھگائے چلا جارہا تھا۔ رات کا آخری پہر تھا اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ زمین پر گھوڑوں کے قدموں کے نشان نہیں بن رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں اڑتے جارہے ہوں۔ آسمان پر کہیں کہیں سیاہ بادل لہراتے پھر رہے تھے اور جب بھی چاند کے سامنے آجاتے تو پل بھر کے لئے اندھیرا چھا جاتا ایسا بار بار ہورہا تھا لیکن گھوڑوں کے بھاگنے کے انداز میں ذرا برابر فرق نہیں آتا تھا۔ راستہ کچا تھا اور ان کا رخ سامنے نظر آنے والے گھنے جنگل کی طرف تھا۔ باوجود اس کے کہ ان کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے لیکن وہ اپنے پیچھے گرد وغبار کا ایک گہرا طوفان چھوڑتے جارہے تھے۔ بڑی عجیب وغریب قسم کی سواری تھی۔ کوچوان وقفے وقفے سے چابک لہرا کر ان کی پیٹھ پر مارتا تو پل بھر کے لئے وہ چابک کی آواز سن کر اچھلتے پھر اور زور لگا کر دوڑنے لگتے۔ کچھ ہی دیر میں وہ جنگل کے نزدیک پہنچ گئے۔

رات کی تاریکی میں جنگل کا منظر اچھوں اچھوں کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور موسم میں قدرے ٹھنڈک کا احساس ہورہا تھا۔ جنگل کے نزدیک پہنچتے ہی کوچوان نے انہیں دائیں طرف نظر آنے والے راستے کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑے اس کا اشارہ پاتے ہی اس طرف مڑ گئے۔ تقریباً تین فٹ چوڑا راستہ بل کھاتا جنگل کے اندر جارہا تھا جس پر وہ بھاگتے چلے جارہے تھے۔ جیسے جیسے وہ فاصلہ طے کرتے جارہے تھے ویسے ویسے دور بہت دور ایک پرانی عمارت کے آثار واضح ہوتے جارہے تھے۔ چونکہ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا اس لئے روشنی جنگل کے اندر تک بھی پھیلی ہوئی تھی۔ رفتار کے حساب سے چند منٹوں میں وہ اس عمارت کے نزدیک پہنچ گئے۔ کوچوان نے لگامیں کھینچ کر انہیں روک دیا۔ گھوڑے یوں رک گئے جیسے چابی ختم ہونے پر کھلونے۔

شکل سے عمارت کوئی بہت ہی پرانا مندر دکھائی دے رہی تھی۔ کسی دور میں شاید یہ کوئی شاندار مندر رہا ہوگا لیکن موجودہ گردشِ حالات میں اسے دیکھ کر خوف طاری ہوتا تھا۔ عمارت کی لگ بھگ پچیس کے قریب سیڑھیاں ہوں گی اور اس کے دونوں طرف دو گول ستون بنے ہوئے تھے جن پر نامانوس زبان میں الفاظ کندہ تھے۔ مندر کے مین گیٹ کے عین درمیان ایک پرانی وضع کا گھنٹہ لٹکا ہوا تھا جس کا رنگ سیاہ ہوگیا تھا یا شاید اندھیرے کی وجہ سے ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ کوچوان نے نیچے اتر کر بگھی کے پیچھے کا پردہ



www.urdusoftbooks.com

اٹھا دیا اندر ایک سیاہ رنگ کا تابوت رکھا تھا جس کے اوپر لگے ہوئے شیشے میں سے ایک نوجوان عورت کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی ظالم شخص نے سرنج سے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ تابوت کو اپنے کندھے پر اٹھا کر وہ مندر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس تمام کارروائی میں اس کے چہرے کا گھونگٹ بدستور اسی طرح قائم تھا۔ تابوت کے اترتے ہی گھوڑے ہنہناتے ہوئے تیزی سے ایک جانب بڑھ گئے یوں لگتا تھا جیسے یہ سب ان کے روز کا معمول ہو۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچتے ہی سامنے ایک بڑی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف بہت سے کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے اور ان پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ چھت سے لٹکتے ہوئے مکڑیوں کے جالے زمین تک پہنچے ہوئے تھے اور فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے کافی سارے گڑھے بنے ہوئے تھے لیکن کوچوان تابوت اٹھائے تیز تیز قدموں سے بڑھ رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی مخملی قالین پر چل رہا ہو۔ کچھ ہی دیر میں وہ سامنے نظر آنے والے ایک بڑے سے دروازے میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کی دیواروں کا رنگ گہرا پیلے رنگ کا تھا جس پر جابجا ہندوؤں کے دیوتاؤں کی تصاویر لٹکی ہوئی تھیں۔ ہال کے وسط میں ایک بہت بڑا بت نصب تھا جس کے بہت سے ہاتھوں میں مختلف چیزیں پکڑیں ہوئی تھیں۔ بت کے قدموں میں خشک پھولوں کا ڈھیر تھا اور بہت سے خشک ناریل کے چھلکے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کسی دور میں یہ ایک پرکشش عبادت گاہ رہی ہوگی لیکن اب اس پر ایک عجیب سی نحوست چھائی ہوئی تھی۔ نجانے کن حالات کے تحت لوگ اسے خیرباد کہہ گئے ہوں گے۔ ہال کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کافی بڑا ہوگا۔ چاروں طرف ایک پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوچوان نے تابوت بت کے قدموں کے پاس رکھ دیا اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھے رہنے کے باوجود اس نے کوئی ہلچل نہیں کی تھی اس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی کھلونا روبوٹ ہو اور چابی ختم ہو جانے کے بعد یکدم رک گیا ہو۔ گھونگٹ بدستور اس کے چہرے پر لٹک رہا تھا اور اس نے بھی اسے اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ پھر اچانک ایک آہٹ سی سنائی دی اور یکدم ہال میں کوئی داخل ہوا۔ کسی کے آنے کی آہٹ محسوس کرتے ہی کوچوان کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے پر پڑا گھونگٹ الٹ دیا۔

ایک تنگ و تاریک کمرے کے وسط میں ایک چٹائی پر گیروے رنگ کا لنگوٹ باندھے ایک بوڑھا شخص جس کے لمبے بال اس کے شانوں تک پھیلے ہوئے تھے اور ہاتھوں میں ایک مٹی کا بت تھا کوئلوں سے دہکتی انگیٹھی سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ مٹی کا بت ماش کی دال کے آٹے سے گوندھا گیا تھا۔ اور بناوٹ سے کسی عورت کا ہی لگ رہا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے کچھ پڑھ کر دائیں طرف رکھی ایک ٹرے سے سوئی لیتا اور اسے اس آٹے سے بنے بت کے جسم میں پیوست کر دیتا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہاں جہاں سوئی چبھتی وہاں وہاں خون کے قطرے نمودار ہونے لگتے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی آٹے کے بت میں نہیں بلکہ کسی زندہ انسان کے جسم میں سوئی چبھو رہا ہو۔ تقریباً سات سوئیاں اس میں پیوست کرنے کے بعد اس نے اسے اپنے بائیں جانب رکھی ہوئی ایک چھوٹی سی دھاتی پیٹی میں احتیاط سے رکھ دیا جس کی سطح پر ایک کھوپڑی اور دو ہڈیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اور ان پر سرخ رنگ سے کراس کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ بے چینی سے کسی کا انتظار کرنے لگا۔

کوچوان کے گھونگٹ الٹتے ہی اس کا کریہہ چہرہ سامنے آ گیا اف خدایا! اس کا غلیظ چہرہ دیکھ کر ابکائیاں آ رہی تھیں اس جیسا وحشت ناک چہرہ شاید ہی کسی اور کا ہو۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلے گڑھوں سے باہر لٹک رہے تھے اور اس کی ٹھوڑی لٹک کر ادھر ادھر جھول رہی تھی طوطے کی طرح مڑی ہوئی ناک نے اس کی بدصورتی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ ہال میں داخل ہونے والے شخص کو دیکھ کر کوچوان کے بدن پہ لرزہ طاری تھا۔ اس کے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا تھا جس کا چہرہ تو سامنے کے رخ تھا لیکن اس کا دھڑ پیچھے کی جانب مڑا ہوا تھا۔ ہاتھوں کے لمبے ناخن نیچے لٹک رہے تھے اور اس کے پاؤں کی انگلیاں پانچ کی بجائے آٹھ آٹھ تھیں

جن پر گھنے بال کسی ریچھ کی طرح ہونے کا گمان دیتے تھے۔اس نے ایک کالے رنگ کا چوغہ زیب تن کیا ہوا تھا جس پر فاسفورس سے کسی ڈھانچے کی شکل بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔یہ "سارنگ" تھا۔جسے دیکھتے ہی کوچوان کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

بات سچ تھی کیونکہ وہ ایک باراس کی ایک غلطی پر اسے ایک ایسے علاقے میں قید کر چکا تھا جہاں پر سفلی دنیا کے مؤکل بھی جانے سے گھبراتے تھے۔سزا معاف ہو جانے کے بعد وہ دوبارہ اسے اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنے لگا۔وہ اس کے لئے قبرستانوں سے تازہ لاشوں کو چرا کر لاتا تھا۔وہ پراسرار شخص ان لاشوں کا کیا کرتا تھا اس سے اسے کوئی غرض نہ تھی اور نہ کبھی اس نے کھوج لگانے کی کوشش کی تھی۔"تمہیں یہاں کسی نے آتے ہوئے دیکھا تو نہیں "؟......ایک انتہائی باریک آواز سنائی دی۔"نہیں"......جواب میں ایک اور آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔......"دفع ہو جاؤ"......دوبارہ وہی باریک آواز غرائی۔کوچوان یہ سنتے ہی یوں اٹھ کر بھاگا جیسے اگر اسے ایک لمحے کی بھی دیر ہوگئی تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑے گی۔بھاگتے ہوئے اسے دوبار ٹھوکر بھی لگی لیکن وہ اٹھ کر تیزی سے بھاگتا ہوا ہال سے باہر نکل گیا۔راہداری کراس کرتے ہوئے وہ تیزی سے مندر کی سیڑھیاں اتر کر ایک جانب کھڑی بگھی کی طرف بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے ایک بیل گاڑی جس پر ایک عورت ایک بڑی سے گھٹڑی سامنے دھرے بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں ایک روٹی اور گڑ کی ایک ڈلی تھی۔بیل گاڑی کو ایک ادھیڑ عمر کا شخص ہانک رہا تھا جس کا حلیہ اس کی خستہ حالی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔وہ تیزی سے بیلوں کو ایک باریک چھڑی سے ہانکتے ہوئے بھگانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا تا کہ رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے وہ اپنے گاؤں شام نگر پہنچ جائیں۔آس پاس کے علاقے میں پھیلنے والی پراسرار باتوں کی وجہ سے اسے بہت فکر لگی ہوئی تھی کیونکہ اس کے ساتھ اس کی نوجوان بیٹی صغراں بھی تھی جسے وہ اس کے سسرال سے اپنے بڑے بیٹے کی شادی میں شرکت اور کام کاج کے سلسلہ میں لے کر اپنے گھر جا رہا تھا۔اس کی بیٹی کی شادی قریب کے ایک گاؤں مبارک پور کے ایک کمہار کے بیٹے سے ہوئی تھی۔جو برتن بنا کر گزر بسر کر رہے تھے۔اپنے جیسوں میں بیٹی بیاہ کر وہ قدرے بے فکر ہو گیا تھا۔اور ایک ہفتہ بعد اس کے بیٹے کا نکاح تھا چونکہ اس کے کوئی اور اولاد نہ تھی سوائے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کہ اس لئے کام کاج کے لئے اس کی بیوی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ پڑوس کے گاؤں میں بیاہی ہوئی بیٹی کو کچھ دنوں کے لئے گھر لے آئے تا کہ وہ شادی کے انتظامات میں اس کی بیوی کا ہاتھ بٹا سکے۔

اور اسی سلسلہ میں آج وہ صبح سویرے ہی اسے لینے چلا گیا تھا لیکن اس کی بیٹی کے سسرال والوں نے اسے کھانے کے لئے روک لیا تھا اور پھر کھانے کے بعد وہ ایسے باتوں میں مشغول ہوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور پھر جلدی جلدی تیاری کر کے وہ گھر کے لئے نکل پڑے۔اس کی بیٹی کے سسرالیوں نے اسے رات رکنے کے لئے بہت زور لگایا لیکن وہ اس لئے نہیں رکا کیونکہ گھر میں اور بہت سے کام ادھورے چھوڑ کر آیا تھا۔آدھے راستے میں ہی شام سر پر آ گئی تھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہی شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔دوپہر کا کھانا کھایا ہوا تھا اور انہیں بھوک بھی بہت زوروں کی لگی ہوئی تھی اس کی بیٹی نے چلتے وقت کچھ روٹیاں اور کچھ گڑ کی ڈلیاں ساتھ رکھ لیں تھی جو اس وقت اس کے کام آ رہی تھیں اور وہ انہیں کھانے میں معروف تھی۔ابھی وہ مزید ایک میل ہی چلے ہوں گے کہ آسمان پر گہری سرخ آندھی کے آثار نمودار ہونے لگے اور ساتھ ہی ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔آسمان پر چھانے والی گھٹا کا رنگ گہرا سرخ تھا جو تیزی سے مزید گہرا ہوتا چلا گیا۔

اور پھر اچانک ایک زوردار جھکڑ چلا اور چاروں طرف مٹی ہی مٹی اڑنے لگی۔تیز ہوا میں بیل گاڑی بھی ڈگمگانے لگی بیل بیقرار ہو کر بھرنے لگے جسے سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا۔دھوپ سے بچنے کے لئے بیل گاڑی کے چاروں طرف اور اوپر کی جانب جو کپڑے لگائے گئے تھے وہ

منٹوں میں تیز ہوا کی نظر ہوگئے تھے۔ گردوغبار کے طوفان میں آنکھیں تک کھولنا بہت مشکل ہورہا تھا منہ اور ناک میں تیزی سے مٹی گھستی جارہی تھی۔ ادھیڑ عمر شخص نے ادھ کھلی آنکھوں سے آس پاس نظر دوڑانے کی کوشش کی مگر اڑتی ہوئی مٹی میں ایسا کرنا ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی وہ اسی شش وپنج میں تھا کہ اس کے کان میں ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی اسے دائیں طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھنے کا کہہ رہا ہو، پہلے تو اس نے اسے اپنا وہم خیال کیا لیکن بار بار اسے ایک ہی آواز سنائی دی جانے لگی تو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی بیلوں کا رخ اپنے دائیں طرف موڑ دیا۔ بیل بڑی مشکل سے سیدھے راستے سے ہٹ کر دوسرے راستے کی جانب بڑھنے لگے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ طوفان کی رفتار میں کمی آنے لگی اور پھر اچانک طوفان یوں رک گیا جیسے کبھی آیا ہی نہ ہو۔

جھکڑ جتنی تیزی سے آیا اتنی ہی تیزی سے غائب ہوگیا اور سامنے ایک بہت ہی پرانا مندر دکھائی دیا۔ رات کی تاریکی پھیلنے سے اس کی عمارت انتہائی خوفناک لگ رہی تھی۔ ابھی وہ اسی شش وپنج میں ڈوبا اسے دیکھ رہا تھا کہ اچانک اسے بہت زور سے کسی نے دھکا دیا وہ اچھل کر بیل گاڑی سے نیچے زمین کی طرف گرا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی مندر کی سامنے کی دیوار پھٹی اور ایک خوفناک عورت کا آدھا دھڑ باہر نکلا جس کی آنکھوں کی سیاہ پتلیاں غائب تھیں۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ نے پلک جھپکتے ہی اس نے بوڑھے کی گردن دبوچ لی۔ اتنا فاصلہ ہونے کے باوجود اس ہاتھ نے اس کی گردن کو یوں دبوچ لیا تھا جیسے وہ اس کے انتہائی قریب موجود ہو۔

یہ دیکھ کر بیل گاڑی میں موجود اس کی بیٹی دہشت زدہ ہوکر چیخنے چلانے لگی اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کسی طرح اس عفریت سے اپنے بوڑھے باپ کو بچائے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے اس کے باپ کو گردن سے دبوچ کر عمارت کے اندر گھسیٹ لیا اور دیوار برابر ہوگئی۔

رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تھا اور اس وحشت ناک تنہائی میں اس کے چیخنے چلانے کی آوازوں کی بازگشت دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اس کی مدد کے بجائے بہت سی چمگادڑیں اپنے پر پھڑپھڑاتی ہوئیں مندر سے نکلیں اور فضا میں تحلیل ہوگئیں۔ ابھی اس کی آواز کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے کپڑوں میں شعلے بھڑک اٹھے وہ گھبرا کر بیل گاڑی سے نیچے کودی اور نہ چاہتے ہوئے بھی سیدھی سامنے نظر آنے والے مندر کے دروازے کی جانب بھاگنے لگی اس کے کپڑوں سے اٹھنے والے شعلے اس کے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے وہ اسے مندر کے اندر لیجانے کے لئے ہی ایسا کررہے تھے۔ وہ چیختی چلاتی مندر کی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی سیدھی صحن میں پہنچ گئی۔ سامنے کے رخ ایک تنگ سا راستہ دکھائی دے رہا تھا جس کے آگے خشک پتوں کا ڈھیر پڑا تھا جس پر ایک کالا بلا بیٹھا اپنے پنجوں پر لگا خون چاٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ شعلے اب بجھ چکے تھے وہ خوف زدہ نظروں سے اس کالے بلے کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا اور اس کے جسم کے بال کھڑے ہوگئے تھے۔

بلا یوں خون چاٹنے میں مصروف تھا جیسے اسے صرف اسی کام کے لئے رکھا گیا ہو۔ وہ ہولے ہولے ایک جانب کھسکنے لگی...... "بھاگ کر کہاں جارہی ہو یہاں آنے کا راستہ ہے لیکن واپسی کے لئے جان کی قربانی دینی ہوگی"...... بلے کے منہ سے انسانی آواز سن کر اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ لہرا کر مندر کے فرش پر ڈھیر ہوگئی۔

☆......☆......☆

رات کے تقریباً دو بجے کا وقت ہوگا جب ایک تاریک تہہ خانے میں ایک کھونٹی سے ایک انسانی بھیڑیا لوہے کی زنجیروں سے بندھا غرا رہا تھا اس کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی وقت زنجیروں کو توڑ کر فرار ہوجائے گا۔ اس کے جسم پر ریچھ کی طرح بھورے بال تھے جو گردوغبار سے اٹے پڑے تھے۔ تہہ خانے میں صرف ایک روشندان بنا ہوا تھا جس میں سے چاند کی چاندنی ایک فٹ چوڑے چکور ہالے کی صورت میں فرش پر پڑ رہی تھی اس کے

علاوہ ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔ چاند ہولے ہولے اپنی منزل طے کررہا تھا اور پھر جیسے ہی اس کے آگے آنے والے بادل سرکے اس نے زنجیروں کو ایک زوردار جھٹکا دیا اور زنجیروں کے ٹوٹتے ہی وہ تیزی سے اچھلتا کودتا تہہ خانے کی سیڑھیوں کی جانب بھاگ گیا۔ جن زنجیروں سے وہ بندھا کچھ دیر پہلے انتہائی بے بس دکھائی دے رہا تھا وہی لوہے کی مضبوط زنجیریں چاند کے پوری طرح نمودار ہوتے ہی کچے دھاگوں کی مانند ثابت ہوئیں۔

یہ اسی مندر کے تہہ خانوں میں سے ایک اور تہہ خانے کا منظر تھا جہاں کچھ دیر پہلے ایک کالا بلا موجود تھا اور وہاں کوجوان ایک تابوت لے کر داخل ہوا تھا۔ اس عجیب و غریب مندر میں نہ جانے کتنے تہہ خانے تھے اور وہاں کیسے کیسے اسرار جنم لے رہے تھے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا تھا۔ لیکن جس طرح پے درپے واقعات پیش آرہے تھے اس سے یہ یقین ضرور ہوگیا تھا اس پراسرار اور ویران مندر میں بہت خوفناک اور گھناؤنا کھیل کھیلا جارہا تھا۔ اس مقام پر بنے ہوئے اس بڑے مندر میں نہ جانے کیسے حالات پیش آئے ہوں گے کہ لوگوں نے اسے یوں ویران چھوڑ دیا تھا۔ کسی بھی مذہب کی عبادت گاہ انتہائی مقدس اور قابلِ احترام ہوتی ہے ۔جس کا احترام ہر مذہب کا پرچار کرنے والوں پر لازم ہوتا ہے۔ نہ جانے ایسے کیا نامساعد حالات پیش آتے ہیں کہ لوگ اپنی عبادت گاہوں کو یوں ویران چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بعد میں آسیب اور بری آتمائیں ایسی ویران پڑی ہوئی عمارتوں یا عبادت گاہوں میں بسیرا کرلیتی ہیں اور بعد میں خدا کی مخلوق کو تنگ کرتی رہتی ہیں۔

اس ویران پڑے مندر میں بھی کچھ ایسی بری آتمائیں بسیرا ڈالے ہوئے تھیں جن کے کالے کرتوت آہستہ آہستہ سامنے آتے جارہے تھے۔ سیڑھیوں کے نزدیک پہنچتے ہی اس انسانی بھیڑیے نے ایک زوردار ٹکر سے لکڑی کے دروازے کو ٹکر مار کر گرادیا اور اچھل کر باہر نکل گیا۔ چاروں طرف چاندنی کا سحر پھیلا ہوا تھا جس کی دودھیا روشنی میں ہر چیز نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے ہر چیز پر سفید پاؤڈر چھڑک دیا ہو۔ تہہ خانے سے باہر نکلتے ہی اس انسانی بھیڑیے کا حلیہ ایک دم تبدیل ہوگیا اس کی باچھوں سے دو لمبے لمبے دانت باہر نکل کر اس کی ٹھوڑی تک لٹکنے لگے اور اس کی آنکھیں لمبوتری اور ترچھی ہوگئیں جن میں سفیدی بڑھ گئی اور ہاتھوں کے ناخن کسی خونخوار بھیڑیے کے پنجوں کی مانند ہوگئے ایک نظر میں وہ کوئی خون آشام بھیڑیا ہی لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک نظر ڈالی اور دائیں طرف بھاگنے لگا اس کی رفتار درختوں کی بھول بھلیوں میں بھی اسی طرح تھی جیسے وہ کسی درختوں کے جھنڈ میں بھاگنے کی بجائے کسی سڑک پر بھاگ رہا ہو تھوڑی دیر میں درختوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور سامنے ایک انسانی آبادی نظر آنے لگی۔

تقریباً تیس چالیس گھروں پر مشتمل آبادی میں سے چند ایک مکانات میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ باقی گھروں میں مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ درندہ بھاگتے بھاگتے ایک گھر کے قریب جاکر رک گیا اس کے منہ سے ہلکی ہلکی غراہٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں یوں لگتا جیسے کہیں قریب ہی دو کتے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھ کر غرارہے ہوں۔ کچھ دیر تک کھڑے رہنے کے بعد اس نے آہستہ آہستہ ایک گھر کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے اور اس کے نزدیک پہنچتے ہی ایک زوردار ٹکر سے لکڑی کا کمزور دروازہ توڑ دیا۔ زوردار ٹکر کے سامنے دروازہ ریت کی دیوار ثابت ہوا اور مکان کے اندر کی جانب گر گیا۔

دروازہ ٹوٹنے کی آواز سنتے ہی صحن میں لیٹے ہوئے افراد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کچھ دیر تک تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔

لیکن جیسے ہی ان میں سے ایک بچے کی نظر اپنے سامنے نظر آنے والے ایک انسانی درندے پر پڑی تو اس کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اس کی دیکھا دیکھی گھر کے دیگر افراد نے اس درندے کو دیکھتے ہی چیخنا چلانا شروع کردیا۔ اس انسانی درندے نے ان کے چیخنے چلانے کی پرواہ کئے بغیر لپک کر اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھے ایک دس بارہ سالہ بچے کو اپنے پنجوں میں دبوچا اور لمبی لمبی چھلانگیں بھرتا دروازے کے ٹوٹے ہوئے راستے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر تک تو گھر کے افراد کو سمجھ ہی نہیں آیا کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں دم توڑ چکی تھیں لیکن جیسے ہی ان کے لاشعور نے انہیں اصل حقیقت دکھائی وہ دہشت سے چیختے ہوئے اس درندے کے پیچھے گھر سے نکل گئے۔ لیکن اتنی دیر میں وہ انسانی بھیڑیا ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور سامنے دور دور تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا حالانکہ چاند کی روشنی میں ہر چیز واضح دکھائی دے رہی تھی دور بہت دور جنگل کے درخت کسی دیوؤں کی مانند سر اٹھائے نظر آ رہے تھے لیکن وہ انسانی بھیڑیا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مایوس ہو کر وہ واپس گھر لوٹ آئے ان کے چیخنے چلانے کی وجہ سے آس پاس کے دیگر گھروں کے افراد بھی اٹھ کر ان کے گھر کے صحن میں اکٹھے ہو گئے تھے اور ان کے ساتھ پیش آنے والے حالات کا سن کر دہشت زدہ نظروں سے مکان کے ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اتنی دیر میں کسی نے وہاں کے نمبردار کو بھی اطلاع دے دی جس کے نتیجے میں وہ اپنے دو محافظوں کے ساتھ اس وقت اس متاثرہ گھر کے صحن میں بیٹھا ان سے پیش آنے والے حالات کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔

واقعہ سننے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سر کو بھی ہلا رہا تھا اسے اس سارے واقعہ میں یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ جس قسم کے انسانی بھیڑیے کے بارے میں وہ لوگ باتیں کر رہے تھے اس قسم کے درندے کے متعلق اس نے آج تک نہ سنا تھا اور نہ ہی کبھی کسی اور شخص نے اس کی وہاں کے علاقے میں موجودگی کا ذکر کیا تھا۔ اور اسے یہ بھی پریشانی تھی کہ اب وہ اپنے گھروں کی حفاظت کیسے کر سکیں گے کیونکہ جس قسم کا حلیہ اسے بتایا جا رہا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انتہائی خونخوار اور طاقتور ہے۔ اس کے باوجود اس نے تمام حالات جاننے کے بعد اپنے کچھ بندوں کو اسلحہ وغیرہ دے کر جنگل کی طرف جانے والے راستے پر روانہ کر دیا اس امید پر کہ شاید ابھی تک اس درندے نے اس معصوم بچے کو اپنی درندگی کا نشانہ نہ بنایا ہو۔ اس کے آدمی اسلحہ لے کر جنگل کی طرف بھاگ گئے۔ اور نمبردار باقی بچ جانے افراد کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔

گھر سے باہر نکلتے ہی وہ انسانی بھیڑیا اپنے پنجوں میں بچے کو دبوچے سیدھی سمت جانے کی بجائے اپنی بائیں جانب جانے والی ایک پتلی سی پگڈنڈی پر بھاگنے لگا۔ پکی زمین ہونے کی وجہ سے اسے بھاگنے میں کوئی دقت نہیں ہو رہی تھی۔ خوف کی وجہ سے بچہ شاید بے ہوش ہو گیا تھا اور کسی بے جان کینچوے کی طرح اس درندے کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ کھیتوں میں چاروں طرف گندم کی فصل کے خوشے لہرا رہے تھے۔ اور سوندی سوندی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

چاند اپنے سفر میں مگن تھا چاندنی کا سحر اسی طرح ہر چیز کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھا۔ ستارے خوف سے اپنی آنکھوں سے زمین پر بھاگنے والی مخلوق کو تک رہے تھے۔ تقریباً آدھا میل تک بھاگنے کے بعد اس درندے نے اپنا رخ موڑا اور سامنے نظر آنے والے ایک بڑے سے برگد کے پیڑ کے نیچے جا کر رک گیا۔ برگد کا پیڑ دیکھنے میں انتہائی پرانا اور عمر رسیدہ لگ رہا تھا جس کی جڑیں جنہیں عموماً پیپل داڑھی کہا جاتا ہے زمین تک لٹک رہی تھیں۔ بچے کو ایک جانب لٹا کر وہ درندہ زور زور سے اپنی گردن کو ایک دائرے میں یوں گھمانے لگا جیسے اس کی گردن میں بل پڑ گیا ہو۔ اس کے منہ سے نکلنے والی بھیانک آوازیں بہت ڈراؤنی لگ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے بہت سی چڑیلیں مل کر بین کر رہی ہوں۔

رات کا آخری پہر، بیابان جنگل اور صدیوں پرانا برگد کا بوڑھا پیڑ یہ سوچتے ہی جسم پر کپکپی طاری ہوتی تھی۔ یہ منظر اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ اگر یہ منظر وہ بدنصیب بچہ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھ لیتا تو شاید دہشت سے وقت سے پہلے ہی مر جاتا۔ اپنی گردن کو مسلسل دائرے میں گھماتے ہوئے اسے ابھی چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ یکدم جنگل میں بہت سے افراد کی آوازیں سنائی دینے لگیں یوں لگتا تھا جیسے بہت سے افراد بھاگتے ہوئے اسی طرف آ رہے ہوں کبھی کبھی ٹارچوں سے نکلنے والی روشنیاں لہراتی ہوئیں دکھائی دیتیں۔ آوازوں سے پتہ چلتا

تھا کہ وہ افراد زیادہ دور نہیں اور جیسے کچھ ہی لمحوں میں وہ وہاں پہنچ جائیں گے۔ آوازیں سنتے ہی اس درندے کے لمبوترے کان آسمان کی جانب اٹھ گئے۔ وہ اپنا منہ اٹھائے فضا میں مسلسل کچھ سونگھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا پھیلا ہوا ناک تیزی سے سکڑ اور پھیل رہا تھا اور پھر چند ہی لمحوں میں اس کی چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجادی اور اچھل کر چند افراد اس کے سامنے نمودار ہو گئے۔

☆......☆......☆

وہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں ایک چٹائی پر وہ آڑھے ترچھے انداز میں پڑی تھی یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بڑی بے دردی سے اسے زمین پر لا کر پٹک دیا ہو۔ اس کا انگ انگ درد سے تڑپ رہا تھا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اس کے سامنے ایک بھیانک کالا بلا انسانی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور وہ یہ دیکھ کر وحشت سے بے ہوش ہو کر مندر میں تہہ خانے کے فرش پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اس نے خود کو اس کمرے میں موجود پایا۔ دماغ میں پچھلا خیال آتے ہی وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گئی اور چاروں طرف نظریں گھمانے لگی۔ کمرے میں صرف اس چٹائی کے کوئی اور شے موجود نہ تھی حتیٰ کہ پینے کے لئے پانی تک موجود نہ تھا۔ پیاس سے اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہو رہے تھے۔ اور پھر یہ دیکھ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ کمرے کا کوئی دروازہ ہی نہ تھا چاروں طرف سپاٹ دیواریں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کی چاروں دیواریں ایک دوسرے کی جانب چلنے لگی ہوں یہ محسوس کرتے ہی اس کا سانس بند ہونے لگا وہ سمجھ گئی کہ اگر یہی صورتحال رہی تو وہ ان دیواروں کے درمیان دب جائے گی اور اس کی ہڈیوں کا سرمہ بن جائے گا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لئے ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

دیواریں باقاعدہ یوں چل رہی تھیں جیسے کوئی دور بیٹھا انہیں ریموٹ کے ذریعے چلا رہا ہو۔ آہستہ آہستہ فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا اور پھر اس کچھ ہی منٹوں میں اس قدر کم ہو گیا کہ اسے ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی دور بیٹھا چرخہ کات رہا ہو۔ اس نے دل ہی دل میں موت کو یاد کیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور کچھ دیر تک یونہی بیٹھی رہی لیکن جب کافی دیر تک کچھ نہیں ہوا تو اس نے ہلکے سے اپنی آنکھیں کھولیں تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دیواروں کا وہاں دور دور تک کوئی وجود نہ تھا اور کمرہ اسی طرح تھا جیسے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور خاموشی سے ایک جانب بیٹھ کر آئندہ آنے والے حالات کا انتظار کرنے لگی۔

☆......☆......☆

اس عفریت کا پیچھا کرتے کرتے بیس افراد کی ٹولی میں سے سات افراد ایسے تھے جو اس جانب نکل آئے تھے۔ کھیتوں میں چلتے چلتے وہ مسلسل باتیں بھی کرتے جا رہے تھے۔ لالٹینوں کی روشنی میں پگڈنڈیوں پر چلتے کوئی مشکل پیش نہیں آ رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر انہیں ایک بہت بڑا برگد کا درخت نظر آیا۔ پھر ایک خیال کے تحت انہوں نے اپنا رخ اس جانب موڑ دیا اور پھر جیسے ہی گھوم کر وہ اس پیڑ کے سامنے پہنچے تو دہشت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کے سامنے ایک بھیانک شکل مخلوق اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی۔ اب سے کچھ دیر پہلے وہ خود اسے ڈھونڈ رہے تھے اور اب جبکہ وہ ان کے سامنے موجود تھی تا خوف سے ان کے قدم من من کے ہو گئے تھے اور انہیں اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔

انہوں نے سوچا کہ فوراً بھاگ کر اس عفریت سے اپنی جانیں بچائیں لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت سے آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ ان کے قدموں نے زمین کو یوں پکڑ رکھا تھا جیسے مقناطیس کسی لوہے کو پکڑتا ہے۔ یہ دیکھ کر اس مخلوق نے ان کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

☆......☆......☆

اس نے جیسے ہی گھر میں قدم رکھا ایک زوردار دھماکے سے پیتل کا گلاس اس کی پیشانی سے ٹکرایا وہ اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا اور فوراً اپنی پیشانی پر دایاں ہاتھ رکھ لیا۔ درد کی اک تیز لہر اس کے سر میں اٹھ رہی تھی اور جہاں گلاس لگا تھا وہاں ایک سرخ گومڑ تیزی سے ابھر گیا تھا۔ اس

نے درد سے کراہتے ہوئے صحن میں کن انکھیوں سے دیکھا تو روز کے معمول کی طرح اس کی زبان دراز بیوی اس کی ماں سے الجھی دکھائی دی۔ رشید پیشے کے لحاظ سے ایک دوکاندار تھا جس کی شہر میں ایک چھوٹی سی دوکان تھی جس پر جنرل اسٹور کے ساتھ ساتھ کریانہ کی چیزیں بھی تھیں۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی اسے ایک لمحے کے لئے بھی سکون کا سانس نہیں ملا تھا۔ ایک جاننے والے دور کے رشتہ دار کے توسط سے ایک غریب گھرانے میں اس کی شادی ہوگئی تھی۔ سسرال میں ساس اور بیوی کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ ساس اپنے مرحوم خاوند کی پنشن پر گزارہ کرتی تھی اور دو کمروں کے مکان میں سکونت پذیر تھی۔ شادی کے شروع کی دنوں میں اس کی بیوی نے انتہائی فرماں برداری سے کام لیا اور اس کا ہر کام ہنس ہنس کر کرتی رہی۔ لیکن جیسے ہی اس نے محلے میں کچھ ناپسندیدہ عورتوں کے ساتھ میل جول شروع کیا ویسے ویسے اس کی عادات اور رویہ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ اب وہ بات بے بات رشید سے جھگڑنے لگتی اور کبھی کبھی تو ایسا لگتا جیسے وہ اس کی بیوی نہیں بلکہ کوئی بھوکی شیرنی ہو جو کسی بھی لمحے موقع ملتے ہی اسے چیر پھاڑ کر ہڑپ کر جائے گی۔ اور سچ بات تو یہ تھی کہ رشید بھی کبھی کبھی اس کے سلوک سے خوف زدہ ہو جاتا اور نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کر لیتا۔

لیکن آج تو حد ہوگئی اور اس کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا جس کے نتیجے میں وہ اپنا سر پکڑے گھر کی دہلیز پر بیٹھا اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ اسے یوں زمین پر بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں جھگڑنا بند کر کے لپک کر اس کی طرف بھاگیں اور اس کی ماں نے واویلا مچاتے ہوئے اسے پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور اپنے ہاتھ سے اس کی پیشانی مسلنے لگی۔ گومڑ پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی بہو کو کوسنے دینے لگی۔ بعد میں رشید کو سہارا دیتے ہوئے اندر کمرے میں پڑے ایک روغنی پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کے لیٹتے ہی اپنے دوپٹے کو ایک گولے کی شکل دے کر منہ سے پھونک مار کر گرم کیا اور جلدی سے اسے اس کی پیشانی سے لگا دیا۔

رشید درد سے تڑپ رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بندوق اٹھائے اور دو گولیاں اپنی بیوی کے سینے میں داغ دے تاکہ ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ختم ہو جائے۔ لیکن ایسا وہ صرف سوچ سکتا تھا اور عملاً ایسا کرنے سے قاصر تھا۔ ماں کے ہاتھ سے گرم کپڑے کی ٹکور سے اسے کچھ سکون ملا اور اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند سو گیا۔ اسے سوتا دیکھ کر اس کی ماں نے سکون کا سانس لیا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے روز وہ صحن میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی کہ اس کے گاؤں سے ایک عورت ملنے اس کے گھر آئی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی اداسی اور فکرمندی دیکھ کر اس نے اس کی خیریت جاننا چاہی تو جیسے وہ کب سے بھری بیٹھی تھی کہ ہمدردی کے دو بول سنتے ہی اس نے روتے روتے تمام حالات تفصیل سے اسے بتا دیئے۔ وہ عورت جیسے جیسے اس کے منہ سے باتیں سنتی جا رہی تھی ویسے ویسے اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی رام کہانی سن کر اس نے اسے شاہ بابا سے ملوانے کا کہا۔

"شاہ بابا!"...... یہ کون ہے؟ رشید کی ماں نے دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے پوچھا۔ "شاہ بابا...... ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں جو بھی اپنا دکھ ان کے پاس لے کر جاتا ہے وہ اس سے بہت فائدہ حاصل کر کے لوٹتا ہے۔ اس کے قبضے میں موکل ہیں جن کی مدد سے وہ بگڑے کام سنوارتے ہیں اور دکھی لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ تم اگر چاہو تو ان سے مل کر اپنا مسئلہ بیان کرو اور مجھے امید ہے کہ وہ تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ اور اچھی بات یہ ہے کہ وہ اپنے کام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں لیتے"۔ اس عورت نے تفصیل بتائی۔

"لیکن میں ان سے کیسے اور کہاں مل سکتی ہوں؟"...... رشید کی ماں نے جواباً پوچھا۔ "اس کی تم فکر نہ کرو ان سے ملنے کی ذمہ داری تم مجھ پر چھوڑ دو میں ایک دو بار ان سے مل چکی ہوں اور میرے ساتھ تم باآسانی ان سے مل سکتی ہو۔ تم جب چاہو میں تمہیں ان سے ملوانے لے جا سکتی ہوں"۔ عورت نے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر یونہی باتیں کرنے کے بعد انہوں نے آپس میں شاہ بابا سے ملاقات کا وقت طے کیا اور بعد میں وہ عورت اس سے رخصت ہوگئی۔

☆......☆......☆

اس کی نظر جیسے ہی نمودار ہونے والے افراد پر پڑی اس نے فوراً جنگل کی جانب دوڑ لگادی۔ غالباً وہ اتنے سارے افراد اور شور سن کر گھبرا گیا تھا اس لئے بھاگنے میں ہی عافیت بھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ان میں سے دو تین افراد شور مچاتے اس کے پیچھے دوڑے لیکن پھر اپنے پیچھے سے واپس بلائے جانے کی آوازیں سن کر واپس پلٹ گئے۔ برگد کے درخت کے نیچے آڑھے ترچھے انداز میں پڑے بچے کو دیکھ کر وہ جلدی سے اس کی جانب بڑھے پہلے تو انہیں یوں لگا جیسے وہ مرچکا ہو لیکن پھر ایک آدمی نے جب اس کی نبض پر ہاتھ رکھا تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی وہ زندہ تھا اور صرف بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ دو افراد نے اسے اٹھایا اور تیزی سے گاؤں کی جانب جانے والے راستے پر چل دیئے۔

گاؤں میں ابھی تک متاثرہ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا بچے کے والدین پر غشی طاری تھی اور سارا صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ گاؤں کا نمبردار بھی کچھ محافظوں کے ساتھ وہیں موجود تھا اور اس کے والدین کو تسلیاں دے رہا تھا۔ لیکن اسے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن واضح محسوس ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس خونی عفریت کے سامنے بے بس تھا۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھا کہ باہر سے شور اٹھا اور ایک آدمی تیزی سے بھاگتا ہوا ٹوٹے ہوئے دروازے سے نکل کر صحن میں آن پہنچا۔ اس کے منہ سے خوشی کے مارے آواز نہیں نکل رہی تھی کچھ دیر سانس بحال کرنے کے بعد جب اس نے یہ بتایا کہ جنگل کی طرف سے کچھ افراد ہاتھوں میں بچے کو اٹھائے چلے آرہے ہیں تو یہ سن کر بہت سے لوگ بھاگ کر گھر کے باہر جمع ہوگئے اور بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگے۔ اور پھر انہیں چاند کی دودھیا روشنی میں جنگل کی طرف سے آنے والے راستے پر وہ سب نظر آگئے۔ اور کچھ ہی دیر میں ان کے نزدیک پہنچ گئے انہوں نے بچے کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا ہوا تھا اور وہ ایک کینچوے کی مانند ان کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ صحن میں داخل ہوتے ہی ان کے لئے ایک چارپائی بچھادی گئی تھی جس پر انہوں نے بچے کو لٹادیا۔

کچھ افراد بچے کے والدین کو ہوش میں لانے کی کوشش میں ان کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔ اور پھر چند ہی لمحوں کی محنت سے انہیں ہوش آگیا اور جیسے ہی انہیں اپنے بچے کی واپسی کا پتہ چلا وہ خوشی سے لہراتے اپنے بچے کے پاس پہنچ گئے لیکن بچے کو بے حس و حرکت دیکھ کر خوف زدہ نظروں سے نمبردار کو دیکھنے لگے۔ نمبردار کو جنگل سے آنے والے افراد نے پہلے سے ہی سب کچھ بتادیا تھا کہ خوف کی وجہ سے بچہ بے ہوش ہے۔ نمبردار نے انہیں تسلی دی اور ایک شخص کو گاؤں کے حکیم کی طرف دوڑالیا۔ تھوڑی ہی دیر میں حکیم اپنا تھیلا سنبھالے نمودار ہوا۔ آتے ہی حکیم نے اس بچے کی نبض ٹٹولی اور سر ہلاتے ہوئے تھیلے میں سے ایک پڑیا نکالی جس میں سفید رنگ کا سفوف تھا۔ اس نے پانی منگوایا اور پڑیا میں موجود تمام سفوف بچے کا منہ کھول کر اس میں انڈیل دیا اور ساتھ ہی تھوڑا سا پانی بھی منہ میں ڈال دیا۔ پھر دو منٹ تک اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بند کردیا۔

ابھی اسے منہ بند رکھے دو منٹ بھی نہ ہوئے تھے بچے نے ایک زوردار جھرجھری لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی اپنے آس پاس ہجوم دیکھ کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت سے دوبارہ چارپائی پر گرگیا۔ اس کی والدین نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے دوبارہ چارپائی پر لٹادیا۔ اسے ہوش میں دیکھ کر دونوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ لوگ بضد تھے کہ ابھی اسلحہ لے کر دوبارہ جنگل کی طرف جایا جائے اور اس درندے کو تلاش کرکے موت کے گھاٹ اتارا جائے تاکہ وہ دوبارہ گاؤں میں داخل نہ ہوسکے۔

لیکن نمبردار نے انہیں ایسا کرنے سے منع کردیا کیونکہ اتنی رات گزر چکی تھی اور ان حالات میں جنگل میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا کیونکہ ایسا نہ ہو کہ اس درندے کے چکر میں وہ لوگ اپنا کوئی نقصان کروالیں۔ پھر یہ فیصلہ طے پایا کہ صبح دن کے اجالے میں جنگل کی طرف نکلا جائے اور اس موذی درندے کو تلاش کرکے ختم کردیا جائے۔ یہ فیصلہ کرتے ہی نمبردار کے کہنے کے بعد تمام افراد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

ہفتہ کے روز رشید کی ماں اپنے بیٹے کو گاؤں میں ایک ضروری کام کا کہہ کر گھر سے نکل پڑی۔ کچھ ہی دیر میں وہ گاؤں جانے والے راستے کے موڑ پر پہنچی تو اسے ایک تانگہ مل گیا۔ گاؤں شہر سے لگ بھگ ڈیڑھ کلومیٹر کے مسافت پر تھا آبادی زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے اور کچی سڑک ہونے کی وجہ سے اس طرف صرف تانگے ہی چلتے تھے اور کوئی موٹر کار یا رکشہ وغیرہ نہیں چلتے تھے۔ کچی سڑک ہونے کی وجہ سے تانگہ بڑے آرام آرام سے چل رہا تھا۔ تانگہ میں اس کے علاوہ مزید تین سواریاں اور تھیں جن میں ایک بوڑھا شخص اور غالباً اس کی بیوی ہوگی جس کی عمر تقریباً پچپن سال کے قریب ضرور ہوگی ان کے ساتھ ایک چھوٹی بچی بھی بیٹھی تھی جس کی عمر دیکھنے میں سات سال کے قریب ہوگی وہ اپنے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کی گڑیا پکڑے کھیلنے اور باتیں کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

کوچوان چابک لہراتے ہوئے گھوڑے کو کچی سڑک پر دوڑانے کی ناکام کوشش میں لگا ہوا تھا لیکن گھوڑا بھی شاید اس کی فطرت سے واقف تھا اس لئے چابک کھانے کے باوجود پرواہ کئے بغیر اپنی رفتار سے آگے بڑھتا جارہا تھا۔ تانگہ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی صرف کبھی کبھی اس چھوٹی بچی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سنائی دیتی تو لمحہ بھر کے لئے خاموشی کا پردہ چاک ہوتا اور پھر یک لخت خاموشی چھا جاتی۔ تانگے کو چلے تقریباً آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا اور وہ بس اب گاؤں کے نزدیک پہنچنے ہی والے تھے۔ کچھ ہی دیر میں گاؤں کے کچے مکان نظر آنے لگے اور دور کھیتوں میں کہیں کہیں عورتیں اور مرد کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ تانگہ گاؤں کی مختلف گلیوں سے ہوتا ہوا ایک بوسیدہ سے مکان کے سامنے آن کر رک گیا۔ دروازے پر ٹاٹ سے بنا پردہ لٹک رہا تھا جس میں جابجا چھید نمایاں تھے۔ رشید کی ماں نے تانگہ رکتے ہی اپنے دوپٹے میں بندھے پیسے کھولے اور ان میں سے تیس روپے نکال کر کوچوان کے ہاتھ میں دے کر تانگے سے اتر گئی۔ اس کے اترتے ہی تانگہ آگے بڑھ گیا۔ اور کچھ ہی لمحوں میں اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

دروازے کے سامنے پہنچتے ہی اس نے پردہ ہٹا کر اس کی کنڈی کو پکڑ کر زور زور سے ہلایا تو کچھ ہی دیر میں اندر سے کسی کے دروازہ کھولنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے وہی عورت کھڑی تھی اسے دیکھتے ہی اس نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دیا اس کے اندر آتے ہی دروازہ بند کرکے وہ اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

رسمی دعا سلام کے بعد اور تھوڑی بہت خاطر مدارت کے بعد وہ دونوں شاہ بابا سے ملنے ان کے ٹھکانے کی جانب چل دیں۔ شاہ بابا کا گھر تلاش کرنے میں انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ وہ عورت پہلے بھی ایک دو بار ان سے مل چکی تھی۔ گاؤں کے آخری مکان کے ساتھ والا گھر شاہ بابا کا ٹھکانہ تھا۔ لکڑی کے بوسیدہ سے دروازے پر سرخ رنگ کیا ہوا تھا جس پر کالے رنگ سے دو کوؤں کے تصویریں بنی ہوئی تھیں جن کی چونچیں سفید دھاگوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ بہت عجیب قسم کی تصویریں تھیں جن کا مقصد سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

دروازے پر پہنچتے ہی اس عورت نے آگے بڑھ کر کنڈی بجائی تو اندر سے ایک نیولے کی شکل کے آدمی نے دروازہ کھولا پھر جیسے ہی اس کی نظر ان دونوں پر پڑی اس نے پیچھے ہٹ کر انہیں اندر آنے کے لئے راستہ دیا۔ رشید کی ماں بڑے غور سے اس نیولے کی شکل کے آدمی کو دیکھ رہی تھی اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ آدمی اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی سانپ کے چھوٹے سے بچے کو دیکھ رہا ہو کہ موقع ملتے ہی وہ اس کے سر کو کچا چبا جائے۔ یہ خیال اسے صرف ایک لمحے کے لئے آیا اس کے بعد اس کے پوچھنے پر وہ چونکی۔ وہ اس عورت سے ان کے یہاں آنے کا مقصد پوچھ رہا تھا۔ پھر جب اسے یہ پتہ چلا کہ وہ شاہ بابا سے ملنے آئی ہیں تو اس نے ایک طرف اشارہ کردیا۔ وہ دونوں اس کے بتائے ہوئے ٹھکانے کی جانب بڑھ گئیں۔ دائیں طرف ایک چھوٹا سا کمرہ دکھائی دے رہا تھا جس کا کوئی دروازہ نہیں تھا اندر اندھیرا دکھائی دے رہا تھا دروازے کے باہر لکڑی کا ایک کھٹولا رکھا ہوا تھا جس میں غالباً گاؤں کے لوگ گائے بھینسوں کو چارہ کھلاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک نلکا لگا ہوا تھا جس کے نیچے کافی سارا پانی کھڑا تھا

جس پر پرندے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔وہ دونوں چلتی ہوئیں اس بغیر دروازے کے کمرے میں داخل ہوگئیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص ایک گیروے رنگ کا لنگوٹ باندھے بیٹھا تھا اس کے مٹی سے اٹے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔اس کی داڑھی کے بال بھی الجھے ہوئے تھے۔ہاتھوں کے ناخنوں میں بھرا میل دیکھ کر کراہت محسوس ہورہی تھی۔رشید کی ماں تو شاید تصور میں کسی نورانی بزرگ کا حلیہ بنا کر آئی تھی لیکن اب اس شاہ بابا کو دیکھ کر اسے بڑی حیرانی ہوئی تھی۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ فوراً یہاں سے بھاگ جائے لیکن پھر اس نے یہ سوچا کہ اس کے ساتھ آئی ہوئی عورت برا محسوس نہ کرے اس لئے چپ چاپ کھڑی رہی۔وہ بوڑھا شخص مراقبے کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا پھر یکدم جھرجھری لیتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔بھینس کی طرح موٹی موٹی آنکھیں جن کا رنگ گہرا سرخ ہورہا تھا یوں لگتا تھا جیسے ان میں خون اترا ہوا ہو بڑا بھیانک منظر پیش کررہی تھیں جن کی طرف دیکھ کر خوف طاری ہوتا تھا۔

وہ سہمے سہمے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔"ہوں!......تو یہ وہ بدنصیب ہے جو اپنی بہو کے ہاتھوں ذلیل ہورہی ہے؟"۔بوڑھے نے اس کے ساتھ کھڑی عورت سے سوال کیا۔

"ہاں! شاہ بابا......یہی وہ بدنصیب عورت ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا اور جس کی زندگی اس کی بہو نے اجیرن کررکھی ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا بیٹا بھی اس کے ہاتھوں بہت تکلیف میں مبتلا ہے۔اس لئے میں اسے یہاں لائی ہوں تاکہ اس کو کوئی تعویذ وغیرہ دیں جس کے استعمال سے اس کا اپنی بہو سے پیچھا چھوٹ جائے"۔اس عورت نے تفصیل بتائی۔

"ٹھیک ہے صرف تمہارے کہنے پر میں اس کا کام کروں گا لیکن اسے یہ تو بتادیا ہے نا کہ میں اس کام کے پیسے نہیں لیتا لیکن میری صرف یہ شرط ہے کہ یہ اس مندر میں موجود چبوترے پر رکھے گل دان میں دو روز تک مسلسل نیلوفر یعنی کنول کے پھول رکھے گی۔اور اگر اس نے ذرا بھی لاپرواہی یا سستی کی تو اس سے اس کی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔اگر اسے یہ شرط منظور ہے تو میں آج بلکہ ابھی سے اس کا کام شروع کردیتا ہوں۔اور ٹھیک تین روز بعد اس کی بہو خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔"......بوڑھے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ایسا کہتے ہوئے اس کے چہرے پر یوں خباثت چھائی ہوئی تھی جیسے کوئی بھوکا بھیڑیا اپنے سامنے کسی بھیڑ کے بچے کو دیکھ کر بوچنے کے لئے بے چین ہو۔

رشید کی ماں سر جھکائے اس کی باتیں سن رہی تھی اس لئے وہ اس کا منحوس چہرہ نہ دیکھ پائی۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا اس پر تو بس یہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح اس کا پیچھا اپنی بہو سے چھوٹ جائے اور وہ سکون سے اپنی زندگی گزارے۔اسے یوں لاتعلق بنے دیکھ کر اس کے ساتھ والی عورت نے شاہ بابا سے اشاروں ہی اشاروں میں کچھ کہا اور اس کی بات کا جواب ہاں میں دیتے ہوئے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ایک تعویذ جھپٹ لیا۔گھر سے نکلتے ہی اس نے اپنی لچھے دار گفتگو سے رشید کی ماں کو شیشے میں اتارا اور پھر وہ تعویذ اس کے مٹھی میں پکڑاتے ہوئے اس کو استعمال کرنے کا طریقہ سمجھانے لگی۔

☆......☆......☆

کمرے میں بند ہوئے اسے تقریباً دو گھنٹوں سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا تھا اور بھوک سے اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔لیکن ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اسے تہہ خانے میں بند کرکے بھول گیا ہو۔کمرے کی دیواریں سپاٹ تھیں۔ابھی اسے بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک ایک دیوار میں پتلی سی لکیر بننے لگی یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی بہت آہستہ سے اس میں کسی تیز دھار آلے کی مدد سے درز بنانے کی کوشش کررہا ہو۔دھیرے دھیرے لکیر موٹی ہوتی چلی گئی اور پھر اس قدر چوڑی ہوگئی کہ اسے کے دوسری طرف کا منظر نظر آنے لگا۔وہ بڑے غور سے اس طرف دیکھ رہی تھی۔

تقریباً تین انچ تک دیوار سرکنے کے بعد دو بھیانک ہاتھوں نے مخالف انداز میں دیوار کو پکڑا اور

مخالف سمت میں دھکیل دیا۔ ہاتھوں کے ناخن لمبائی کی وجہ سے مڑ گئے تھے یہ منظر دیکھتے ہی اس کے منہ سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ اس کے اچانک چیخنے سے کمرے کی خاموشی میں بھونچال آ گیا۔ اور اس کی چیخ کی بازگشت کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ اس کا اس طرح چیخنا اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا۔ اور یک لخت وہ دونوں ہاتھ دوبارہ دیوار کے دوسری طرف غائب ہو گئے اور دیوار پھر سے برابر ہو گئی۔ وہ جو خوف سے اپنی آنکھیں بند کئے چیخے جا رہی تھی۔

جب اس نے کافی دیر تک یہ محسوس کیا کہ اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہے تو اس نے یکدم اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرے کی چاروں دیواریں پہلے والی حالت میں تھیں اور وہاں اس کے علاوہ کوئی اور ذی روح موجود نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور دوبارہ چٹائی پر بیٹھ گئی۔ بھوکے پیٹ ہونے کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ لہراتی ہوئی فرش پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ اس کے زمین پر گرتے ہی سامنے کی دیوار میں ایک اچانک ایک دروازہ نمودار ہوا اور مرغ پر پائے جانے والی مخلوق سے ملتی جلتی شکل کے دو بونے آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور جلدی سے آڑھی ترچھی پڑی صغراں کو خاموشی سے اٹھایا اور دیوار میں نمودار ہونے والے دروازے میں سے لے کر نکل گئے۔

ویران مندر میں نہ جانے کیسے کیسے اسرار چھپے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے اور خالی مکان بھی شیطانی روحوں کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مندر کافی عرصہ سے ویران پڑا ہوا تھا اس لئے اس میں بھی بہت سی خبیث روحوں نے ڈیرے جما لئے تھے۔ جن کے اثرات آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے۔ لیکن سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کسی کو کسی کے کرتوتوں کے بارے میں پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ایسا کیسے ممکن تھا۔ یا اس مندر میں پائے جانے والی کوئی بھول بھلیوں کا کوئی کمال تھا۔ کہ وہ سب ایک دوسرے کے سامنے نہیں آ پا رہے تھے۔

☆......☆......☆

صبح کے تقریباً دس بجے کا وقت ہو گا جب اٹھارہ افراد کا ایک دستہ ہاتھوں میں رائفلیں اور ٹارچیں لئے جنگل کی طرف جانے والے راستے پر چل رہے تھے۔ یہ سب اسی متاثرہ گاؤں کے افراد تھے جہاں گزشتہ شب ایک انسانی درندے نے ایک بچے کو اٹھا لیا تھا لیکن گاؤں والوں کی ہمت اور بہادری کی وجہ سے وہ بچہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس وقت زندہ سلامت اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر میں موجود تھا۔

رات پنچائت میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ صبح ہوتے ہی اس انسانی درندے کو جنگل میں جا کر تلاش کیا جائے اور اسے موت کے گھاٹ اتارا جائے تاکہ پھر کبھی وہ دوبارہ گاؤں میں آنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اور اسی نتیجے میں آج صبح وہ سب گاؤں کے نمبردار کی سربراہی میں اسلحہ سے لیس ہو کر جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کارتوسوں کی پیٹیاں انہوں نے اپنی اپنی کمر سے باندھ رکھی تھیں۔ اور کسی خطرے کے پیش نظر کہ کہیں انہیں جنگل میں رات نہ ہو جائے انہوں نے ٹارچیں بھی پکڑیں ہوئی تھیں۔ یہ تقریباً چار ایکڑ کے قریب پھیلا ہوا جنگل تھا جس میں جا بجا سفیدے اور سنبل کے درخت تھے۔

گنجان ہونے کی وجہ سے کہیں کہیں درختوں میں سے سورج کی روشنی زمین پر پڑ رہی تھی۔ ورنہ ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ درختوں پر چہچہاتے پرندے اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ چونکہ قریب کا جنگل تھا اس لئے کبھی بھی انہوں نے یہاں کوئی خونخوار جانور یا درندہ نہیں دیکھا تھا۔

لیکن گزشتہ رات اس انسانی درندے کی آمد نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ یہ درندہ کہاں سے آیا ہے۔ اور اب بھی جنگل میں موجود ہے یا راتوں رات کہیں اور چلا گیا ہے۔ ان سب سوالوں کا جواب تو انہیں اسی وقت ہی مل سکتا تھا جب وہ جنگل کے اندر جا کر اسے تلاش کرتے۔ یہ سب باتیں سوچتے ہوئے وہ جنگل کے کنارے کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ زمین میں کچی ہونے کی

وجہ سے انہوں نے سوچا کہ شاید اس درندے کے قدموں کے نشان انہیں مل جائیں تاکہ ان پر چلتے ہوئے انہیں اس کا کوئی سراغ مل جائے لیکن یہ سب ان کی خام خیالی تھی کیونکہ کچی زمین ہونے کی وجہ سے اس پر مختلف جانوروں اور انسانوں کے قدموں کے نشان گڈمڈ ہو رہے تھے اس لئے ان میں یہ پہچان کرنا تقریباً ناممکن لگ رہا تھا کہ اس درندے کے نشانوں کو پہچانا جائے۔ اس پر وقت ضائع کرنے کے بجائے انہوں نے دائیں طرف دکھائی دیئے جانے والے ایک کچے راستے کی طرف نظریں دوڑائیں۔

وہ راستہ سیدھا جنگل کے اندر کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کافی عرصہ تک کسی نے اس پر سفر نہیں کیا ہو کیونکہ اس پر جمی ہوئی مٹی اور دھول یہ چیخ چیخ کر بتا رہی تھی کہ اسے ابھی تک کسی انسان یا جانور کے قدموں نے نہیں چھوا۔ وہ بڑی حیرت سے اس راستے کو دیکھ رہے تھے انسانی عقل سے بالاتر بات تھی جو اپنی پوری سچائی کے ساتھ ان کے سامنے تھی۔ کیونکہ جس جگہ وہ کھڑے تھے وہاں تو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی قافلہ یہاں کچھ دیر کے لئے ٹھہرا ہو لیکن اس کے ساتھ جڑے ہوئے راستے کو دیکھ کر وہ سب حیرت سے آنکھیں پھاڑے وہ منظر دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک بت بنے رہنے کے بعد نمبردار کی آواز سنتے ہی وہ سب سکتے کی کیفیت سے باہر آ گئے۔ نمبردار انہیں آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس کی بات سنتے ہی وہ سب اس راستے کی طرف بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

رشید کی ماں اس عورت سے فارغ ہوتے ہی دوبارہ تانگہ پکڑ کر گھر واپس لوٹ آئی تعویذ اس نے دوپٹے کے ساتھ باندھ لیا تھا اور گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھی اپنے کمرے میں گھس گئی اس کی بہو شاید باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھی اس لئے اس نے اسے اندر آتے تو دیکھ لیا تھا لیکن وہ آتے ہی اندر کمرے میں کیوں گھس گئی تھی اس پر غور نہیں کیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی رشید کی ماں نے جلدی سے تعویذ کھول کر صندوق میں رکھ دیا۔ اور خاموشی سے واپس آ کر صحن میں بچھے تخت پر بیٹھ گئی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی کہ وہ گاؤں میں کیا لینے گئی تھی۔ پہلے تو رشید کی ماں نے سوچا کہ اکیلے ہی اس کام کو سرانجام دے لے لیکن وہ چونکہ ایک عورت تھی اور شاہ بابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اسے یہ تعویذ ایک پرانے قبرستان میں موجود بہت پرانی قبر پر رکھے ہوئے جلتے چراغ کے تیل میں ڈبونا تھا۔ اور پھر دس منٹ تک وہیں بیٹھ کر چراغ میں ڈوبے ہوئے تعویذ کی طرف دیکھتے رہنا تھا۔ تاکہ چراغ بجھ نہ جائے ورنہ اس کا اثر بے کار ہو جانے کا خطرہ تھا۔ یہ بات بھی اسے اس عورت کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ وہ تخت پر بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ اس کام کے لئے اسے کس کو اعتماد میں لے ایک بار تو اسے خیال آیا کہ وہ اپنے بیٹے رشید سے مشورہ کرے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ وہ اس کام کے لئے ہرگز راضی نہ ہوگا اس نے یہ خیال جھٹک دیا۔

خیالوں ہی خیالوں میں وہ اپنے محلے میں کسی ایسے شخص یا بچے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی جو کچھ رقم کے عوض اس کے ساتھ قبرستان میں جا کر اسے یہ کام سرانجام دینے میں مدد دے سکے۔ ابھی وہ اسی شش و پنج میں ڈوبی ہوئی تھی کہ یکدم جھپاکے کی طرح ایک خیال اس کے دماغ میں ابھرا اور اسے فیکے موچی کا چہرہ سامنے نظر آنے لگا۔ اس کی جوان بیٹی کی شادی نزدیک تھی اور ابھی پچھلے ہی دنوں جب وہ اپنی چپل جڑوانے اس کے پاس گئی تھی تو باتوں ہی باتوں میں اس نے ذکر کیا تھا کہ اسے پیسوں کی سخت ضرورت ہے اور اس نے اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے ایک بڑی پیٹی خریدنی ہے۔ یہ ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو ابھر آئے تھے۔

یہ خیال آتے ہی اس نے فیکے موچی کو اس کام کے لئے راضی کرنے کا سوچا۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں غرق تھی کہ اس کے بہو نے اس کے سامنے روٹی یوں لا کر رکھی جیسے جیل میں قیدیوں کو کھانا دیا جاتا ہے۔ اس نے خون کے گھونٹ بھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور روٹی کی چنگیر میں رکھی روٹی کھانے لگی۔ وہ دل ہی دل میں اس سے پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

☆......☆......☆

دلجیت سنگھ بہت خوش تھا کیونکہ ٹھیک دو دن بعد اس کی شادی اپنی پسند کی لڑکی پریت کور سے ہونے والی تھی۔ پریت کور وہاں کے ایک مکھیا دارا سنگھ کی چھوٹی بیٹی تھی۔ اس سے بڑی دو اور بہنیں اور تھیں جو اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ اور بہت آسودہ زندگی گزار رہی تھیں اور اپنے گھروں میں بہت خوش تھیں۔ کوئی بھائی تھا نہیں اس لئے چھوٹی ہونے کے ناطے پریت کور ان سب میں لاڈلی تھی۔ خاندان بھر کے سب افراد اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے نہ تھکتے تھے۔ بھگوان نے اس کے نین نقش اور رنگ روپ بھی ایسا دیا تھا کہ جو بھی اسے ایک بار دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اتنے حسن کی بدولت بھی پریت کور بہت با اخلاق اور حیادار لڑکی تھی۔ خاندان بھر کے وہ افراد بھی جنہیں کبھی اسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا اس کی پاکدامنی کی قسمیں کھاتے تھے۔ اس میں شک والی کوئی بات نہ تھی کیونکہ پریت کور حقیقت میں ایک بہت معصوم اور پاکدامن لڑکی تھی۔ اس کی انہی اچھائیوں کی بدولت خاندان بھر میں ہر کوئی اسے اپنی بہو بنانے کا خواہشمند تھا۔

بہت سے لوگ تو اس سلسلہ میں کئی بار رشتے بھی بھجوا چکے تھے۔ جن میں بہت سے ڈاکٹر، انجینئر اور بزنس مین بھی تھے لیکن کہتے ہیں نا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اس لئے ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی ہو جاتی اور اس کے گھر والوں کی طرف سے ہی یا تو سوچنے کا وقت مانگ لیا جاتا یا پھر فوراً انکار کر دیا جاتا۔ دن یونہی ہی گزر رہے تھے کہ ایک دن گاؤں کے مکھیا تارا سنگھ کے گھر سے ان کے بیٹے دلجیت سنگھ کا رشتہ آیا۔ دلجیت سنگھ کہنے کو تو ایک مرد تھا لیکن اس کی ادائیں لڑکیوں سے بھی کہیں زیادہ تھیں وہ اس طرح شرماتا جیسے کوئی نئی نویلی دلہن گھونگھٹ میں شرماتی ہے۔ انتہائی باکردار اور باحیا لڑکا تھا۔

گاؤں میں ہر کوئی اس سے دوستی کا خواہشمند رہتا تھا۔ بہت سی لڑکیاں اس سے شادی کا ارادہ رکھتی تھیں لیکن اس نے کبھی بھی ان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ گاؤں کی تمام لڑکیوں کو اپنی بہنوں کی طرح سمجھتا تھا سوائے پریت کور کے۔ پریت کور واحد ایسی لڑکی تھی جسے وہ چاہتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ پریت کور کو بھی یہ احساس تک نہ ہوا تھا کہ کوئی اسے دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے۔ ایک بار گاؤں میں بیساکھی کا میلہ تھا جس میں آس پاس کے گاؤں سے بہت سے افراد جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے بھی تھے میلہ دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ یہ میلہ ہر سال ان کے گاؤں رام گڑھ میں لگتا تھا یہ پورے تین دن ہوتا تھا اور خوب رونقیں لگی رہتی تھیں۔ مختلف قسم کے کھانوں اور مٹھائیوں کے اسٹال لگتے تھے جن پر سجی رنگ برنگی مٹھائیاں اور چیزیں لوگوں کا دل لبھاتی اور وہ انہیں خرید کر اور کھا کر مزے کرتے۔ لوگوں کی تفریح کے لئے مختلف قسم کے جھولے بھی لگائے جاتے جن پر مناسب ٹکٹ ہوتے تھے تاکہ ہر فرد اس سے لطف اندوز ہو سکے۔ اس کے ساتھ وہاں تلوار بازی اور کشتی کے مقابلے بھی ہوتے جن میں کامیاب ہونے والے بہادروں کو گاؤں کا مکھیا دارا سنگھ خصوصی انعامات سے نوازتا۔ اور مقابلوں میں ہارنے والوں کی جگ ہنسائی ہوتی اور وہ دوبارہ اس گاؤں میں آنے کا تصور بھی نہ کرتے۔

گاؤں کی آبادی تقریباً ڈھائی ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن کی روزی کا ذریعہ کھیتی باڑی تھا۔ بہت سے گھرانے مکھیا کی زمینوں پر کام کاج کر کے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ مکھیا چونکہ ایک نیک دل انسان تھا اس لئے گاؤں کے ہر دکھ درد میں بھرپور ساتھ دیتا اور کبھی بھی کسی ضرورت مند کو اپنے گھر کی دہلیز سے خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ اس سے بہت خوش تھے اور ہمیشہ اس کی لمبی زندگی اور صحت کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ گاؤں کے مکھیا نے اس بار بھی بیساکھی کا میلہ بڑی دھوم دھام سے منانے کا بندوبست کیا تھا جس میں شرکت کے لئے اس نے آس پاس کے گاؤں کے تمام سرپنچوں کو دعوت نامے بھجوا دیئے تھے تاکہ وہ انہیں پڑھ کر اپنے اپنے گاؤں کے افراد کو اس میلہ میں شرکت کے لئے کہہ سکیں۔ جھولے والوں اور مختلف اسٹال لگانے والوں کو حسب دستور ہمیشہ کی طرح پیغامات بھجوا دیئے گئے تھے تاکہ وہ اپنی اپنی تیاریوں میں لگ جائیں اور کوئی بدمزگی پیدا نہ ہو پائے۔ اس میلے میں ہر آدمی کی دلچسپی کا خصوصی خیال رکھا جاتا تھا اور اپنے طور پر مکھیا نے کچھ

افراد کو چوکیداری کی ذمہ داری بھی سونپی ہوئی تھی تاکہ وہ اس میلے میں کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کو جنم لینے سے پہلے ہی کچل دیں۔ اس بار میلے میں دلجیت سنگھ نے بھی تلوار بازی کے مقابلے میں حصہ لینا کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلہ میں اس نے اپنے باپو تارا سنگھ کو کہہ دیا تھا اور اسے اس کی اجازت آسانی سے مل گئی تھی کیونکہ تارا سنگھ کو اس کی مہارت کا بخوبی اندازہ تھا ایسا پہلی بار ہونے جارہا تھا کہ دلجیت سنگھ تلوار بازی کے مقابلے میں حصہ لے رہا تھا ورنہ پہلے وہ صرف دیکھنے کی حد تک ہی ان مقابلوں میں شرکت کرتا تھا اور جیتنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

دوسری جانب پریت کور اپنی بہنوں اور چند سہیلیوں کے ساتھ اس میلے میں شرکت کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی اور اس سلسلہ میں اس نے اپنے باپو سے اجازت بھی مانگ لی تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے بیساکھی کے میلے کا انتظار کر رہی تھی۔ تین دنوں کی مناسبت سے اس نے مختلف لباس بنائے تھے جسے دیکھ کر اس کی دیگر بہنیں رشک کر رہی تھیں وہ سب حقیقت میں اس کی دیوانی تھیں۔ انہیں اپنی بہن پریت کور سے بے انتہا دلی لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود وہ باقاعدگی سے اس سے ملنے اپنے میکے آتی رہتی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ان سب نے مل کر اس میلے میں شرکت کا پروگرام بنایا تھا۔ پھر ایک دن صبح کا سورج نکلتے ہی گاؤں میں شور برپا ہوا کہ میلے کا آغاز ہوا چاہتا ہے اور لوگ بیل گاڑیوں، اور مختلف سواریوں پر سوار رام گڑھ کی جانب رواں دواں تھے۔ بہت سے افراد پیدل ہی سفر کے لئے نکل پڑے رام گڑھ چونکہ تین کلومیٹر تھا اس لئے اتنا فاصلہ پیدل طے کرنا گاؤں کے لئے معمول کی بات تھی اس لئے وہ خوش گپیوں میں مصروف میلے کی جانب جارہے تھے۔

پریت کور کے لئے اس کے باپو نے ایک بہترین سواری کا بندوبست کر دیا تھا جس میں ایک شاندار بگھی شامل تھی۔ وہ سب اس وقت خوش گپیوں میں مصروف بگھی میں سوار رام گڑھ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ بگھی دھیمے دھیمے قدموں سے اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ مسلسل سفر کرنے کے بعد وہ رام گڑھ پہنچ گئے۔

گاؤں میں بہت رش تھا۔ مختلف قسم کے کھانے پینے کے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب بہت بڑا اسٹیج بنایا گیا تھا جو کہ وہاں کے سرپنچوں اور مکھیاؤں کے لئے تھا۔ لوگوں کی تفریح کے لئے مختلف قسم کے جھولے بھی لگائے گئے تھے۔ بگھی کو ایک جانب کھڑا کر کے وہ سب اس سے اتر کر ایک جانب بنے ہوئے ایک حویلی نما گھر کی جانب بڑھ گئیں۔ اس حویلی میں اس کے باپو کے پرانے جاننے والے رہتے تھے جب بھی گاؤں میں بیساکھی کا میلہ لگتا تھا تو وہ یہیں آن کر ٹھہرتے تھے۔ یہاں کچھ دیر آرام کرنے اور تیار ہونے کے بعد وہ سب مل کر میلے میں نکلتے تھے۔ حویلی کے مکینوں کو ان کے آنے کی خبر پہلے ہی کر دی گئی تھی اس لئے ان کے وہاں پہنچتے ہی اس کے مکین ان کے استقبال کے لئے آنکھیں بچھائے کھڑے تھے۔ پریت کور کے باپو ہر سال اس حویلی کے مکینوں کو سال بھر کا راشن ڈلوا دیتے تھے جس میں چاول، گندم، مختلف قسم کی دالیں اور دیسی گھی شامل ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ سب پریت کور کے باپو کے احسان مند تھے۔ اور بدلے میں جب بھی میلے میں پریت کور اور اس کے دیگر عزیز واقارب کی شرکت ہوتی تو وہ بھی ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر باقی نہ رہنے دیتے اور دل کھول کر ان کی خدمت کرتے اور اس طرح وہ ان کے احسان کا بدلہ اتارنے کی کوشش کرتے۔ پریت کور نے انہیں کبھی بھی ان کی حیثیت کا احساس تک نہ ہونے دیا تھا ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھی کیونکہ اس کی نرم دل طبیعت اور معصومانہ پن اس بات کا بین ثبوت تھا۔

شام ہوگئی تھی اور کچھ دیر تک حویلی میں ستانے کے بعد وہ سب میلے میں سیر و تفریح کے لئے نکل پڑے۔ میلہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا پڑا تھا کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ سب گھومتے گھماتے اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے جارہے تھے اور پھر ایک ایسے پنڈال کے سامنے جا کر رک گئے جہاں بہت سے لوگ گھیرا بنائے کھڑے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ابھی کچھ ہی دیر میں وہاں تلوار بازی کا مقابلہ ہونے جارہا ہے جس میں آس پاس کے بہت سے گاؤں

کے سورما حصہ لے رہے تھے جن میں کچھ لوگ دلجیت سنگھ کا نام بڑے ادب اور فخر سے لے رہے تھے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ دلجیت سنگھ پاس کے گاؤں کے مکھیا تارا سنگھ کا بیٹا تھا اور تلوار بازی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ ان کی باتوں نے انہیں تجسس میں مبتلا کر دیا تھا اور انہوں نے وہیں ایک جگہ بیٹھ کر مقابلہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

ابھی انہیں بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک جانب سے شور اٹھا اور لوگوں کے جھرمٹ میں دس بارہ لمبے تڑنگے افراد ہاتھوں میں تلواریں اٹھائے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ تلواروں کی دھار دھوپ نہ ہونے کے باوجود خوب چمک رہی تھی نجانے کس قسم کی تلواریں تھیں۔ وہ سب تلواروں کو اپنے ہاتھوں میں لہراتے بہت پرجوش نظر آ رہے تھے۔ ان کے پنڈال میں پہنچتے ہی ڈھول والوں نے زور شور سے اپنے ڈھول پیٹنے شروع کر دیئے اور پھر ایک جانب سے بگل کی بھاری آواز گونجی جسے سنتے ہی پنڈال میں نظر آنے والے تمام افراد وہاں سے کھسک لئے۔

باقی رہ جانے والوں میں صرف دس بارہ افراد ہی رہ گئے جنہوں نے مقابلے میں حصہ لینا تھا۔ پھر سرپنچوں کے رومال لہراتے ہی دو افراد اچھل کر پنڈال میں بنے ایک دائرے میں داخل ہو گئے اور ایک دوسرے کو خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ کر دیا۔ دیکھنے میں لگتا تھا جیسے وہ دونوں اپنے اپنے کام میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ دونوں بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے پر وار کر رہے تھے اور چونکہ دونوں ماہر تھے اس لئے دونوں کو کوئی زخم آئے تھے۔

مسلسل ایک گھنٹہ تک لڑنے کے بعد دونوں تھک ہار کر زمین پر گر گئے اور اس طرح ہار جیت کا فیصلہ کئے بغیر یہ مقابلہ برابر رہا۔ یکے بعد دیگرے سورما بھی پنڈال میں آتے رہے اور اپنے اپنے داؤ آزماتے رہے۔ ان میں سے دو سورما کامیاب رہے اور سرپنچوں نے انہیں فاتح قرار دیتے ہوئے نقد انعامات کا اعلان کر دیا۔ اعلان سنتے ہی کامیاب سورما کامیابی کے نشے میں وحشت چیخ چیخ کر وہاں لوگوں کو بزدلی کا طعنہ دینے لگے۔ اور للکارنے لگے کہ بھری پنڈال میں اگر کوئی مرد کا بچہ ہے تو ان کے سامنے آئے اور انہیں شکست دے کر دکھائے۔

لیکن تمام افراد تو یوں کھڑے تھے جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ابھی انہیں للکارتے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک خوبرو نوجوان جس نے بڑا نفیس لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی ہاتھ میں تلوار پکڑے پنڈال میں داخل ہوا۔ اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر للکار مارتے دونوں سورما چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ نوجوان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ان کے قریب آن کر رک گیا اور مخاطب ہوا...... "میں تم دونوں کو چیلنج کرتا ہوں کہ اگر تم دونوں مجھے شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو میں دو بیگھہ زمین تم دونوں کے نام لکھ دوں گا اور اگر تم دونوں ناکام رہے تو تم خود اپنے ہاتھوں سے اپنے اپنے سر کے بال مونڈ دو گے اور دوبارہ کبھی اس گاؤں میں نہیں آؤ گے"۔

دلجیت سنگھ نے انہیں تنبیہہ کرتے ہوئے کہا...... اس کی یہ بات سن کر وہ دونوں ہنس پڑے انہیں اس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ نوجوان چند منٹ بھی ان کے سامنے نہیں ڈٹ سکے گا۔ یہ نوجوان دلجیت سنگھ تھا جو پہلے ہی تلوار بازی کے مقابلے میں حصہ لینے کا ارادہ کر چکا تھا ان دونوں سورماؤں کی باتیں سن کر جوش میں سیدھا پنڈال میں داخل ہو گیا تھا۔ سرپنچ جو مقابلہ ختم سمجھ کر سٹیج پر سے اٹھنے ہی والے تھے کہ ایک نوجوان کو پنڈال میں جاتے دیکھ کر دوبارہ اپنی اپنی نشست پر براجمان ہو گئے تھے۔ لیکن اتنی دور سے انہیں ان کی گفتگو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن ان کے انداز سے یہ ضرور ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی بات پر بحث کر رہے ہیں اور پھر کچھ ہی دیر میں ان دونوں نے آگے بڑھ کر اپنی اپنی تلواریں فضا میں لہرائیں اور یکدم اس نوجوان پر حملہ آور ہو گئے ان کے تیور دیکھتے ہی اس نوجوان نے بھی جلدی سے اپنی تلوار سنبھالی اور واہگرو کا نعرہ فضا میں بلند ہوا اور بجلی کی کوندے کی مانند اس کی تلوار چمکی اور ایک ہی وار میں ایک سورما کی تلوار لکڑی کی طرح آدھی کٹ کر ایک جانب گر گئی اور آدھی تلوار دستے سمیت اس کے ہاتھ میں موجود تھی جسے وہ حیرت سے کبھی اسے دیکھتا اور کبھی زمین پر پڑی تلوار کے ٹکڑے کو۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ایسا کیا ہوا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے منوں وزنی ہتھوڑا اس کی کلائی پر ماردیا ہو۔ کچھ لمحوں تک تو کسی کی سمجھ میں بھی یہ نہیں آیا کہ کیا ہوا لیکن معاملہ بھانپتے ہی فضا تالیوں سے گونج اٹھی۔ سورما کے پاس چونکہ اب لڑنے کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ سکتے کی سی حالت میں کھڑا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھتے ہی دوسرے سورما نے زوردار نعرہ مارتے ہوئے اس نوجوان پر حملہ کردیا، حملہ اتنا شدید تھا کہ نوجوان کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور تلوار کی نوک اس کے کندھے کو رگڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ چوٹ اتنی گہری نہیں تھی صرف کندھے کی تھوڑی سے کھال ہی چھل گئی تھی لیکن نوجوان اب سنبھل گیا تھا اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے تیزی سے پینترا بدلا اور پلٹ کر جوابی وار کردیا اس نے تلوار کا ہاتھ گھماتے ہوئے اس سورما کی کلائی پر وار کرنا چاہا۔

لیکن دوسری طرف بھی تلوار بازی کا ماہر تھا اس نے خود کو اس کے حملے سے بچاتے ہوئے جھکائی دی اور ہاتھ اوپر اٹھا کر تیزی سے دوبارہ وار کیا اس بار اس کا نشانہ چوک گیا اور وہ گرتے گرتے بچا اور اس بات کا فائدہ لیتے ہوئے نوجوان نے تیزی سے اس کے سینے پر وار کردیا تلوار کسی نوکدار سریے کی طرح اس کے سینے پر پڑی اور سیدھی اس کو چیرتی ہوئے اندر گھس گئی سورما کے منہ سے ایک زوردار چیخ بلند ہوئی اور خون کا فوارہ بہہ نکلا خون تیزی سے بہنے کی وجہ سے اس پر نقاہت طاری ہونے لگی۔ پنڈال لوگوں کے زوردار نعروں سے گونجنے لگا اور کچھ لوگ بھاگ بھاگ کر پنڈال میں آنے لگے اور اس نوجوان کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔

پریت کور بھی سانس روکے یہ تلوار بازی کا مقابلہ دیکھ رہی تھی اسے اس نوجوان کی بہادری بہت اچھی لگی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے ان دونوں سورماؤں کو چت کردیا تھا جو اپنے غرور کے نشے میں نہ جانے کیا کیا بک رہے تھے۔ بعد میں لوگوں کی باتوں سے اسے معلوم ہوا کہ اس نوجوان کا نام دلجیت سنگھ ہے اور وہ ساتھ کے گاؤں کے مکھیا کا سپوت ہے۔

پریت کور دل ہی دل میں اس نوجوان کی گرویدہ ہو چکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگی تھی۔ پھر کچھ وقت بیتا کر وہ سب واپس اپنے گاؤں واپس پہنچ گئے۔ پریت کور کو اس بات کا اندازہ تک نہ ہوسکا تھا کہ لوگوں کے اس ہجوم میں کوئی اسے بھی نظر بھر کر دیکھ چکا تھا۔ نہ صرف دیکھ چکا تھا بلکہ اپنے دوستوں سے اس کے بارے میں معلومات بھی حاصل کرچکا تھا۔

دلجیت سنگھ کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا تھا ورنہ وہ کبھی بھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا تھا لیکن نہ جانے اس لڑکی میں کیا کشش تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی آنکھوں کو اس کے معصوم چہرے سے ہٹا نہ سکا۔ پریت کور اس کے پڑوس کے گاؤں میں ہی رہتی تھی اور فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا اس لئے وہ جب چاہتا اس کے گاؤں جاسکتا تھا۔ دن گزرنے لگے اور اس دوران وہ کئی بار پریت کور کے گاؤں ہو آیا تھا لیکن اتنے چکر لگانے کے باوجود اسے صرف دو بار ہی اس کا چہرہ نظر آیا تھا اور اس کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ پایا تھا۔ تھک ہار کر اس نے اپنا رشتہ اس کے گھر بھجوانے کا ارادہ کرلیا۔ چند ہی دنوں میں بزرگوں کے میل جول سے یہ رشتہ بخیر و خوبی طے پا گیا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں اور گھر کے سب افراد بارات لے کر پریت کور کے گاؤں جانے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ بگھیوں میں جتے ہوئے سفید گھوڑے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ اپنے ماتھوں پر سجے ہوئے زرد رنگ کے تاج پہنے وہ بہت حسین دکھائی دے رہے تھے۔ گھر کے تمام افراد سمیت تقریباً چالیس کے قریب افراد تھے جو کہ بارات میں شامل تھے۔ جن میں بچے بوڑھے اور خواتین بھی تھیں سب کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔ وہ سب دلہن کے گاؤں جلد از جلد پہنچ کر اس حسین چہرے کو دیکھنا چاہ رہے تھے جس نے ان کے شہزادے جیسے دلجیت سنگھ کا دل جیت لیا تھا۔ وہ دلجیت سنگھ جس نے کبھی سپنے میں بھی کسی لڑکی کو نہ دیکھا تھا نہ جانے کیسے اس لڑکی کا دیوانہ بن گیا تھا کہ جٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوگیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے شادی جیسے بندھن

میں بندھتے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

سب افراد سکتے کی سی کیفیت میں اس جگہ کھڑے حیرت سے اس راستے کو دیکھ رہے تھے جس پر جمی دھول سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے اب تک کسی جانور یا انسانی پاؤں نے کبھی چھوا تک نہ ہو۔ ابھی وہ سب اسی سوچ میں غرق تھے کہ انہیں یکدم نمبردار کی آواز نے جیسے چونکا دیا ہو۔ نمبردار انہیں اس جڑے ہوئے راستے کی طرف بڑھنے کی تلقین کر رہا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھنے لگے انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ قوت انہیں اس راستے پر سفر کرنے کے لئے اکسا رہی ہو۔ نمبردار ان سب کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جس کی وجہ سے انہیں کچھ حوصلہ ہو رہا تھا۔ لیکن اندرونی طور پر وہ سب سہمے ہوئے تھے کہ نجانے کب اور کہاں سے وہ خونی عفریت نمودار ہو جائے اور انہیں آ کر دبوچ لے۔ راستے پر چلتے ہوئے ان کے قدموں کے نشانات بنتے جا رہے تھے وہ سب محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھتے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

لیکن ان سب کو اس بات کا قطعی احساس تک نہ تھا کہ ان کے پیچھے بننے والے ان کے قدموں کے نشانات تیزی سے مٹتے جا رہے تھے ان نشانات پر پھر سے دھول جمتی جا رہی تھی۔ یہ سب اتنی خاموشی اور پراسرار طریقے سے ہو رہا تھا کہ ان میں سے کسی کو بھی اپنے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی تھی۔ تقریباً آدھا میل تک مسلسل چلنے کے بعد وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔ مختلف قسم کے پرندے درختوں پر اپنی اپنی آواز میں چہچہا رہے تھے۔ جنگلی گھاس میں دوڑتے چوہے ادھر ادھر پھدکتے پھر رہے تھے۔ سنبل کے درختوں کی بہتات تھی جن پر لگے بڑے بڑے سرخ پھول بہت بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ اور ان پر پھدکتی گلہریاں اچھلتی کودتی پھر رہی تھیں۔ درختوں کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور تک تو درخت کھلے کھلے فاصلے پر تھے لیکن جیسے جیسے وہ سب آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے جنگل گنجان اور درختوں کا فاصلہ بھی قدرے کم ہوتا جا رہا تھا اور ایک جگہ تو انہیں باقاعدہ ایک ایک کر کے درختوں کے درمیان سے نکلنا پڑا۔

وہ سب خاموشی سے ہاتھوں میں اسلحہ اٹھائے دھیرے دھیرے آگے بڑھتے جا رہے تھے اس دوران انہوں نے چند افراد کو اپنے دائیں بائیں نظر رکھنے کا کہہ دیا تھا اور دو افراد باقاعدہ اپنے پیچھے نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ سب بہت چوکنے انداز میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد درختوں کے اندر سے انہیں کسی پرانی اور بوسیدہ عمارت کے آثار نظر آنے لگے وہ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس عمارت کے سامنے پہنچ گئے۔

عمارت کو سامنے کی طرف سے جنگلی جھاڑیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ شکل سے وہ کوئی بہت ہی پرانا مندر لگ رہا تھا جس کے رنگ و روغن اور عمارت سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے یوں ویران پڑے مدتیں گزر چکی ہوں۔ لوہے کے ایک بڑے گیٹ کے دونوں طرف ستون بنے ہوئے تھے جن کی حالت بھی کافی خستہ تھی ایک نظر میں یوں لگتا جیسے کسی بھی وقت وہ اچانک زمین بوس ہو جائیں گے۔

گیٹ کے عین درمیان میں پیتل کا ایک گھنٹہ جھول رہا تھا شاید وہ کبھی پیتل کا رہا ہوگا لیکن اس وقت اس کا رنگ زیادہ تر سیاہ ہی نظر آ رہا تھا۔ مندر کے اندر جانے کے لئے بہت سی سیڑھیاں تھیں جن کی بہت سی اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں اور بہت سی خستہ حالت میں لگی ہوئی تھیں۔ وہ سب عمارت کے سامنے موجود چند درختوں کے جھنڈ میں موجود تھے اور آپس میں سرگوشیوں میں بات چیت کر رہے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق شاید وہ انسانی بھیڑیا اسی عمارت میں چھپا ہوگا کیونکہ وہ جب سے جنگل میں چلتے آ رہے تھے اس وقت سے کوئی انہونی بات واقع نہ ہوئی تھی اور نہ کہیں سے انہیں اس انسانی بھیڑیے کی موجودگی کے کوئی آثار نظر آئے تھے وہ سب اس بات پر بھی متفق تھے کہ شاید اس ویران مندر میں داخل ہونے کا کوئی اور خفیہ راستہ بھی موجود ہو اور وہ درندہ اسی راستے سے ہی آتا جاتا ہو۔ خیر یہ سب قیاس آرائیاں ہی معلوم ہو رہی تھیں اصل حقیقت تو اس مندر کے اندر جا کر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

کافی دیر تک صلاح مشورہ کرنے کے بعد نمبردار نے اپنے چند آدمی اس مندر میں بھیجنے کا فیصلہ سنایا جس کے مطابق ان میں سے چار آدمی اس عمارت میں داخل ہونگے اور وہاں کا جائزہ لے کر انہیں بھی اندر آنے کا اشارہ دیں گے۔ اس فیصلے پر سب نے اتفاق کیا اور پھر چار آدمی جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں اس مندر کے مین گیٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ سیدھے جانے کی بجائے ایک جانب سے آگے بڑھ رہے تھے اس لئے کہ اگر کوئی اندر موجود ہو تو انہیں سامنے سے نہ دیکھ پائے۔ نمبردار ان کے ساتھ جانے کی بجائے وہیں رک گیا تھا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ حالات کے مطابق وہیں رہ کر کوئی اقدام کر سکے۔

شام کا وقت ہو چلا تھا اور درختوں پر شور مچاتے پرندے بھی خاموش ہو گئے تھے اور جنگل میں یوں خاموشی طاری تھی جیسے جنگل کے تمام چرند پرند ہجرت کر کے کہیں اور جا بسے ہوں۔ یا شاید آرام کر رہے ہوں لیکن زمین پر چلنے والے انسان اپنے آرام کی خاطر اس عفریت کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے جس نے ان سب کا سکون برباد کر دیا تھا۔ نمبردار اور باقی پیچھے بچ جانے والے افراد دم سادھے اپنے ساتھیوں کو اس مندر کی جانب بڑھتے دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگ رہے تھے۔

وہ چاروں آہستہ آہستہ چلتے اس کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ گئے پھر ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہی دو افراد ہاتھوں میں پکڑی بندوقوں کا رخ سامنے کی طرف رکھتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے باقی دو افراد نیچے سیڑھیوں کے پاس ہی رک کر ان کے اندر جانے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ دونوں افراد سیڑھیاں چڑھ کر اس مندر کے دالان میں پہنچ کر ٹھہر گئے۔ دائیں جانے خشک پتوں کا ایک ڈھیر موجود تھا اور وہاں اس قدر گندگی اور غلاظت تھی کہ جیسے یہ مندر کی بجائے کوئی کوڑے دان ہو۔ لیکن سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس خشک پتوں کے ڈھیر کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی نے بڑی نفاست سے اسے اکٹھا کیا ہو۔

ابھی وہ بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک ایک سیاہ بلے نے اپنا سر اس ڈھیر سے باہر نکالا اور ان سے مخاطب ہوا...... "اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی اندر بلا لو جو سیڑھیوں سے کان لگائے نیچے کھڑے ہیں"۔...... بلے کے منہ سے انسانی آواز سنتے ہی ان کے رنگ فق ہو گئے اور ان کے جسم یوں ہو گئے جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔

پوری دنیا میں تحقیق کے مطابق اب تک صرف دو پرندوں کو انسانی آواز میں بولنے کا شرف حاصل ہے جس میں ایک مینا ہے اور دوسرا طوطا۔ ان دونوں کی زبانیں انسانی زبان سے ملتی ہیں اس لئے ان دونوں پرندوں کو انسانی لہجے میں سکھانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور یہ بہت جلدی انسانی آواز میں بولنا سیکھ لیتے ہیں۔ اس لئے اس بلے کو انسانی آواز میں بولتا دیکھ کر ان کی حیرت بجا تھی۔ اور پھر ان دونوں کے قدم تو مندر کے فرش سے یوں چپک گئے تھے جیسے لوہا کسی مقناطیس سے چمٹ جاتا ہے۔ وہ بے بسی سے کھڑے اسی بلے کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

اچانک اس بلے نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور سیدھا ان بت بنے جسموں سے کسی توپ کے گولے کی مانند آ ٹکرایا۔ وہ دونوں جس طرح سکتے کی حالت میں کھڑے تھے شاید قیامت تک بھی ہوش میں نہ آتے لیکن اس خوفناک بلے نے انہیں چند منٹوں میں ہی ہوش دلا دیا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کے سینوں پر کسی نے بہت بھاری ہتھوڑا مار دیا ہو اور جس کی ضرب سے انہیں اپنی پسلیاں ٹوٹتی محسوس ہوئیں۔ اور پھر اچانک ٹکرانے سے وہ دونوں تیزی سے زمین کی جانب گرنے لگے لیکن پھر یکدم انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت نے پیچھے سے انہیں سہارا دے دیا ہو۔ وہ آدھے کھڑے اور آدھے گرنے کے انداز میں وہیں رک گئے۔

بلا بھی ٹکراتے ہی تیزی سے زمین پر گرا اور انہیں اس انداز میں کھڑے دیکھ کر اپنا پنجہ بڑے زوردار انداز سے ایک نوجوان کے سینے پر دے مارا۔ وار اتنا زوردار تھا وہ سیدھا اس کا سینہ چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ پنجے

کے وار سے اس کا سینہ پھٹ گیا تھا اور اس کے منہ سے ایک دلخراش چیخ نکلی اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی زندہ انسان کو کسی کند چھری سے ذبح کیا جا رہا ہو۔وار سے سینے میں سے انسانی اعضاء نکل کر باہر گر گئے جس کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی زمین پر جا پڑا۔

بلے نے جھپٹ کر دل کو اپنے پنجوں میں دبوچا اور ایک ہی لمحے میں ہڑپ کر گیا۔دوسرا نوجوان اپنے ساتھی کا بھیانک انجام دیکھ کر تیزی سے پلٹ کر مندر کی سیڑھیوں کی جانب بھاگا لیکن بلا اسے اتنی مہلت کہاں دینے والا تھا اس نے بھاگتے ہوئے نوجوان کو پیچھے سے ہی دوبارہ پنجہ مارا اور اس بار پنجہ اس کی پیٹھ میں گھس گیا اور اس کا بھی وہی انجام ہوا اور اس کا دل بھی اچھل کر جیسے ہی زمین کی جانب گرا بلے نے جھپٹ کر اسے تھاما اور اسے بھی چٹ کر گیا۔دونوں نوجوانوں کی چیخیں سن کر نیچے کھڑے ان کے ساتھی ان کے مدد کے لئے لپک کر سیڑھیاں چڑھنے لگے اور جیسے ہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو اپنے ساتھیوں کا بھیانک انجام ان کے سامنے تھا۔دالان میں خون بکھرا ہوا تھا یوں لگتا جیسے کسی نے بڑی ہی گائے ذبح کر دی ہو۔ان کے ساتھیوں کے کٹے پھٹے جسم زمین پر بکھرے پڑے تھے۔اور ان کے نزدیک ایک کالا بلا بیٹھا خون سے بھرے اپنے پنجے چاٹ رہا تھا۔ان کے اوپر پہنچتے ہی اس بلے نے بھی ان کی طرف دیکھ لیا تھا لیکن وہ برابر اپنے پنجے چاٹنے میں مصروف تھا۔

وہ دونوں سکتے کی حالت میں تھے اور پھر جیسے اچانک انہیں ہوش آگیا اور وہ اس کیفیت سے باہر نکل آئے اور واپس پلٹنے کے لئے مڑے اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر واپس جنگل کی جانب دوڑے لیکن شاید ایسا کرنے میں انہیں دیر ہو چکی تھی اس لئے وہ جیسے ہی مندر کے عمارت سے باہر نکلے۔

مندر کے سامنے کی دیوار پھٹی اور ایک عورت کا آدھا دھڑ اس میں سے باہر نکلا جس کی بے نور آنکھیں سیاہ حلقوں سے عاری تھیں اور اس کا بڑا سا را ہاتھ تیزی سے لہراتا ہوا ان دونوں کی گردنوں تک پہنچا اور انہیں دبوچ کر واپس مندر کی دیوار میں غائب ہو گیا۔اندر کا منظر تو باہر جنگل میں موجود چھپے ہوئے لوگ شاید نہ دیکھ پائے تھے لیکن یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر وہ سب خوف سے چیختے ہوئے واپس جنگل میں بھاگنے لگے۔

نمبردار پر بھی خوف کی کیفیت طاری تھی ظاہر ہے وہ بھی ایک انسان تھا اس لئے اپنے ساتھیوں کا لرزا دینے والا حشر دیکھ کر خوفزدہ ہونا فطری عمل تھا۔دوسرا وہ سب ان کے محافظ کے طور پر بھی ساتھ آیا تھا اس لئے ان کے بھیانک انجام کا خود کو ذمہ دار سمجھ رہا تھا لیکن چونکہ حقیقت سب کے سامنے تھی اس لئے وہ کم از کم اس طرف سے مطمئن ضرور تھا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے ان کے بیوی بچوں کا بھی خیال آ رہا تھا جس کی وجہ سے وہ افسردہ تھا۔اس لئے اپنے ساتھیوں کو بھاگتا دیکھ کر انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا ویسے وہ اس کی کوئی بات سننے کی پوزیشن میں نہ تھے اس لئے انہیں واپس جاتا دیکھ کر وہ بھی تیزی سے ان کے پیچھے لپکا۔

☆......☆......☆

دونوں بونے آدمیوں نے ہاتھوں میں جھولتی صغراں کو لے جا کر ایک تہہ خانے میں رکھی لکڑی کی بنچ پر لٹا دیا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو سائیڈ میں لٹکے چمڑے کے بیلٹوں سے کس کر باندھ دیا اور یہی عمل اس کے دونوں پاؤں پر دہرایا گیا۔اس کام سے فارغ ہو کر وہ تہہ خانے میں موجود ایک سوراخ میں داخل ہو گئے......اس سوراخ جیسے تین اور چوکور سوراخ جن کی لمبائی اور اونچائی تقریباً تین فٹ ضرور ہو گی موجود تھے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دائیں طرف والی دیوار سے ایک عجیب الخلقت شکل کا گوریلا نما انسان برآمد ہوا جس کے سر کے لمبے بال اس کے شانوں تک جھول رہے تھے......چہرے پر گوریلے کی مانند موٹی ناک جس میں ایک تھالی جیسا زیور پہنا ہوا تھا اور اس نے سیاہ رنگ کا لنگوٹ بھی کسا ہوا تھا جس پر زرد رنگ سے دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔جس کے عین درمیان ایک سفید بچھو کی تصویر چھپی ہوئی تھی۔اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں ایک چمکدار چھری پکڑی ہوئی تھی......وہ سوراخ سے نکلتے ہی سیدھا بنچ پر لیٹی صغراں کے نزدیک آن کر ٹھہر گیا۔وہ اسے یوں للچائی ہوئی

نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے کچا ہی چبا جائے گا۔ پھر وہ اپنے لبوں پر زبان گھماتے ہوئے اس کے بازو کی جانب بڑھا اور تیز دھار چھری سے اس کے ننگے بازو پر وار کردیا۔

صغراں کے منہ سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی اور تہہ خانے اس کی چیخ سے گونجنے لگا...... اور اس کے چہرے پر انتہائی کرب کے آثار پھیل گئے چوں کہ وہ کسی کیمیکل کے زیر اثر نہ تھی اس لئے چھری کا وار سہتے ہی فوراً ہوش میں آگئی اور تکلیف سے اپنا سر دائیں بائیں پٹخنے لگی۔ پھر اپنے سامنے ایک گوریلا نما انسان کو پا کر دوبارہ بیہوش ہوگئی۔ بازو کٹتے ہی خون کا ایک فوارہ سے نکلا اور اس کے تازہ تازہ خون بنچ سے بہتا ہوا نیچے زمین پر گرنے لگا۔ کٹا ہوا بازو اٹھا کر اس گوریلا نما انسان نے ایک زوردار چیخ ماری یوں لگا جیسے کسی نے بہت تیز والا سائرن بجادیا ہو۔

ابھی اس کی چیخ کی بازگشت ختم بھی نہ ہوئی تھی تہہ خانے کی باقی دیواروں میں موجود دیگر سوراخوں سے دو مزید مکروہ صورت انسان برآمد ہوئے انہوں نے بھی اپنے اپنے ہاتھوں میں مختلف قسم کے اوزار پکڑے ہوئے تھے......

صغراں جو کہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہوچکی تھی اور اپنے ساتھ آئندہ آنے والے حالات سے بے خبر بنچ پر پڑی تھی۔ ان دونوں مکروہ صورت افراد نے اپنے اپنے اوزاروں سے بنچ پر لیٹی صغراں کے جسم سے اپنے اپنے من پسند گوشت کے ٹکڑے کاٹے اور ایک دوسرے کو اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ ان سوراخوں میں گھس گئے جہاں سے وہ کچھ دیر قبل نکلے تھے۔

تہہ خانے کے فرش پر دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ابھی ابھی وہاں کوئی گائے ذبح کی ہو۔ صغراں کا جسم ہولے ہولے کانپنے لگا تھا۔ ایک ویران مندر کے تہہ خانے میں ایک زندہ انسان کے کٹے ہوئے جسم کا منظر ہوش اڑادینے کے لئے کافی تھا جسے دیکھ کر لرزہ طاری ہوتا تھا۔ ان دونوں افراد کے غائب ہوتے ہی ایک بھیانک شکل عورت جس نے اپنی پیٹھ پر ایک مشین باندھ رکھی تھی جیسے عموماً فصلوں پر سپرے کرنے والے باندھتے ہیں اور اس کی لمبی سی نوزل اس نے اپنے دائیں ہاتھ میں تھام رکھی تھی...... اس کے سیاہ چہرے پر لٹکتے ہوئے سرخ بال بہت برے لگ رہے تھے۔ اپنے حلیے سے وہ کوئی چڑیل ہی لگ رہی تھی جسے دیکھ کو خوف آرہا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی بنچ پر لیٹی صغراں کے قریب آئی اور نوزل کا رخ اس کی طرف کرکے اپنے ہاتھ سے مشین کی سائیڈ پر لگا ہینڈل اوپر نیچے ہلانے لگی اس کے ایسا کرتے ہی سبزی مائل پانی کی ایک موٹی دھار صغراں کے ادھڑے جسم پر پڑنے لگی۔ جہاں جہاں اس پانی کی پھوار پڑ رہی تھی وہاں سے اس کا جسم مرکری کی مانند پگھل پگھل کر نیچے بہنے لگا۔ پھر کچھ ہی دیر میں وہاں تہہ خانے کے فرش پر پانی ایک ڈھیر کی صورت اکٹھا ہوگیا۔

نجانے اس سبزی مائل میں کیا ایسی تاثیر تھی کہ اس نے چند لمحوں میں ایک انسانی جسم کے گوشت اور ہڈیوں کو یوں گلادیا تھا جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ ہو۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی اس بری شکل عورت نے اپنی پیٹھ پر بندھی مشین اتار کر تہہ خانے کے فرش پر رکھ دی۔ اور دائیں طرف نظر آنے والے کاٹھ کباڑ میں سے ایک پرانا کپڑا اٹھایا اور اس سے زمین پر بکھرا ہوا صغراں کا خون صاف کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں خون کا ایک دھبہ تک نہ تھا۔ اس نے کپڑا ایک جانب اچھالا اور دوبارہ سوراخ میں گھس گئی......

☆......☆......☆

یہ رات کے تقریباً گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب دو سائے سیاہ چادریں اوڑھے شہر سے دور ایک پرانے قبرستان کے دروازے کی جانب بڑھے جارہے تھے جسمانی خدوخال سے ظاہر ہورہا تھا کہ ان میں ایک مرد ہے اور ایک عورت ہے۔ وہ دونوں بہت محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ بڑی خاموشی سے قبرستان کے دروازے کی جانب جارہے تھے۔

دروازے کے قریب پہنچ کر انہوں نے آہستہ سے لوہے کا آہنی گیٹ دھکے سے کھولا...... دروازہ چونکہ مقفل نہ تھا اس لئے دھکا لگتے ہی فوراً کھل گیا ویسے بھی اسے بند کرنے کا کوئی جواز نہ تھا کونسا کسی نے وہاں سے کوئی خزانہ چرا کرلے جانا تھا۔

قبرستان کے سامنے کی دیوار پکی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف جنگلی جھاڑیاں اور گھاس پھونس اگی ہوئی تھی۔ جھاڑیاں ایک باڑ کی صورت اختیار کر گئی تھیں جس کی وجہ سے دور سے وہ دیواریں ہی محسوس ہوتی تھیں۔ دروازہ کھلتے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئے اور دوبارہ دروازہ بند کر دیا۔ قبرستان میں موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی کبھی کبھی نزدیک سے کسی جھینگر کی آواز سنائی دیتی تو لمحہ بھر کے لئے خاموشی میں ارتعاش سے پیدا ہوتا اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

یہ قبرستان لگ بھگ تین ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا جس میں دور دور تک بہت سی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں بہت سی قبریں مرمت اور دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے خستہ حالت میں تھیں اور بہت سی قبریں گڑھوں کی صورت میں تھیں یہ ان کے وارثوں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ کبھی کبھی دور سے گیدڑوں کے رونے کی آوازیں سنائی دے جاتیں تو دل دہل جاتا کہتے ہیں کہ رات میں آسمانی بلائیں زمین پر اترتی ہیں تو زمین پر چرند پرند اور جانوروں خصوصاً بلی اور کتوں کو وہ نظر آتی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ روتے اور چلاتے ہیں۔

ایک حدیث پاک میں ہے کہ ”اپنے بچوں کو مغرب کے وقت گھروں سے باہر نہ نکالا کرو کیونکہ ایسے وقت میں بلائیں باہر نکلتی ہیں اور انہیں نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ جب بھی کسی کسی جانور کو روتے ہوئے دیکھیں تو فوراً آیت الکرسی کا ورد کرنا چاہیے کیونکہ اس کے پڑھنے سے بری بلاؤں کو آگ لگ جاتی ہے اور وہ نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ آیت الکرسی پڑھنے والے کے ساتھ اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے جو اس کے پڑھنے والے کی حفاظت کرتا ہے۔“

وہ دونوں خاموشی سے قبرستان میں ایسی قبر کی تلاش میں تھے جو پرانی ہو اور اس پر جلتا ہوا چراغ بھی موجود ہو۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں قریب ہی قبرستان کے گورکن کا مکان تھا جس کے اندر سے دیئے کی روشنی اس کی دیوار میں بنے ایک گول روشندان سے باہر آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

چونکہ رات کا وقت تھا اس لئے وہ بھی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اور ویسے بھی کسی نے قبرستان سے بھلا کیا لینا دینا تھا اس لئے وہ بے فکری کی نیند سو رہا تھا۔ مکان سامنے دیکھ کر وہ پلٹ کر دوبارہ دوسری جانب بڑھنے لگے۔

شاہ بابا نے انہیں بہت مشکل کام سونپا تھا کیونکہ ایک ایسی قبر جو بوسیدہ بھی ہو اور اس پر چراغ بھی جل رہا ہو تقریباً ناممکن لگ رہا تھا۔ کیونکہ زیادہ تر لوگ ان قبروں پر ہی چراغ جلاتے ہیں جو تازہ بنی ہوں ورنہ بوسیدہ اور خستہ قبر جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو بھلا اس پر کوئی چراغ کیوں جلائے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک امید کے سہارے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ پھر کچھ دیر تک بھٹکتے رہنے کے بعد وہ مایوس ہو گئے...... اور دل برداشتہ ہو کر واپس جانے کے لئے سوچنے لگے۔

یہ دونوں فیکا موچی اور رشید کی ماں تھے جو شاہ بابا کے حکم کے مطابق اس وقت قبرستان میں موجود تھے۔ رشید کی ماں نے بڑی مشکل سے فیکے موچی کو ایک تگڑی رقم دینے کا وعدہ کر کے اس کام کی تکمیل کے لئے رضامند کیا تھا پہلے تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا لیکن جب اسے اس کی بیٹی کی شادی پر اٹھنے والے اخراجات کا احساس دلایا تو اس نے بھی ساتھ دینے کی حامی بھر لی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کا بھی وعدہ کرنا پڑا تھا کہ یہ راز مرتے دم تک کسی کو نہ بتایا جائیگا۔ یہ سب باتیں طے کر کے وہ آج اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اس وقت اس پرانے قبرستان میں موجود تھے۔

لیکن یہاں پہنچ کر انہیں یہ احساس ہو چلا تھا کہ جس کام کو وہ آسان سمجھ رہے تھے وہ اتنا آسان نہ تھا بلکہ بہت مشکل کام تھا۔ اور اب ایک پرانی قبر پر جلتا ہوا چراغ ڈھونڈنا ان کے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

تقریباً آدھا گھنٹہ تک تلاش جاری رکھنے کے بعد وہ دونوں ایک جگہ رک کر آپس میں بات چیت کرنے لگے۔ ”لگتا ہے اس قبرستان میں کوئی ایسی قبر نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔ اس لئے ہمیں آج واپس لوٹ جانا

چاہئے اور پھر کسی مناسب وقت میں کسی اور قبرستان میں جا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہئے"......رشید کی ماں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا......

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی اچھا ہوتا اگر آج ہی ہم یہ کام انجام دے لیتے کیونکہ روز روز آدھی رات کے بعد اپنے گھروں سے نکلنا کون سے آسان بات ہے اور پھر اگر گھر کے افراد میں سے کسی کو شک ہوگیا تو ہمارا راز کھل سکتا ہے اور ہم مشکل میں بھی پڑ سکتے ہیں"۔ فیکے نے بھی جواباً کہا......

"لیکن جب ہمیں ایسی قبر ہی نہ ملے گی تو ہم کیسے یہ کام سرانجام دے سکتے ہیں؟ کیونکہ شاہ بابا کے مطابق اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو ہم اپنا مقصد نہیں پاسکتے"......رشید کی ماں نے جواب دیا۔

ابھی وہ آپس میں کھڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے اچانک انہیں اپنے قریب ایک آہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں سہم کر اس طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر ایک گونج دار آواز نے خاموشی کا طلسم توڑ دیا۔ دونوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ایک زوردار باجہ ان کے کانوں کے قریب لا کر یک لخت بجا دیا ہو انہیں یوں لگا جیسے یہ گونجدار آواز ان کے کانوں کے پردے پھاڑ کر رکھ دے گی۔ لیکن ایسا صرف ایک لمحے کے لئے ہوا اور پھر یکدم دوبارہ یوں خاموشی چھا گئی کہ انہیں اپنے سینوں میں دھڑکتے دل کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔

وہ دونوں خوف و ہراس میں ڈوبے کھوئی کھوئی نظروں سے ایکدوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا جیسے وقت نے انہیں پتھر کا بنا دیا ہو۔ کچھ دیر تک اسی کیفیت میں رہنے کے بعد جیسے یکدم انہیں کسی نے جھنجھوڑ دیا ہو اور وہ ہوش میں آگئے ہوں۔ ان کے چاروں طرف گھپ اندھیرا ڈیرے ڈالے ہوئے تھا اور قبرستان اسی طرح اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے تھا اور وہ اس کے بیچوں بیچ کھڑے آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگے۔

اس خوفناک آواز نے انہیں بہت خوفزدہ کر دیا تھا اور انہوں نے اپنا پلان ملتوی کر کے اپنے گھروں کی راہ لی۔ راستے میں وہ دونوں خاموش ہی تھے اور گھروں کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے سرگوشی میں کچھ بات کی اور فیکا موچی اپنے گھر کے اندر گھس گیا اور رشید کی ماں بھی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

نمبردار کے ساتھ آئے اس کے آدمی خوفزدہ ہو کر واپس گاؤں کی طرف جانے والے راستے کی جانب بھاگتے چلے جارہے تھے جو کہ جنگل کے اندر سے ہو کر جارہا تھا جنگل رات کے اندھیرے میں اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں دیو اور جنات اپنے سر اٹھائے ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہوں۔ نمبردار چونکہ خود بہت ڈر گیا تھا مندر کے اندر جو کچھ اس نے اپنی جاگتی آنکھوں کے ساتھ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوتا دیکھا تھا وہ اس کے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا۔ وہ ان کے تعاقب میں ان کے پیچھے ہی بھاگتا چلا جارہا تھا خوف کی وجہ سے اس کے پاؤں اس کا ساتھ دینے میں کامیاب نہیں ہورہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ان کے پیچھے بھاگتا چلا جارہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ انہیں مسلسل آوازیں دینے کی کوشش بھی کررہا تھا لیکن جیسے کسی نے اس کے حلق میں کانٹے گاڑ دیئے ہوں کہ جو اس کی آواز کو اس کے حلق میں قید کرنے میں لگے ہوں۔

تقریباً بیس پچیس منٹ تک مسلسل بھاگتے رہنے کے بعد وہ اس جڑے ہوئے راستے پر پہنچ گئے۔ رات کے وقت بھی راستے کی مٹی فاسفورس یا ریڈیم کی مانند چمک رہی تھی۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس پر کسی قسم کے چلنے کا نشان اب بھی واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہے تھے اور اس بار بھی انہیں یہ بہت عجیب لگا تھا۔ نجانے اس میں قدرت کا کیا بھید تھا۔ بحر حال اس وقت ایسی باتوں پر غور کرنے کی بجائے انہیں اپنی جان بچانے کی فکر زیادہ تھی اور وہ اندھا دھند اس راستے پر بھاگتے چلے گئے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جارہے تھے ویسے ویسے ان کے پیچھے بننے والے ان کے قدموں کے نشان بڑی تیزی سے مٹتے جارہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور ان کے چہرے چاندنی میں یوں لگ رہے تھے جیسے کسی نے

سفید رنگ ان کے چہروں پر پھیر دیا ہو۔

چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا اور راستے کے دونوں طرف لگی جھاڑیوں میں چھپے درندے بڑی حیرت سے انہیں سرپٹ بھاگتے دیکھ رہے تھے۔ جھاڑیوں میں سے ان کی سرخ سرخ آنکھیں چمکتی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ مسلسل سرپٹ بھاگتے رہنے کے بعد کچھ ہی دیر میں وہ کھیتوں میں پہنچ گئے اور ان میں موجود پگڈنڈیوں پر بھاگنے لگے۔ اور تھوڑی دیر میں وہ سب گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔

گاؤں کے نزدیک پہنچ کر وہ چیخنے چلانے لگے اور ان کے اس طرح چیخنے کی آوازیں رات کے اندھیرے میں گاؤں ان لوگوں کو صاف سنائی دیں جو ان کے جنگل میں جانے سے لے کر ابھی تک ان کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ ان کا شور سن کر گاؤں کے بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور ان کو اس طرح رات کے اندھیرے میں گاؤں کی طرف بھاگتے دیکھ کر وہ بھی خوفزدہ ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

گاؤں کے لوگوں کو اپنے سامنے دیکھ کر نمبردار اور اس کے بچ جانے والے آدمی ان کے قریب آ کر یوں زمین پر ڈھیر ہو گئے جیسے کسی نے آٹے کی بوریاں زمین پر لاد دی ہوں۔

☆......☆......☆

دلجیت سنگھ دولہے کے لباس میں کوئی شہزادہ ہی لگ رہا تھا اس کے تمام رشتے دار اس کے گرد گھیرا ڈالے اس سے باتیں اور چھیڑ چھاڑ کرنے میں لگے ہوئے تھے وہ بھی اپنی پربت کور کے ملنے کی خوشی میں ان سب کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو رہا تھا لیکن شاید وہ اپنے آنے والے برے وقت سے بے خبر تھا جو اس کی تاک میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے والدین بارات لے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے ان کی یہ کوشش تھی کہ وہ بارات لے کر جلدی اپنے سمدھی کے گاؤں پہنچیں تاکہ رسومات کی ادائیگی اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد جلدی سے اپنی بہو کو لے کر رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے واپس اپنے گاؤں پہنچ جائیں۔ لیکن ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی باراتی ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوئے تھے ہر کوئی بلاوجہ ہی ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا۔ اور وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے ان کے چہروں پر بے بسی چھائی ہوئی تھی اور باراتیوں پر اپنے غصے کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے جو کہ ان کے نزدیک بہت معیوب بات تھی۔ اس لئے وہ بے چارگی سے ان کی تیاریوں کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ پھر کافی دیر کے بعد کسی نے آواز لگائی کہ بارات چلنے کے لئے تیار ہے اور یہ سن کر انہوں نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

یہ صبح کے تقریباً گیارہ بجے کا وقت ہوگا جب ایک بجی سجائی بگھی پر دلجیت سنگھ اپنے والدین اور دو تین قریبی رشتہ داروں کے ساتھ براجمان تھا۔ بگھی میں جتے سفید گھوڑے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ بگھی کے پیچھے چند اور بگھیوں اور بجی ہوئی بیل گاڑیوں پر دیگر باراتی سوار تھے۔ یہ قافلہ پربت کور کے گاؤں کی جانب رواں دواں تھا جو کہ ان کے گاؤں سے تقریباً پندرہ میل کی مسافت پر تھا ان کے اندازے کے مطابق انہیں پربت کور کے گاؤں پہنچنے میں تقریباً دو گھنٹے لگ سکتے تھے اور وہ سب مطمئن تھے کہ شام کے سائے گہرے ہونے سے پہلے پہلے وہ واپس اپنے گاؤں پہنچ جائیں گے۔

لیکن یہ سب ان کی خام خیالی تھی کیونکہ جب بارات چلی تو راستے میں بچوں اور عورتوں کی ضرورتوں کی وجہ سے ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں کم از کم چار پانچ گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔

بگھی میں جتے گھوڑے آہستہ چلنے پر خوش نہیں تھے لیکن بیل گاڑیوں کی رفتار کی وجہ سے انہیں بھی اپنی چال آہستہ رکھنی پڑ رہی تھی۔ پھر جیسے تیسے کر کے وہ سہ پہر کے وقت گاؤں پہنچ ہی گئے گاؤں میں ان کے استقبال کی تیاریاں عروج پر تھیں چونکہ گاؤں کی ہر عورت اور مرد کو بھی اس نوجوان کو دیکھنے کی حسرت تھی جس نے ان کے گاؤں کی سب سے خوبصورت دوشیزہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اس لئے وہ سب بھی بڑی بے چینی سے بارات کا انتظار کر رہے تھے۔

گاؤں کے داخلی راستے پر وہ سب اکٹھے کھڑے اپنے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لئے ان کے استقبال کے

لئے تیار کھڑے تھے اور پھر جیسے ہی ان کی نظر باراتیوں پر پڑی وہ سب خوشی سے چیخنے چلانے لگے۔ گاؤں کے نزدیک پہنچ کر ان سب کا پرزور انداز میں استقبال کیا گیا اور ان کے گلوں میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے۔ دلجیت سنگھ خوشی سے نہال سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سسرالیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور باراتیوں کے ساتھ ساتھ ان سب کو لے جاکر ایک بڑی سی حویلی میں ٹھہرایا۔ سرخ اینٹوں سے بنی یہ حویلی اپنی خوبصورتی کی مثال تھی۔ جس کا بڑا سا منقش دروازہ کاریگر کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

حویلی کے بیچوں بیچ ایک بڑا دالان تھا جس میں جا بجا تخت پوش بچھے تھے۔ جن پر سرخ رنگ کی چادریں بچھی ہوئیں تھی۔ ان سب کو لے جاکر ان تخت پوشوں پر بٹھایا گیا۔ کچھ ہی دیر میں ان کی خدمت میں ایک ذائقہ دار شربت پیش کیا گیا جس کے منفرد ذائقے کی ہر کسی نے دل کھول کر داد دی۔ عورتیں زنان خانے میں چلی گئی تھیں اور بچے دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کودنے میں لگ گئے۔

پربت کور دلہن کے لباس میں ملبوس کوئی آسمان سے اتری اپسرا لگ رہی تھی۔ ابٹن اور مہندی نے اسے پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور حسین بنا دیا تھا۔

شادی کے سرخ جوڑے میں وہ کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ شرم سے اس کے اندر کی کیفیت کو ظاہر کر رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر اپنے محبوب کو دیکھنے کی تمنا بڑی بے چین ہو۔ اس کی بچپن کی سہیلیوں نے اس کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا تھا اور وہ اس سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں اور وہ بھی کبھی کبھی ان کے مذاق پر کھل کھلا کر ہنس دیتی جس سے اس کے موتیوں جیسے سفید دانت بہت بھلے لگتے تھے۔ غرض یوں لگتا تھا جیسے قدرت نے بھی اسے بڑے پیار سے تخلیق کیا ہو۔

حویلی کے برابر میں ایک بڑے احاطے میں باراتیوں کے سواگت کے لئے کھانے کا انتظام کیا جا رہا تھا جس میں مزے مزے کے پکوان تیار کئے جا رہے تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ حویلی کے اندر ایک بڑے سے کمرے میں پربت کور کو دینے والا جہیز رکھا ہوا تھا جس میں ضرورت کا تقریباً ہر سامان دیا گیا تھا تاکہ شادی کے بعد اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ چھوٹا موٹا سامان بڑے بڑے ٹرنکوں میں رکھ کر ان پر تالے لگا دیئے گئے تھے۔ جن کی چابیاں پربت کور کی والدہ نے اپنی حفاظت میں رکھی ہوئی تھیں۔ جہیز والا کمرہ حویلی کے ایک کونے کی طرف بنا ہوا تھا جس کی طرف کبھی کوئی نہیں جاتا تھا اس کمرے کا اس لئے بھی منتخب کیا گیا تھا کیونکہ دوسرے کمروں میں شادی میں شرکت کرنے والوں کو رکھا گیا تھا۔ اس وقت پربت کور کی والدہ کے ہاتھ میں ایک بڑی سی گٹھڑی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس میں کپڑے بندھے ہوئے ہوں شاید مہمانوں میں سے کسی نے کوئی رسم کی ادائیگی کی ہو۔ وہ گٹھڑی ہاتھ میں لئے جہیز والے کمرے کی جانب بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے نزدیک جاکر اس نے گٹھڑی زمین پر رکھ کر اس پر لگا تالا کھولا اور گٹھڑی زمین سے اٹھا کر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بڑے زور سے سانس لی ہو اور ایک گرم ہوا کا جھونکا اس کے قریب سے ہوکر گزر گیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ بوکھلا گئی لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا کہ شاید کمرہ بند رہنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو کیونکہ اس کمرے میں تمام کھڑکیاں اور روشندان بھی بند تھے اور کہیں سے ہوا کا گزر نہیں تھا اس لئے گھٹن کی وجہ سے اچانک کمرہ کھلنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑی گٹھڑی ایک بڑے سے ٹرنک کے نزدیک رکھ کر اس کا قفل کھولنے لگی۔ قفل کھول کر اس نے جیسے ہی اس کا ڈھکن اوپر اٹھایا اس میں سے ایک بڑا سا کالا اچھل کر باہر نکلا اور تیزی سے اسے حیران ہوتا چھوڑ کر کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ حیران وہ پریشان ساکت نظروں سے اسے باہر نکلتا دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ ایسا کیونکہ ہوا کمرہ میں رکھا ٹرنک تو اس نے خود مقفل کیا تھا اور کمرے کا دروازہ بھی بند تھا اور اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخلے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں تھا پھر ایسا کیسے ہوا کہ ایک سیاہ بلا اس ٹرنک میں بند ہوگیا ہو اور زندہ حالت میں اس کے

سامنے موجود ہو۔ کچھ دیر تک وہ بت بنی کھڑی رہی اور پھر تیزی سے گھبراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور خوف کی وجہ سے اسے کمرہ بند کرنا بھی یاد نہیں رہا۔

☆......☆......☆

مسلسل کوششوں کے باوجود بھی رشید کی ماں اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہیں ہو پائی تھی ایک دوبار رشید کو بھی اس پر شک ہوا کہ جیسے اس کی ماں اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو لیکن اس نے زیادہ غور نہیں کیا لیکن کل تو حد ہوگئی جب اس کو پیاس کی حاجت ہوئی تو اس نے پانی پینے کے لئے جب صحن کا رخ کیا تو اس وقت اس کی ماں گھر کا باہر کا دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہو رہی تھی اس کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ سوئی ہوئی تھی جب اسے گھر کے باہر سے کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں اس لئے وہ صرف یہ دیکھنے کے لئے باہر نکلی تھی لیکن اس کے دیکھنے کے باوجود اس کو گلی میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا تھا لیکن جس طرح وہ نظریں چرا کر اس کے سوال کا جواب دے رہی تھی اس سے اس کے دل میں اس کا گمان پکے شک میں بدل گیا تھا۔ اور وہ راتوں کو جاگ جاگ کر اپنی ماں کے کمرے میں جھانکتا رہتا تھا لیکن دوسری طرف اس کی ماں بھی شاید محتاط ہوگئی تھی اس لئے وہ بھی کافی دنوں سے جیسے گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔

لیکن دل ہی دل میں تلملاتی رہتی تھی کہ کونسی گھڑی ہو جب وہ شاہ بابا کا دیا ہوا تعویذ جلدی سے کسی پرانی قبر میں دبا دے تا کہ اس کی بہو سے اس کی جان چھوٹے۔ لیکن ابھی تک وہ اپنے مذموم مقاصد میں ناکام ہی رہی تھی اور سارا سارا دن اپنی بہو کے کاموں میں کیڑے نکالتی رہتی تھی اور شاید اس کی بہو بھی اب ڈھیٹ ہوگئی تھی کہ اس کے ڈانٹنے ڈپٹنے اور کوسنے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھی جس کی وجہ سے رشید کی ماں اور چڑتی تھی۔

رات کو رشید کے گھر آنے پر اس کی بیوی دن بھر کی کارگزاری اس کے سامنے رکھ دیتی جس میں اس کی ماں کے رویے کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی۔ رشید خود ان دونوں کی روز روز کی نوک جھونک اور شکایتوں سے تنگ آ گیا تھا اس لئے وہ بھی ہر وقت پریشان رہتا کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ خودکشی کر لے تا کہ روز روز کی ان مصیبتوں سے اس کی جان چھوٹ جائے۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ اپنا ارادہ بدل دیتا۔

ایک روز دوپہر کے وقت اس کے ایک دوست کی شادی تھی جس میں اس نے اس کو اس کی فیملی کیساتھ مدعو کیا تھا اور وہ اس کا اچھا دوست تھا جس کی شادی میں شرکت لازمی تھی اس لئے اس نے اپنی ماں اور بیوی کو شادی میں جانے کے لئے کہا رشید کی ماں کو یہ موقع غنیمت لگا اور اس نے جلدی سے اپنی طبیعت کی ناسازگی کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا اور ان دونوں کو شادی میں جانے کا کہا۔

رشید نے کچھ دیر اصرار کیا لیکن پھر اپنی بیوی کو لے کر دوست کی شادی میں شرکت کے لئے گھر سے نکل گیا۔ ان دونوں کے گھر سے نکلتے ہی رشید کی ماں نے جلدی سے شاہ بابا کا دیا ہوا تعویذ کمرے میں چھپائے ہوئے ایک لوہے کے بکس سے نکالا اور اپنے دوپٹے سے باندھا اور گھر کو تالا لگا کر قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر نکل پڑی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ فیکے موچی کو بغیر بتائے ہی اس مسئلے کا حل تلاش کرے گی اور اس طرح اسے فیکے موچی کو پیسے بھی نہیں دینے پڑیں گے اور وہ خاموشی سے اپنا کام بھی مکمل کر لے گی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ بڑی رازداری سے قبرستان کی طرف جانے والے راستے پر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

دوپہر کی وجہ سے اس راستے پر زیادہ لوگوں کا رش نہیں تھا۔ اکا دکا لوگ اس راستے پر آ جا بھی رہے تھے لیکن کسی نے بھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ قبرستان کے قریب پہنچ گئی اور وہاں رک کر ادھر ادھر دیکھ کر اندر داخل ہوگئی۔ قبرستان میں ایک عجیب طرح کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ قبروں پر اگی ہوئی جھاڑیاں ان میں دفن انسانوں کے رشتہ داروں کی بے حسی کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کے عزیز واقارب انہیں وہاں دفنا کر بھول چکے ہوں۔ کچھ جنگلی بیروں کی جھاڑیاں بھی دکھائی دیں جن پر سرخ سرخ بیر بہت بھلے لگ رہے

تھے۔اس نے للچاتے دل کے ساتھ کچھ بیر توڑ کر منہ میں ڈالے تو ان کا ذائقہ میٹھا محسوس ہوا وہ بیر کھاتی ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھنے لگی اسے کوئی ایسی پرانی قبر کی تلاش تھی جس پر دیا بھی رکھا ہو۔

اس وقت وہ دن میں اس لئے قبرستان آئی تھی تاکہ دن کی روشنی میں اپنی مطلوبہ قبر تلاش کر کے اس پر کوئی نشانی لگا سکے تاکہ رات کے وقت اسے مزید وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔رات کے وقت ایسی قبر تلاش کرنے میں بہت دقت ہوتی تھی اس لئے آج گھر میں کسی کے نہ ہونے کی وجہ سے موقع ملتے ہی وہ پرانی قبر کی تلاش میں نکل آئی تھی اور پھر جلد ہی اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔

ایک نیم کے درخت کے نیچے ایک کچی قبر دکھائی دی اور اس کے سرہانے ایک پرانا چراغ بھی دھرا تھا جس میں رکھے تیل سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے روزانہ جلایا جاتا ہے۔اس نے اچھی طرح اس قبر کی نشانی کو اپنے ذہن میں بٹھایا اور واپسی کی راہ لی۔

☆......☆......☆

یہ ایک چھوٹا سا ہال نما کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک کریہہ الشکل انسان جس کے جسم پر گیروے رنگ کا لباس تھا ہاتھ میں ایک ترشول تھامے بیٹھا تھا۔ترشول کے تینوں تیروں پر بندروں کے تازہ سر لٹک رہے تھے جن سے خون بہہ بہہ کر سامنے رکھے ایک پیتل کے تھال میں اکٹھا ہو رہا تھا۔وہ شخص شکل اور حلیے سے کوئی سادھو لگ رہا تھا۔اس کا گنجا سر کمرے میں لگے ایک بلب کی زرد روشنی میں خوب چمک رہا تھا یوں لگتا جیسے اس نے اپنے سر میں سرسوں کے تیل کا خوب استعمال کیا ہو۔

تھال میں جمع ہوتے خون میں اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں ڈبو ڈبو کر وہ اپنے ماتھے پر پھیر رہا تھا جس سے اس کے ماتھے پر خون ایک پپڑی کی صورت جمتا جا رہا تھا اور ایک موٹی تہہ لگتی جا رہی تھی۔یہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے منہ میں کچھ پڑھ پڑھ کر بندروں کی کھوپڑیوں پر بھی پھونکتا جا رہا تھا غالباً وہ کوئی منتر پڑھ رہا تھا لیکن کوئی نامانوس سی زبان تھی جس کا ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ جیسے ہی وہ ان بندروں کی کھوپڑیوں پر منتر پڑھ کر پھونکتا ان کی مردہ آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلتی اور پھر بند ہو جاتیں۔کمرے میں اس وقت اس کے سوا کوئی اور جاندار موجود نہیں تھا۔کچھ دیر تک یہ تماشہ کرنے کے بعد اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے ترشول پر لٹکتی ایک بندر کی کھوپڑی کو پکڑا اور کمرے کے ایک کونے کی طرف اچھال دیا۔

کھوپڑی جیسے ہی فرش سے ٹکرائی ایک زوردار آواز پیدا ہوئی اور یکدم ایک انسانی بھیڑیا اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ایک انگڑائی لیتا ہوا اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔نمودار ہونے والے اس بھیڑیے کے تمام جسم پر لمبے لمبے سیاہ بال تھے اور اس کا بھیانک چہرہ بھی سیاہ بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا جس سے اس کے چہرے کو واضح طور نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

شلماک حاضر ہے مہاراج۔بھیڑیے کے منہ سے ایک باریک سی آواز سنائی دی۔غالباً وہ سادھو کو ہی مہاراج پکار رہا تھا کیونکہ اس کمرے میں ان دونوں کے علاوہ اس وقت کوئی اور موجود نہیں تھا۔سادھو جو اس دوران ترشول زمین پر رکھ کر اسی طرف دیکھ رہا تھا بولا۔۔۔۔”میں نے تمہیں ایک انسانی بھینٹ لانے کے لئے بھیجا تھا لیکن اتنا سا گزرنے کے باوجود بھی تم نے کام نہیں کیا۔۔!سادھو غصے سے لال پیلا ہو کر اس سے مخاطب ہو رہا تھا۔

"مہاراج! میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن عین وقت پر گاؤں کے لوگوں نے میرا پیچھا کیا اور مجھ سے میرا شکار چھین لیا"۔شلماک نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔سادھو کو جواب دیتے وقت اس کے جسم پر یوں لرزہ طاری تھا کہ جیسے کسی بھی وقت سادھو اس کو منتر سے بھسم کر دے گا۔

”لیکن یہ تو ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے جو تم مجھے آج بتا رہے ہو۔“سادھو نے جواباً کہا۔

”جی مہاراج! آپ سچ کہہ رہے ہیں لیکن ان سات دنوں میں، میں دوسرے شکار کی تلاش میں تھا۔“ شلماک نے دوبارہ گھبراتے ہوئے جواب دیا۔یہ بات

کہتے ہوئے اس کے جسم پر مزید لرزہ طاری ہوگیا تھا۔

سادھو کچھ دیر تک غصے سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر غراتے ہوئے اس کو دوبارہ جلد شکار تلاش کرنے کا کہہ کر منہ ہی منہ میں ایک منتر پڑھ کر اس کی طرف پھونک دیا۔ایسا کرتے ہی انسانی بھیڑیا یکدم کمرے سے غائب ہوگیا۔

☆......☆......☆

سورج اپنے دن بھر کا سفر طے کرتا ہوا مغرب کی جانب رواں دواں تھا اور شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔دلجیت سنگھ نکاح وغیرہ سے فارغ ہوکر اور تمام باراتی کھانا کھا کر واپسی کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ دن کی روشنی میں واپسی اختیار نہ کرسکے تھے۔رسومات کی بہتات اور کھانا تیار ہونے میں دیر ہوگئی تھی اس لئے وہ بھی مجبور تھے اور جیسے تیسے کرکے اب واپسی کی تیاری شروع ہوچکی تھی۔جہیز کا سامان دو بیل گاڑیوں پر لاد دیا گیا تھا اور تمام عورتیں اور بچے اپنی اپنی بیل گاڑیوں میں براجمان ہوچکے تھے اور دلجیت سنگھ اپنی دلہن پربیت کور کو لئے اپنی بگھی میں سوار ہوچکا تھا۔گاؤں کے کچھ لوگ انہیں گاؤں کی سرحد تک چھوڑنے آئے تھے اور پھر انہیں الوداع کہہ کر واپس اپنے گھروں کو چل دیئے۔

شام کے سائے گہرے ہونے کی وجہ سے ملگجا ملگجا اندھیرا چار سو پھیلنے لگا تھا اور تمام باراتیوں کو اپنے گھروں کو لوٹنے کی جلدی تھی لیکن اس کے ساتھ رات کا خوف بھی طاری تھا۔کچھ روز پہلے کچھ گاؤں سے ایک عجیب و غریب مخلوق کے قصے ان کے کانوں تک بھی پہنچ چکے تھے اس لئے ایک انجانا سا خوف ان پر طاری تھا۔اتنی بڑی بارات کو رات کو ٹھہرانا دلجیت سنگھ کے سسرالیوں کے بس کی بات نہیں تھی اس لئے مجبوراً انہیں واپسی کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

واپس گاؤں کی طرف جانے والا راستہ پندرہ میل کی مسافت پر تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک شارٹ راستہ بھی ان کے گاؤں کی طرف جاتا تھا لیکن اس کے لئے انہیں ایک گھنے جنگل میں بنے ایک کچے راستے سے ہوکر جانا پڑتا۔

تین میل کی مسافت طے کرنے کے بعد قافلہ رک گیا اور چند بوڑھے اور سمجھدار لوگوں نے باہمی مشورے سے اس چھوٹے راستے کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا جو جنگل میں سے ہوکر گزرتا تھا۔پہلے تو عورتوں اور بچوں نے ان کی مخالفت کی لیکن جب ان کے یقین دلانے پر کہ ان کے پاس لاٹھیاں اور دیگر ہتھیاروں کے علاوہ روشنی کے لئے لالٹین بھی کچھ مقدار میں موجود ہیں تو وہ چپ ہوئے۔

یہ فیصلہ کرتے ہی قافلہ جنگل کی طرف جانے والے راستے پر چل پڑا۔جنگل اندھیرے میں اپنی تمام تر وحشت کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھا ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس سے درختوں کے پتوں سے سرسراتی ہوا بہت عجیب لگ رہی تھی۔چاند آسمان پر موجود تھا لیکن کبھی کبھی کوئی آوارہ بادل کا ٹکڑا اس کے سامنے آتا تو پل بھر کے لئے اندھیرا چھا جاتا پھر چاند نمودار ہوتے ہی دوبارہ ہر طرف دودھیا روشنی پھیل جاتی۔

قافلہ اپنی رفتار سے چلتا جنگل میں داخل ہوگیا۔ راستے کے دونوں طرف بڑے بڑے درخت اور جنگلی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں کبھی کبھی جھاڑیوں سے گیدڑوں کے بولنے کی منحوس آوازیں سنائی دیتیں تو پل بھر کے لئے جنگل کی خاموش فضا میں ایک ہلچل پیدا ہوتی اور پھر یکدم خاموشی چھا جاتی۔رات کے تقریباً سات بج چکے تھے اور جنگل میں یوں لگ رہا تھا جیسے رات کے بارہ بج چکے ہوں۔

جنگل میں آگے تک پہنچ جانے کی وجہ سے اب چاند کی روشنی بھی اس کا اندھیرا ختم کرنے میں ناکام ہوچکی تھی لیکن اس کے اندر بنا کچا راستہ صاف نظر آرہا تھا جس کی وجہ سے انہیں اس پر سفر کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔قافلہ بڑی خاموشی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔وہ بیل گاڑیاں جن میں جہیز، عورتیں اور بچے سوار تھے وہ انہوں نے درمیان میں رکھی تھیں۔

قافلے کے آگے دلجیت سنگھ اور دلہن والی بگھی تھی اور آخر میں گاؤں کے بوڑھے اور جوان اپنی اپنی بیل گاڑیوں کو ہانکتے چلے آرہے تھے۔جنگل کے راستے سے سفر کرنے سے ان کو تقریباً پانچ میل کا سفر بچ جاتا یہی سوچ کر انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا تھا ورنہ اگر وہ سیدھے راستے پر چلتے تو شاید رات کے ایک بجے تک ان کو گاؤں پہنچنا نصیب

ہوتا اکادکا ہوتے تو شاید مرکر بھی ایسا کرنے کا نہ سوچتے چونکہ وہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لئے انہوں نے یہ خطرناک راستہ اختیار کرنے کا سوچا تھا۔

قافلہ کو چلتے تقریباً دو گھنٹے ہوچکے تھے اور اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے وہ بھی مطمئن لیکن ہوشیاری سے اپنے سفر پر رواں دواں تھے۔ دلجیت سنگھ کے برابر میں اس کی دلہن پریت کور سہمی سہمی دکھائی دے رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اچانک کچھ ہونے والا ہو لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ ڈری ڈری دلجیت سنگھ کے بازو سے چمٹی بیٹھی تھی اور خوف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کررکھی تھیں۔ دلجیت سنگھ اس کی اندرونی کیفیت سے محظوظ ہورہا تھا وہ چونکہ خود ایک بہادر شخص تھا اس لئے اس پر کسی قسم کا کوئی خوف طاری نہیں تھا البتہ اسے اس بات کی فکر ضرور تھی کہ رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جارہی تھی اور اس وحشت زدہ ماحول کی وجہ سے عورتوں اور بچوں پر ایک وحشت کی کیفیت طاری تھی۔ اس پہ اسے بھی جلد از جلد اس وحشت زدہ ماحول سے نکل کر اپنے گاؤں پہنچنے کی فکر تھی۔ ابھی انہیں مزید آدھا میل سفر طے کئے ہوا ہوگا۔

اچانک جنگل کے اندر سے ایک انتہائی خوفناک اور دل دہلادینے والی چیخ سنائی دی یوں لگا جیسے کوئی بھیڑیا اپنی تمام طاقت کے ساتھ چلایا ہو۔ جنگل کے خاموش ماحول میں اچانک اس چیخ نے ہلچل مچادی جس کو سنتے ہی درختوں پر بیٹھے پرندے گھبرا کر اپنے اپنے گھونسلوں سے اڑ کر آسمان پر اڑنے لگے اور جھاڑیوں میں دبکے چھوٹے موٹے جانور جو بڑی حیرت سے قافلے کو جاتا دیکھ رہے تھے نکل نکل کر یوں بھاگنے لگے جیسے اگر انہیں ایک لمحے کی بھی دیر ہوگئی تو وہ عفریت ان کو ہڑپ کرجائے گی۔

چیخ کے سنتے ہی عورتیں اور بچے خوف سے چیخنے چلانے لگے اور خود دلجیت سنگھ کے برابر بیٹھی اس کی دلہن بھی خوف سے لہراتی ہوئی اس کی جھولی میں گرگئی۔ دلجیت سنگھ نے جلدی سے اسے ایک طرف لٹایا اور جلدی سے بگھی رکوا کر عورتوں اور بچوں والی بیل گاڑیوں کی طرف دوڑا جہاں کھلبلی مچی ہوئی تھی بچوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی کچھ بچے اور عورتیں خوف سے رو رہی تھیں۔

دلجیت سنگھ کو دیکھ کر ان میں سے کچھ عورتیں خوف سے چپ ہوکر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ دلجیت سنگھ نے انہیں حوصلہ دیا اور خاموش رہنے کا کہہ کر دوسرے نوجوان کے پاس پہنچا جو اس کی طرف ہی بڑھ رہے تھے۔ سب نے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار اور لاٹھیاں اٹھائی ہوئی تھیں اور کچھ افراد نے اپنے ہاتھوں میں لالٹینیں اٹھائی ہوئی تھیں جن کی لو کی پھڑپھڑاتی روشنی اندھیرے کو کم کرنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔

نوجوانوں کے نزدیک پہنچتے ہیں دلجیت سنگھ نے ان کو کوئی ہدایت دی جسے سن کر ان میں سے چند افراد عورتوں اور بچوں کی بیل گاڑیوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک طرح سے انہوں نے انہیں اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ باقی بچ جانے والے چند نوجوانوں کو ساتھ لے کر دلجیت سنگھ قافلے کے آگے آگے چلنے لگا۔

قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا ایک چیخ سنائی دینے کے بعد دوبارہ سنائی نہیں دی تھی لیکن وہ سب چوکنا تھے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اپنے ہتھیاروں کو ہاتھ میں تھامے اس عفریت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس عفریت کو زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد بھی دوبارہ وہ خوفناک آواز سنائی نہیں دی تھی۔ ایسا محسوس کرتے ہی ان پر طاری خوف کچھ کم ہوا اور وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگے۔ اس بار وہ سب پہلے سے زیادہ چوکنے تھے اور ہر قسم کی مصیبت سے نپٹنے کے لئے تیار تھے۔

ابھی انہیں چلے چند منٹ ہی ہوئے تھے ایکبار پھر وہی دل دہلادینے والی چیخ دوبارہ سنائی جو کہ اس بار ان کے قریب سے ہی سنی گئی تھی اور پھر آناً فاناً ان کے سامنے ایک وحشت ناک اور رگوں میں خون جمادینے والا منظر ایک انسانی بھیڑیئے کی شکل میں نمودار ہوا۔

چاند کی دودھیا چاندنی میں اس کے جسم پر لمبے اور

گھرے سیاہ بال بہت خوفناک منظر پیش کر رہے تھے اور کا چہرہ سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن اس کے اندر سے چمکتی اس کی آنکھیں دور سے ہی صاف نظر آرہی تھیں۔ بچے اور عورتیں تو اسے اتنے قریب دیکھتے ہی چیخنے چلانے لگے لیکن نوجوان اس کو دیکھتے ہی اپنے اپنے ہتھیاروں کو ہاتھوں میں تھامے اس کے آگے کھڑے ہوگئے ان سب کا انداز جارحانہ تھا کہ اگر اس عفریت نے ان میں سے کسی پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو وہ ان سے بچ نہیں پائے گی۔

وہ خوفناک بھیڑیا شلماک تھا جسے اس سادھو نے نئی بھینٹ ڈھونڈنے کے لئے دوبارہ بھیجا تھا۔ اور اس وہ عفریت اپنے آقا کا حکم بجالانے کے لئے اپنے شکار کی تلاش میں تھا جس کے لئے اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور اس کا شکار اس کے سامنے خود بخود چل کر آگیا تھا اور وہ سادھو کے عتاب سے بچنے کے لئے یہ اب یہ موقعہ دوبارہ ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا اس لئے وہ ان کے سامنے نمودار ہوگیا تھا۔

نوجوانوں کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر وہ عفریت دھاڑتا ہوا ان کی جانب بڑھا اور لپک کر ایک بیل گاڑی جس پر بچے سوار تھے اور چیخ چلا رہے تھے ان پر حملہ آور ہوا نوجوانوں نے گھبرا کر جواب میں اپنے ہتھیاروں سے اس سے بچاؤ کے لئے حملہ کیا لیکن وہ عفریت ان کے اندازے سے کہیں زیادہ تیز اور چالاک تھی اس نے تیزی سے خود کو ان کے وار سے بچاتے ہوئے جھپٹ کر بیل گاڑی سے ایک چھوٹے بچے کو اٹھانے کی کوشش کی لیکن اسی دوران نوجوان اس کے مزید نزدیک پہنچ گئے تھے انہوں نے جلدی سے اس کی پیٹھ پر ڈنڈوں سے وار کردیا بہت سے وار تو ان کے بے کار گئے۔

لیکن ان میں سے چند ایک ڈنڈوں کی ضربیں اس کی پیٹھ پر اپنا کام دکھا چکی تھیں۔ پیٹھ پر ڈنڈوں کی ضرب کھاتے ہی اس عفریت کے منہ سے تکلیف کی شدت سے بڑی ڈراؤنی آوازیں نکلیں اور اس نے جلدی سے ہاتھ میں دبوچے ہوئے بچے کو دور پھینک کر اپنے بچاؤ کے لئے ان حملہ آور نوجوانوں پر حملہ کردیا جو نوجوان اس کے زیادہ نزدیک تھا اس کے جسم پر اس کا زوردار ہاتھ پڑا اور وہ اچھل کر دور جا گرا یہ دیکھ کر دوسرے نوجوان گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔

دلجیت سنگھ اس دوران خود بھی اپنے ہاتھ میں ایک لمبا ڈنڈا اٹھائے اس عفریت کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور دل ہی دل میں اس کی طاقت کا اندازہ لگاتے ہوئے اس کے دائیں پہلو کی طرف سے گھوم کر اس پر ایک زوردار وار کرنے کی کوشش کی لیکن اس دوران وہ عفریت سنبھل کر خود کو اس کے حملے سے بچا گئی تھی۔

یہ دیکھ کر دلجیت نے دوبارہ اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن شاید وہ عفریت اتنے زیادہ افراد سے مقابلہ کے لئے تیار نہیں تھی اس لئے اس نے وہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بھاگتی ہوئی جنگل کے اندر گھس گئی اور کچھ ہی دیر میں ان کی نظروں کے سامنے سے غائب ہوگئی۔

☆......☆......☆

عشاء کا وقت گزرتے ہی رشید کی ماں اپنے ناپاک منصوبے پر عمل درآمد کرنے کے لئے تیار تھی وہ اپنے بیٹے اور بہو کے کمرے میں جانے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی تاکہ ان کے سوتے ہی وہ اپنے مذموم کام کے لئے گھر سے روانہ ہوسکے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی اپنی بہو کا گلہ دبوچ دے لیکن وہ ایسا کرنے سے مجبور تھی نجانے اسے اپنی بہو سے کیا بیر تھا حالانکہ وہ بیچاری اس کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی تھی اور اسے کسی قسم کی شکایت کا موقعہ نہیں دیتی تھی لیکن پھر اس کی ساس اس کی دشمن بنی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد ان کے کمرے کی بتی بجھنے پر وہ خاموشی سے اٹھی اور گھر کا دروازہ کھول کر آہستہ سے اسے باہر سے بند کر کے گلیوں سے ہوتی ہوئی قبرستان جانے والے راستے پر چل پڑی۔ اس کا شوہر بشیر جو ایک راج گیر تھا اور محنت مزدوری کر کے اپنے بیوی بچے کا پیٹ پالتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے کیونکہ وہ بھی ہر دلعزیز شخص تھا اور ہر کسی سے ہنس کر اور خوش ہو کر بات کرتا تھا اور اپنی مزدوری اور محنت کے لئے کسی سے بھی بحث نہیں کرتا تھا اور جو بھی اسے جو مزدوری دے دیتا تھا وہ

خاموشی سے لے لیتا تھا جس کی وجہ سے اللہ نے اس کی کمائی میں بہت برکت ڈال دی تھی اور اس کے گھر کا گزر بسر بہت اچھا ہونے لگا تھا۔

لیکن قسمت بھی شاید اس کے خلاف ہوچکی تھی کہ ایک روز اسے ایک بوسیدہ مکان کی مرمت کا کام ملا۔ وہ صبح سویرے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر اپنے کام کی طرف چل نکلا۔ وہ چونکہ خود مستری تھا اور ایک مزدور کو بھی اس نے اپنے ساتھ لیا اور اس مکان میں پہنچ کر مزدور کو کام سمجھانے لگا۔ مکان کافی عرصہ سے بوسیدہ حالت میں ویران پڑا تھا اور اس کو گاؤں کے ایک خوشحال شخص نے اس کے مالک سے خرید لیا تھا اور اس کو مرمت کروا کر خود اس میں رہائش رکھنے کا ارادہ کیا تھا۔

گاؤں میں بشیر مستری کی خوش اخلاقی اور کام کی دھوم تھی اس لئے اس نے بھی اس کام کے لئے اسی کا انتخاب کیا تھا حالانکہ شہر میں ایک سے ایک راج گیر مل جاتا تھا لیکن اس نے ان سب پر بشیر کو فوقیت دینا مناسب سمجھا اور اس کے نتیجے میں آج وہ اس بوسیدہ مکان میں موجود تھے۔

مکان کے مالک نے تمام کام چونکہ اس کو پہلے سے ہی بتا دیا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اس لئے وہ اس وقت ان کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ مکان کی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے کافی سالوں سے وہ ویران پڑا ہے اور اس کے اندر کی طرف جنگلی جھاڑیاں اور خودرو گھاس اگی ہوئی تھی۔ جا بجا پکی اینٹیں بکھری پڑی تھیں جن میں سے بہت سی ٹوٹی ہوئی تھیں کمروں کے دروازے اور کھڑکیاں خالی تھیں اور صرف ان میں لگی چوکھاٹیں موجود تھیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی ان کے دروازے اور کھڑکیاں چرا کر لے گیا ہو۔ یہ تقریباً چھ کمروں پر مشتمل مکان تھا اور اس کی اوپری منزل نہیں تھی۔ کمروں کے اندر ہر طرف گندگی بکھری ہوئی تھی اور ایک عجیب طرح کا تعفن پھیلا ہوا تھا۔ بشیر اور مزدور اس کی حالت دیکھ کر پہلے تو پریشان ہوگئے کہ کیسے اس جگہ کو پھر سے رہنے کی قابل بنا پائیں گے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اس تباہ حال مکان کے مالک نے انہیں منہ مانگی مزدوری دینے کی حامی بھری تھی اس لئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کام کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے۔ ان دونوں نے اپنے اوزاروں کا تھیلا ایک جانب تھوڑی سی جگہ صاف کرکے رکھ دیا اور پھر اینٹیں اٹھا اٹھا کر ایک طرف پھینکنے لگے۔

ابھی انہوں نے کچھ اینٹیں ہی ایک طرف پھینکی تھیں اچانک ایک کالا سیاہ سانپ پھنکارتا ہوا ایک اینٹوں کے ڈھیر سے نکلا اور بڑی تیزی سے اپنے نزدیک بشیر کو پا کر اس کی پنڈلی پر ڈس لیا۔ اس اچانک افتاد پر بشیر اور مزدور گھبرا کر باہر کی جانب لپکے لیکن اپنے پیچھے رکھی اینٹوں کے ڈھیر سے ٹکرا کر نیچے گر گئے۔

بشیر چونکہ مزدور کے آگے کی جانب گرا تھا اور کسی قدر سانپ کے نزدیک بھی تھا اس لئے وہ لپیٹ میں آگیا اور سانپ کے ڈسنے کا شکار ہوگیا۔ مزدور یہ دیکھ کر فوراً دوبارہ اٹھا اور چیختا ہوا باہر کی جانب بھاگا۔ خوف سے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا اور وہ چیختا چلاتا گاؤں کے مکانوں کی جانب بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

گاؤں زیادہ بڑا نہیں تھا بس اکا دکا دوکانیں وہاں تھیں جو صبح سویرے ہی کھل جاتی تھیں جہاں سے گاؤں کے لوگوں کو دودھ دہی اور ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں مل جاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ دوکانیں کھلی ہوئی تھیں ان پر کھڑے چند گاہک اور دوکانداروں نے جب اسے حواس باختہ اپنی جانب بھاگتے دیکھا تو وہ بھی دوکانوں سے باہر نکل کر اس کی جانب لپکے مزدور تیزی سے بھاگتا ہوا ان کے نزدیک پہنچا اور لہرا کر ان کے قریب گر گیا اور بیہوش ہوگیا۔

یہ ایک قدرتی عمل ہے کہ مصیبت کے وقت جب کسی کو اس بات کا احساس ہوجائے کہ وہ اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گیا تو وہ اپنے ہوش سے بیگانہ ہوجاتا ہے۔

یہی حال اس مزدور کا ہوا وہ بھی ان کے نزدیک گر کر بیہوش ہوچکا تھا۔ یہ دیکھ کر گاؤں کے دو نوجوان بھاگ کر گاؤں کے اکلوتے حکیم کو بلا لائے جس نے اس کی نبض دیکھ کر وہاں موجود لوگوں سے باہمی بات چیت کرکے اپنا سر ہلایا اور تھیلے میں سے ایک چٹکی دوا لے کر اس مزدور کا منہ کھول کر اس میں انڈیل دی اور اس کے ساتھ ہی ایک دوکاندار سے پانی طلب کرکے اس کا ایک گھونٹ اس مزدور کا

منہ کھول کر اس میں ڈال دیا۔ کچھ پانی اس کے منہ سے بہہ نکلا لیکن کچھ مقدار اس کے حلق میں اتر چکی تھی اور غالباً اس پانی کے ساتھ ساتھ پہلے سے موجود دوا بھی اس کے حلق سے اتر چکی تھی۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں مزدور نے اپنی آنکھیں کھول دیں پہلے تو وہ کھوئی کھوئی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا اور پھر جب اس کے شعور نے اسے اصل حقیقت دکھائی تو وہ چیخ مار کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور پھر اس کے بتلانے پر گاؤں کے چند نوجوان اس بوسیدہ مکان کی جانب بھاگے۔

لیکن انہوں نے وہاں پہنچ کر جو منظر اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا وہ ان کا دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ بشیر کا جسم نیلا پڑ گیا تھا اور اس کا چہرہ بھی یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بڑی اچھے طریقے سے اسے کوئلوں کی بھٹی میں رکھ دیا ہو۔ اس کے منہ سے سفید رنگ کی جھاگ نکل کر جم چکی تھی۔

یہ منظر دیکھ کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ خوف سے اس کے نزدیک بھی نہیں جا رہے تھے اس کے ساتھ ساتھ ان کی نظریں اس سانپ کو تلاش کر رہی تھیں جس کے متعلق وہ مزدور کی زبانی سن چکے تھے۔ لیکن دور دور تک انہیں کوئی سانپ یا کوئی اور موذی جانور نظر نہیں آیا غالباً وہ موذی اپنا کام دکھا کر وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔

کچھ دیر تک سکتے کی حالت میں کھڑے رہنے کے بعد انہیں ہوش آیا اور انہوں نے جلدی سے ایک نوجوان کو رشید کے گھر کی جانب دوڑایا اور ساتھ ہی ایک چادر اور چارپائی بھی ساتھ لانے کے لیے کہا یہ سنتے ہی وہ نوجوان جلدی سے وہاں سے بھاگ گیا۔ اور کچھ ہی دیر میں رشید کی ماں روتی دھوتی اپنی بہو اور بیٹے کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ اس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا اور اس کے ساتھ گاؤں کے اور بہت سے لوگ اور عورتیں بچے بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں آ گئے تھے۔

گاؤں میں ایک کہرام سا مچ گیا تھا ہر شخص اشکبار تھا کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ کل بشیر جوان کے درمیان تھا اب ان سے بہت دور جا چکا تھا۔

شوہر کے مرنے کے بعد رشید کی ماں رفتہ رفتہ اپنے شوہر کا غم بھول چکی تھی اور پھر دوبارہ سے اپنے کاموں میں مگن ہو چکی تھی۔ رشید کی بہو اس کی خدمت کر کے اسے اپنے سسر کا غم بھلانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ رشید کی ماں اس کی دشمن بن گئی تھی اور کسی نہ کسی طریقے سے اس سے اپنے بیٹے رشید کا پیچھا چھڑانے کی فکر میں رہتی تھی۔ اس کے لئے اس نے ہر ممکن کوشش کر لی تھی اور اس سلسلے میں اس نے اپنی ایک دو سہیلیوں سے بھی تذکرہ کیا تھا جو خود اسی ڈگر پر چل رہی تھیں جس پر اس وقت وہ خود تھی اس لئے ان میں سے ہی اس کی ایک سہیلی نے اسے شاہ بابا کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا اور اسی کے نتیجے میں آج اس کے پاس شاہ بابا کا دیا ہوا ایک تعویذ تھا جسے دفنانے کے لئے وہ اس وقت رات کے اندھیرے میں گھر سے نکل پڑی تھی۔

پہلے تو اس نے فیکے موچی کو اپنے ساتھ ملانے کا ارادہ کر کے ایک دو بار قبرستان کا چکر لگا لیا تھا اور اس میں ناکام رہی تھی لیکن پھر اس نے ہمت کر کے خود ہی اس کام کو سرانجام دینے کا ارادہ کیا اس سے اس کا کوئی رازدار بھی نہیں ہوگا اور اس کے پیسے بھی بچ سکتے تھے۔ کیونکہ پہلے وہ دو بار فیکے موچی کو پیسے دے چکی تھی اور اس کے لئے اس نے رشید سے سو بہانے بنائے تھے اس لئے اب کیا کہہ کر تیسری بار رشید سے پیسے مانگتی اس سے وہ اس پر شک کر سکتا تھا اور پوچھ سکتا تھا کہ وہ اتنے پیسوں کا آخر کیا کرتی ہے حالانکہ اس کی ضرورت کی ہر شے رشید اس کو گھر میں ہی لا کر دیتا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے یہ کام خود ہی کرنے کا فیصلہ کیا اور اس وقت اس کی چال میں تیزی تھی اور اسے اپنی منزل کا بھی بخوبی اندازہ تھا کیونکہ وہ دن کی روشنی میں وہاں کی نشانی ذہن میں رکھ آئی تھی اس لئے وہ سیدھی اسی راستے پر چل رہی تھی جو سیدھا اسی بوسیدہ قبر کی طرف ہی جاتا تھا۔

قبرستان گاؤں سے باہر تھا زیادہ قبریں نہیں تھیں لیکن اس میں لگے کیکروں اور پیلو کے درختوں نے ایک جھنڈ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ چلتے چلتے وہ قبرستان کے نزدیک پہنچ کر رک گئی اور زمین پر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

راستے میں پڑنے والی چند نئی قبروں پر دیئے جل رہے تھے لیکن اسے ان سے کوئی غرض نہیں تھی وہ سیدھی چلتی ہوئی اسی طرف جارہی تھی جہاں وہ بوسیدہ قبر تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں پہنچ گئی اور اس کی توقع کے عین مطابق اس پر ایک چراغ روشن تھا جس میں تیل لبالب بھرا ہوا تھا اور اس چراغ کی لو پھڑ پھڑا رہی تھی۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ہوا نہیں چل رہی تھی ورنہ شاید آج بھی اسے ناکام لوٹنا پڑتا اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے بندھا تعویذ کھولا اور جلدی سے اسے قبر کے سرہانے بیٹھ کر ایک لکڑی کی مدد سے زمین کھودی اور تعویذ اس میں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈال دی اور اس مٹی پر دوانیٹیں رکھ کر اٹھ کر مٹی والے ہاتھ جھاڑے اور جلدی سے واپس گھر کی طرف چل دی۔ اس کام کو سرانجام دینے کی خوشی یا جوش کی وجہ سے پہلے تو اسے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ وہ تن تنہا رات کے اندھیرے میں قبرستان میں ایک بوسیدہ قبر کے پہلو میں بیٹھی ہوئی ہے۔

لیکن جب اس نے یہ کام مکمل کرنے کے بعد دوبارہ اپنے گھر کا رستہ ناپا تو پہلی بار اسے خوف محسوس ہوا۔ اور اب تو اسے قبرستان کے اندر سے کہیں کہیں گیدڑوں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی واضح سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے بہت سے لوگ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگے ہوں اور اب تو اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ لوگ باتیں کرنے کے دوران اس کا نام بھی لے رہے ہوں پہلے تو اسے نے یہ سب اپنا واہمہ سمجھا۔

لیکن جب ان آوازوں نے شدت اختیار کرلی تو وہ اندھا دھند اپنے گھر کی طرف جانے والے راستے پر دوڑنے لگی۔ اسے اس بات کا احساس تک نہ تھا کہ وہ دوڑتی ہوئی اپنے راستے میں آنے والی قبروں پر بھی چڑھتی جارہی ہے اس وقت تو بس اس پر ایک ہی بات کی دھن سوار تھی کہ وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچ جائے۔

وہ جتنی تیزی سے دوڑ رہی تھی اتنی ہی تیزی سے وہ آوازیں اس کا پیچھا کررہی تھیں اس نے بھاگتے ہوئے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ آوازیں اس قدر تیز تھیں جیسے اس کے کانوں کے پردے چیر کر اس کے دماغ میں پیوست ہورہی تھیں۔

مسلسل دوڑنے کے بعد وہ قبرستان سے باہر نکل کر گھر کی طرف جانے والی گلی میں داخل ہوچکی تھی اور کچھ ہی دیر میں اپنے گھر کے نزدیک پہنچ گئی اب اسے وہ آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں اس نے جلدی سے گھر کے دروازے کو کھولا اور اندر داخل ہوکر آہستہ سے دروازہ بند کردیا۔

گھر میں قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور اس کے بیٹے اور بہو کے کمرے کی بتی بھی بند تھی۔ شاید وہ دونوں اس کی غیر موجودگی سے بے خبر ہی رہے تھے ورنہ اس وقت وہ دونوں اس کے انتظار میں صحن میں ہی موجود ہوتے۔ یہ دیکھ کر اس کی تسلی ہوگئی اور وہ جلدی سے اپنے بستر کی جانب بڑھی اور خاموشی سے چادر اوڑھ کر سوگئی۔

☆......☆......☆

عفریت کو غائب ہوتے دیکھ کر برات والوں نے سکھ کا سانس لیا اور پھر سے اپنا سفر شروع کردیا۔ اس بار انہوں نے عورتوں اور بچوں والی بیل گاڑیوں کو مزید اپنے گھیرے میں لے لیا تھا تاکہ وہ خوفزدہ نہ ہوں اور خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔ چاند خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا اور آسمان پر ستارے بڑی حیرت سے رات کے اندھیرے میں اس قافلے کو دیکھ رہے تھے جو سیدھا ایک راستے پر گامزن تھا جو ان سب کے لئے ایک قتل گاہ کی حیثیت رکھتا تھا لیکن وہ سب اپنے آنے والے انجام سے بے خبر اپنی منزل کی جانب چل رہے تھے۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جارہے تھے ویسے ویسے جنگل میں لگے درختوں کا سلسلہ ختم ہوتا جارہا تھا۔ ابھی وہ کچھ دور اور چلے ہوں گے کہ ان کے سامنے ایک بہت ہی خستہ حال اور پرانے مندر کی عمارت دکھائی دی۔ اس کی حالت سے یوں لگ رہا تھا جیسے صدیوں کی گردش لیل ونہار نے اس کی خوبصورتی کو نوچ کھایا ہو۔

پوری عمارت پر نحوسیت چھائی ہوئی تھی وہ سب چونکہ پہلے کبھی اس طرف نہیں آئے تھے اس لئے اس

عمارت سے ناواقف تھے لیکن اب قسمت انہیں یہاں لے آئی تھی تو انہیں پتہ چلا کہ اس خوفناک جنگل میں ایک پرانا اور ویران مندر بھی موجود ہے۔ مندر کے بڑے گیٹ کے سامنے جابجا جنگلی پودے اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جن میں چوہے بلیاں بھاگ رہی تھیں جو چاند کی چاندنی میں صاف نظر آرہی تھیں۔

عمارت کی دیواروں کا پلستر تقریباً ادھڑ چکا تھا اور اس کے ٹوٹے ہوئے برج بہت ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ چاند چلتا ہوا عین مندر کے اوپر آگیا تھا۔ جس کی وجہ سے مندر پر چاندنی بکھری ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے مین دروازے کے اندر سے روشنی سی جھلکتی نظر آرہی تھی۔

اس جنگل میں ایسی روشنی کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے لیکن حقیقت ان کے سامنے موجود تھی۔ مین دروازے کے سامنے ایک سوکھا تالاب بھی موجود تھا جس کے اندر کسی پرانے درخت کی جڑیں پانچ چھ فٹ تک اونچی اٹھی ہوئی تھیں اور درخت کا نام و نشان تک موجود نہیں تھا لیکن جڑیں موجود تھیں بڑا عجیب سا منظر تھا جو ان کی عقلوں پر حاوی تھا۔ وہ وہاں سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتے تھے لیکن یوں لگتا تھا جیسے کسی نادیدہ قوت نے ان سب کو پتھر کا بنا دیا ہو اور وہ سب نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے بھاگنے سے قاصر تھے۔

ابھی انہیں وہاں کھڑے کچھ لمحے ہی ہوئے ہوں گے کہ اچانک مندر کے سامنے والی دیوار ایک دم پھٹی اور اس میں سے ایک عورت کا ادھ ننگا جسم باہر نکلا جس کا ایک ہاتھ آگے کی جانب بڑھا ہوا تھا اور اس کو دوسرا ہاتھ اس کے پیچھے کی جانب تھا اور اس کی آنکھیں سیاہ پتلیوں سے عاری تھیں۔ جنہیں دیکھ کر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ اس اچانک افتاد پر وہ بوکھلا کر اس طرف دیکھنے لگے اور پھر دفعتاً اس چڑیل عورت نے اپنا دائیاں ہاتھ ایک بیل گاڑی کی جانب بڑھایا اور ایک عورت کی گود میں موجود بچے کو جھپٹ کر چھینا اور واپس دیوار میں غائب ہوگئی۔ اتنا فاصلہ ہونے کے باوجود اس کا ہاتھ اس بیل گاڑی تک یوں پہنچ گیا تھا جیسے وہ کوئی ربڑ کا بنا ہاتھ ہو جو ضرورت کے وقت کھنچتا چلا جارہا ہو۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا اور جتنی دیر میں وہ سب اس کے بارے میں سوچتے وہ عفریت اپنا کام کر چکی تھی۔

کچھ دیر تک وہ بت بنے یہ سوچتے رہے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے اور پھر جب انہیں حقیقت کا پتہ چلا تو وہ سب چیخنے چلانے لگے اور جس عورت کا بچہ وہ عفریت لے گئی تھی وہ دھاڑیں مار مار کر بین کر رہی تھی۔ دلجیت سنگھ چونکہ سب سے آگے والی بگھی میں سوار تھا اور وہ بھی اس دوران اس بیل گاڑی کے نزدیک پہنچ چکا تھا جس میں موجود عورت بین کر رہی تھی اور پھر حقیقت کا پتہ چلتے ہی اس نے چند نوجوانوں کو اپنے ساتھ لیا اور اس مندر کے مین دروازے کی جانب پیش قدمی کی۔

وہ ہر حالت میں اس بچے کو واپس لانے کا فیصلہ کر چکا تھا چاہے اس کے لئے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے یہ سوچ کر اس نے غصے اور جوش سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس مندر کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کر لیا تھا۔

مندر کے اندر جانے سے پہلے اس نے کچھ اور نوجوانوں کو قافلے کے افراد کی حفاظت کے لئے مامور کیا اور کچھ مزید ہدایات دے کر مندر کے اندر جانے والی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے۔ وہ سب چوکنے تھے اور ہوشیاری سے اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے تھامے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سیڑھیوں پر جابجا درختوں کے پتے اور مٹی تھی جو ان کے قدم رکھنے پر چرچراہٹ کی آوازیں نکال رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں پتوں کی یہ آوازیں بہت خوفزدہ کر رہی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچتے ہی سامنے ایک بڑی سی راہداری تھی جس کے دونوں طرف بہت سے کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے اور ان پر قفل پڑے ہوئے تھے۔ چھت سے لٹکتے ہوئے مکڑیوں کے جالے زمین تک پہنچے ہوئے تھے اور فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے کافی سارے گڑھے بنے ہوئے تھے کچھ ہی دیر میں وہ سامنے نظر آنے والے ایک بڑے سے دروازے میں داخل ہوگئے جہاں سے ہلکی ہلکی پیلی سی روشنی باہر آرہی تھی۔

یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کی دیواروں کا رنگ گہرا پیلے رنگ کا تھا جس پر جابجا ہندوؤں کے دیوتاؤں کی

تصاویر لٹکی ہوئی تھیں۔ ہال کے وسط میں ایک بہت بڑا بت نصب تھا جس کے بہت سے ہاتھوں میں مختلف چیزیں پکڑی ہوئی تھیں۔

بت کے قدموں میں خشک پھولوں کا ڈھیر تھا اور بہت سے خشک ناریل کے چھلکے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کسی دور میں یہ ایک پرکشش عبادت گاہ رہی ہوگی لیکن اب اس پر ایک عجیب سی نحوست چھائی ہوئی تھی۔ نجانے کن حالات کے تحت لوگ اسے خیر باد کہہ گئے ہوں گے۔ ہال کی بناوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کافی بڑا ہوگا۔

چاروں طرف ایک پراسراری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہال بالکل خالی تھا روشنی کے لئے چھت پر ایک کم واٹ والا بلب روشن تھا نجانے اس غیر آباد اور انسانی آبادی سے دور اس ویران مندر میں یوں روشنی کا انتظام کیسے کیا گیا ہوگا مگر اس وقت ان باتوں پر سوچنے کی بجائے اس گمشدہ بچے کی جان بچانے کے بارے میں سوچنے کی ضرورت تھی اس لئے انہوں نے اس خیال کو ذہن سے فوراً جھٹکا اور بڑی خاموشی سے سامنے نظر آنے والے ایک چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھنے لگے جو ہال کے دائیں طرف ایک کونے میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا چھوٹا سا دروازہ ایک طرف کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر اندھیرا دکھائی دے رہا تھا یہ کل پانچ افراد تھے جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں مضبوط ڈنڈے اٹھائے ہوئے تھے اور چوکنا تھے۔

دلجیت سنگھ نے انہیں ایک لائن میں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور دو افراد کو اپنے پیچھے نظر رکھنے کا اشارہ کرکے اس چھوٹے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے اندر جھانکنے کی کوشش کی کہ شاید اسے کچھ نظر آجائے لیکن بہت کوشش کے باوجود اسے اندر اندھیرا ہی نظر آیا۔ وہ وہیں رک کر اندر سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اندر خاموشی ہی تھی اور کوئی آواز یا آہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ابھی انہیں وہاں کھڑے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ہال کی دیواریں یوں ہلنے لگیں جیسے باہر زلزلہ آگیا ہو۔ ہال میں رکھا سب سامان یوں زور زور سے ہلنے لگا جیسے کوئی اسے اپنے ہاتھ سے پکڑ کر زوردار چکر دینے لگا ہو۔ سامان کے ساتھ ساتھ وہ سب لوگ خود کو بھی گھومتا محسوس کرنے لگے انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کسی کمہار کے برتن بنانے والے تخت یعنی آوی پر بیٹھ گئے ہوں انہیں اپنا آپ تیزی سے گھومتا محسوس ہوا یہ دیکھ کر انہوں نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور جہاں تھے وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ یہ سب کچھ تھوڑی دیر تک ہوا اس کے بعد ہال میں گھمبیر خاموشی چھا گئی۔

پھر اچانک ہال میں تیز گھنگرو بجنے کی آوازیں سنائی دیں اور اس کے ساتھ ساتھ تیز ہوا کے جھکڑوں کا شور بھی سنائی دیا یوں لگا جیسے باہر یکدم بہت زور کا طوفان آگیا ہو لیکن یہ سب کچھ صرف چند لمحوں کے لئے ہوا پھر ایکدم خاموشی چھا گئی۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ان کے ساتھ قسمت کیا کھیل رہی ہے اور وہ کس مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ وہ سہمے سہمے ایکدوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے کہ دیکھیں اب کیا ظہور میں آتا ہے۔

صدیوں پرانا مندر رات کا وقت اور کسی انسان کا وہاں موجود ہونا رگوں میں خون منجمد کردینے کے لئے کافی تھا۔ دلجیت سنگھ خود ایک بہادر نوجوان تھا لیکن جس طرح پے در پے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس سے وہ بھی کچھ خوفزدہ اور پریشان ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں اس سے بچنے کا کوئی حل نہیں آرہا تھا اس کے ساتھ ساتھ اسے اس معصوم بچے کی بھی فکر ستائے جارہی تھی جسے وہ عفریت اٹھا کر نجانے کہاں لے گئی تھی۔

اس بچے کی ماں کا روتا اور دھاڑیں مارتا چہرہ بار بار اس کے سامنے آرہا تھا لیکن وہ بے بس تھا۔ اس مندر میں داخل ہونے کے بعد انہیں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آخر وہ عفریت اس بچے کو اس مندر کے اندر کہاں لے گئی ہے اور جو واقعات ان کے ساتھ پیش آرہے تھے وہ بھی اس بات کا ثبوت تھے اس ویران مندر کے اندر طاغوتی طاقتیں رہائش پذیر تھیں۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ بچے کو کوئی نقصان پہنچنے سے پہلے پہلے وہ اسے اس عفریت کے چنگل سے چھڑالے لیکن ابھی تک وہ اندھیرے میں ہی ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے تھے۔ ہال میں خاموشی چھاتے ہی وہ دوبارہ کوئی اور

راستہ ڈھونڈنے لگے اور پھر تھوڑی سی کوشش سے انہیں ہال کے انتہائی بائیں کونے میں چند سیڑھیاں کسی تہہ خانے میں اترتی دکھائی دیں۔

سیڑھیوں کے نزدیک رک کر انہوں نے سرگوشی میں کوئی بات کی اور پھر تین افراد آہستہ آہستہ سیڑھیوں کی طرف بڑھے اور نیچے جاتی سیڑھیاں اترنے لگے دو افراد ان کے پیچھے دوسری طرف منہ کیے احتیاط سے ان کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں اترنے لگے اس طرح انہوں نے دونوں طرف نظر رکھی ہوئی تھی تاکہ کسی بھی آنے والے خطرے سے نپٹا جاسکے۔ سیڑھیاں زیادہ چوڑی نہیں تھیں اور نیچے اترنے میں انہیں کافی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیوں کہ سیڑھی پر ان کا مکمل پیر پڑنے کی بجائے آدھا پیر ٹک رہا تھا جس کی وجہ سے انہیں نیچے اترنے میں بہت پریشانی ہو رہی تھی۔ سمجھ سے بالاتر تھا کہ جس کسی نے بھی یہ سیڑھیاں بنائی تھیں کیا سوچ کر بنائی تھیں کہ ایک انسان کو نیچے اترنے اور اوپر چڑھنے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔ سیڑھیوں کی تعداد کم وبیش تیس پینتیس کے قریب ضرور رہی ہوگی اس کا اندازہ انہیں نیچے اترتے ہوئے ہو رہا تھا جیسے جیسے وہ تہہ خانے میں اترتے جا رہے تھے اس میں گھٹن بڑھتی جا رہی تھی اور ایسا تعفن پھیلا ہوا تھا جیسے کسی مذبح خانے سے خون اور آلائشوں کی بدبو آتی ہے بدبو اس قدر تیز تھی کہ انہیں اپنے ناک پر بے اختیار ہاتھ رکھنے پڑے۔ لیکن سڑاند زدہ بدبو انہیں اپنے دماغ میں گھستی محسوس ہو رہی تھی۔

تہہ خانے کی جب آخری پانچ سیڑھیاں بچ گئیں تو وہ وہیں رک کر اندر کا جائزہ لینے لگے اندر ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس کے فرش پر سیاہی مائل مادہ نظر آرہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں پھاڑے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ آخر وہ کیا چیز تھی جو فرش پر جابجا پھیلی ہوئی تھی اور پھر ایک جھٹکے سے وہ سب اچھل پڑے خدا کی پناہ وہ سیاہی مائل مادہ کچھ اور نہیں بلکہ خون تھا اور وہ سڑاند والی بدبو بھی اسی میں سے ہی آرہی تھی نجانے وہ کسی جانور کا خون تھا یا کسی انسان کا وہ سب یہ سمجھنے سے قاصر تھے لیکن اس وقت تو انہیں اپنا آپ بچانا مشکل ہو رہا تھا۔

تہہ خانے میں ایک کونے میں ایک کھجور کے پتوں والی پرانی سے چٹائی بھی بچھی نظر آرہی تھی جس پر ایک طرف ایک مٹی کا بڑا سا پیالہ رکھا تھا اور ایک طرف لوہے کا ایک بڑا سا صندوق بھی رکھا تھا جس پر سیاہ رنگ پینٹ ہوا تھا یا شاید صدیوں کی میل کی ایک تہہ جم چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس تہہ خانے میں کوئی دروازہ یا کھڑکی وغیرہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اس تہہ خانے میں اترنے کے لئے صرف وہ سیڑھیاں ہی واحد ذریعہ تھیں جن پر اس وقت وہ سب کھڑے حیرت اور خوف سے تہہ خانے کے فرش کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہ کر انہوں نے آپس میں کوئی سرگوشی کی اور پھر دلجیت سنگھ ایک نوجوان کے ساتھ اس لوہے کے صندوق کی طرف بڑھا وہ اسے کھول کر دیکھنا چاہتے تھے کہ شاید اس میں رکھے کسی سامان سے اس تہہ خانے کا راز معلوم ہو سکے۔ یہ سوچ کر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس لوہے کے صندوق کی جانب بڑھنے لگے۔

صندوق پر ایک بوسیدہ سا تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک پہنچ کر دلجیت نے آہستہ سے تالے کو ہاتھ میں پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تو وہ فوراً کھل گیا غالباً بوسیدہ اور پرانا ہونے کی وجہ سے اس کا میکنزم خراب ہو گیا تھا اس لئے فوراً کھل گیا۔ دلجیت نے اسے کنڈی سے نکال کر ایک طرف اچھال دیا جس سے تہہ خانے کے فرش پر ایک ہلکی سے آہٹ ہوئی پھر یکدم خاموشی چھا گئی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ کوئی اور آہٹ یا آواز سننے کی کوشش کرنے لگے لیکن دوسری طرف خاموشی تھی۔ لگتا تھا اس وقت ان کے علاوہ اس جگہ کوئی اور نفس موجود نہ تھا۔

یہ دیکھ کر دلجیت نے آہستہ سے اس صندوق کا ڈھکن اٹھانا شروع کیا۔ اور پھر جیسے ہی اس نے پورا ڈھکن اوپر اٹھا کر اس کے اندر جھانکا ایک زوردار تعفن کا بھبکا اس سے نکل کر ان کے ناکوں سے ٹکرایا اور خدا کی پناہ اندر کا منظر اچھے اچھوں کا دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔ صدیوں پرانے ویران مندر کے اندر رات کے اندھیرے میں ایک تہہ خانے کے اندر صندوق میں رکھے مختلف لوگوں کے کٹے ہوئے سر رکھے ہوئے تھے یوں لگتا تھا جیسے کسی نے ابھی

ابھی ان کو ان کے جسموں سے علیحدہ کر کے اس صندوق میں بھر دیا ہو۔ یہ سب دیکھ کر وہ چیختے چلاتے واپس سیڑھیوں کی طرف بھاگے اور جلدی جلدی اس کی سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرنے لگے لیکن ایسا کرنے پر انہیں بہت مشکل پیش آ رہی تھی کیونکہ مندر کے تہہ خانے کی سیڑھیاں چوڑائی میں چھوٹی ہونے کی وجہ سے انہیں ایسا کرنے نہیں دے رہی تھیں۔ جلدی میں وہ بار بار نیچے گر رہے تھے لیکن پھر جیسے تیسے کر کے وہ آخر تہہ خانے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو ہی گئے لیکن جیسے ہی انہوں نے باہر قدم رکھے وہ ایکدم ایک بھیانک شکل سادھو سے ٹکرا گئے جو سیدھا ان سیڑھیوں کی جانب ہی بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اور پھر یہ دیکھ کر ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی کہ اس سادھو کے ایک ہاتھ میں اس بچے کا کٹا ہوا سر لٹک رہا تھا جسے ڈھونڈتے ہوئے وہ اس وقت اس خوفناک مندر کے تہہ خانے سے نکل رہے تھے۔

بچے کا سر گردن تک کٹا ہوا تھا اور اس کی کٹی گردن سے بہت سی رگیں باہر جھول رہی تھیں جن سے تازہ تازہ خون فرش پر ٹپک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی اس سادھو نے اس بچے کو ذبح کیا ہو۔ نجانے اس بدبخت سادھو نے اس معصوم کیساتھ کونسا بھیانک کھیل کھیلا ہوگا اور کس قدر اس بچے کو اذیت ہوئی ہوگی۔

پہلے تو سادھو بھی اچانک ان لوگوں کے ٹکرانے کی وجہ سے ایک دم گھبرا گیا تھا اور اسی گھبراہٹ میں اس کے بائیں ہاتھ میں جھولتی اس بچے کی گردن ایک جھٹکے سے نکلی اور سیدھی تہہ خانے میں جانے والی سیڑھیوں کے اندر ایک فٹبال کی مانند لڑھکتی چلی گئی۔ لیکن اس ساری کارروائی میں وہ سب یہ ضرور دیکھ چکے تھے کہ وہ کٹا ہوا سر اسی بچے کا ہی تھا۔

سادھو کے خام خیال میں بھی نہیں تھا یوں اچانک کوئی تہہ خانے سے نکل کر اس سے ٹکرائے گا اس لئے وہ بھی بے فکری سے چلتا ہوا تہہ خانے کی جانب بڑھ رہا تھا لیکن پھر یوں اچانک دھکا لگنے کی وجہ سے وہ بوکھلا گیا اور بچے کی گردن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تہہ خانے کی سیڑھیوں پر گر گئی اور لڑھکتی ہوئی اندر غائب ہو گئی اور وہ خود زمین بوس ہو گیا۔

دلجیت سنگھ اور اس کے پیچھے نکلنے والے اس کے دیگر ساتھیوں نے جلدی سے زمین پر گرے اس سادھو کو دبوچنا چاہا لیکن اس عرصے میں وہ سادھو سنبھل چکا تھا۔ زمین پر گرتے ہی اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر ان کی طرف پھونک دیا۔ دلجیت اور اس کی ساتھیوں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے جسموں کو مفلوج کر دیا ہو ان کے لاکھ ہلنے جلنے کے باوجود ان کے جسموں نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ سادھو ان کی حالت دیکھ کر زمین سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور پھر ایک منتر پڑھ کر سامنے نظر آنے والی دیوار پر پھونک دیا۔ منتر ختم ہوتے ہی سامنے والی دیوار ایک سرسراہٹ سے یوں سائیڈ میں گھس گئی جیسے کسی نے اپنے ہاتھ سے اسے دیوار کی دوسری طرف دھکیل دیا ہو۔

دیوار سرکتے ہی سامنے ایک تنگ سی راہداری نظر آ رہی تھی جس میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور اس کے چھت سے لٹکتے بڑے بڑے جالے جن میں پھنسی ہوئی بڑے سائز کی مکڑیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ راہداری کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے جگہ جگہ کھڈے بنے ہوئے تھے۔ دیوار میں راستہ نمودار ہوتے ہی سادھو نے ایک ایک کر کے سب کو اپنے کندھے پر اٹھا کر راہداری سے گزرتے ہوئے ایک اور تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر اس کے فرش پر لٹا دیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس ویران مندر میں تہہ خانوں کا جال بچھا ہو۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ تقریباً ایسے دور دراز مندروں میں ایسے تہہ خانے خاص طور پر بنوائے جاتے تھے تاکہ وہاں کے سادھو یا پجاری اپنے مذموم مقاصد کو دنیا کی نظروں سے چھپا سکیں۔ اور اس طرح مندروں کی آڑ میں ان کی عیاشیاں بھی کھل کر دنیا والوں کے سامنے نہ آسکیں۔ لیکن یہ سب کچھ وہ لوگ کرتے تھے جنہوں نے دنیا والوں کے سامنے جعلی سادھو اور پجاریوں کا روپ دھار رکھا ہو لیکن حقیقت میں جو اصل سادھو یا پجاری ہیں وہ ایسا کام کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے کیونکہ وہ لوگ بھی اپنے عقیدے کا احترام کرتے ہیں اور اپنے مذہب کے سچے پیروکار ہوتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے عیاش سادھوؤں یا

پجاریوں کے بھیس میں چھپے شیطان کے چیلو نے ان کے عقیدے اور مذہب کو بدنام کیا ہوا تھا۔ ان سب کو تہہ خانے کے فرش پر سیمنٹ کی بوریوں کے طرح پٹک کر اس نے ایک کونے میں پڑے رسیوں کے ڈھیر میں سے کچھ رسیاں اٹھا کر ان لوگوں کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دوبارہ تہہ خانے سے باہر نکل آیا۔ یہ تو وہ سمجھ ہی چکا تھا کہ یہ لوگ اس شکار ہوئے بچے کی تلاش میں ہی اس ویران مندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ وہ یہی سوچتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

رشید نے دوکان بند کی اور اپنا تھیلا ہاتھ میں تھامے گھر کی راہ لی۔ راستے سے اس نے اپنی ماں اور بیوی کے لئے تھوڑا پھل خریدا اور اسے تھیلے میں ڈال کر گھر کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ گھر کی دہلیز پر پہنچ گیا پھر جیسے ہی اس نے کنڈی کھٹکھٹانے کے لئے ہاتھ اٹھایا کہ یکدم دروازہ یوں کھل گیا جیسے کسی کو اس کے آنے کا پہلے سے ہی انتظار ہو لیکن یہ سب اچانک اتفاق تھا کیوں کہ جیسے ہی اس نے ہاتھ اٹھایا تھا اسی وقت اس کی ماں نے اچانک دروازہ کھول دیا تھا۔

رشید کی بیوی کی اچانک طبیعت بگڑ گئی تھی اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا تھا اور کافی دیر سے یوں ہی چیخ چلا رہی تھی لیکن درد تھا کہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ رشید کی ماں کافی دیر تک تو اسے یوں تڑپتا دیکھتی رہی اس کی اس حالت سے وہ سمجھ گئی تھی کہ شاہ بابا کے دیئے ہوئے تعویذ نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے یہ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔

لیکن جب اس کی تکلیف ناقابل برداشت دکھنے لگی تو اس نے بھی گھبرا کر گاؤں کے حکیم کو بلانے کا ارادہ کیا اور یہ وہی لمحہ تھا جب وہ اسے بلانے کے لئے باہر نکلنے لگی تھی اور اسی وقت اسے کے بیٹے نے گھر کا دروازہ بجانے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا تھا۔ ماں کو دروازے میں یوں پریشان دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا پھر اس کے پوچھنے پر اس نے اس کی بیوی کی تکلیف کے متعلق بتایا۔

رشید یہ سن کر جلدی سے گھر کے اندر داخل ہوا اور ہاتھ میں پکڑا تھیلا اپنی ماں کے ہاتھ میں پکڑا کر بیوی کے پاس کمرے میں پہنچا اس کی حالت واقع بہت خراب لگ رہی تھی اس نے اس کو دلاسہ دیتے ہوئے اپنی ماں کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر دوبارہ گھر سے باہر نکل گیا وہ جلد از جلد حکیم کے پاس پہنچنا چاہتا تھا تا کہ وہ اس کی بیوی کو دوا وغیرہ دے سکے تا کہ اس کی تکلیف کم ہو سکے۔ اس کا تڑپنا اس سے بھی نہیں دیکھا گیا تھا وہ یوں تڑپ رہی تھی جیسے کوئی تیز دھار آلے سے اس کے پیٹ کے اندرونی اعضاء کو کاٹ رہا ہو۔ بے پناہ تکلیف کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے سرنج سے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

حکیم کا مطب گاؤں کی نکڑ پر ہی تھا اور زیادہ آبادی نہ ہونے کی وجہ سے اس کے مطب میں زیادہ رش بھی نہیں ہوتا تھا بس اکا دکا افراد ہی نظر آتے تھے اس لئے رشید کے وہاں پہنچتے ہی اور اس کے بتانے پر حکیم نے جلدی سے مرتبانوں سے کچھ سفوف نکال کر ان کی پڑیاں بنائیں اور جلدی سے رشید کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگی رشید کی ماں اس وقت اپنی بہو کے کمرے میں ہی تھی جو مسلسل تکلیف کی شدت سے تڑپ رہی تھی اور اب تو اس کی تکلیف میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر حکیم نے جلدی سے اپنے ہاتھ میں پکڑے تھیلے سے ایک پڑیا نکالی اور پانی لانے کا کہہ کر سفوف اس کے منہ میں انڈیل دیا اتنی دیر میں رشید کی ماں پانی کا گلاس لے آئی تھی حکیم نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس میں سے دو گھونٹ رشید کی بیوی کے منہ میں انڈیل دیئے۔

دوا منہ میں جاتے ہی اس کی تکلیف میں کچھ افاقہ ہوتا محسوس ہوا اور اس کے چلانے میں بھی کچھ کمی آ گئی۔ یہ دیکھ کر حکیم نے تھیلے سے مزید تین پڑیاں اور نکال کر رشید کے ہاتھ میں تھما دیں اور اسے کچھ ہدایات دیتے ہوئے واپسی کے لئے مڑا۔ رشید اس کا تھیلا ہاتھ میں تھامے اس

کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

یہ رات کے تقریباً دس بجے کا وقت ہوگا۔ پورا چاند کی رات تھی جس کی وجہ سے زمین پر چاروں طرف دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی ہر چیز اس کی سفید روشنی میں یوں نظر آرہی تھی جیسے قدرت نے کسی برش سے اس پر سفیدی پھیر دی ہو۔ آسمان صاف و شفاف ہونے کی وجہ سے اس پر چمکتے ستارے بہت بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی اور دل لبھا دینے والی ہوا چل رہی تھی جس کی سرسراہٹ سے درختوں کے پتوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی تھیں۔

جھاڑیوں میں دبکے چھوٹے موٹے جانور اپنی ننھی ننھی سرخ آنکھوں سے اس عفریت کو خوفزدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے جو زمین پر چلنے کی بجائے اڑنے کے انداز میں چل رہی تھی۔ یہ وہی انسانی بھیڑیا تھا جو اسی طرح کی راتوں میں اپنے آقا کے حکم کے مطابق اس کے لئے ایک انسانی بچے کی بھینٹ کی تلاش میں نکلتا تھا۔ اس کا جسم سیاہ بالوں نے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا اور اس کے چہرے سے یوں لگتا تھا۔

جیسے آج کی رات وہ ضرور کوئی ایسی بھینٹ تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائے گا جس کو دیکھ کر اس کا آقا اس سے خوش ہوجائے۔ اس کا رخ اس انسانی آبادی کی طرف تھا جس طرف یہ راستہ جارہا تھا۔ رات کا وقت ہونے کی وجہ سے اسے چلتے ہوئے کوئی انسانی آنکھ دیکھنے سے قاصر تھی۔ کوئی بیوقوف ہی ہوگا جو رات کے اس پہر چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکلنے کی غلطی کرے گا۔ آبادی لگ بھگ تقریباً نصف میل کے قریب رہی ہوگی جس طرف وہ مسلسل بڑھتا جارہا تھا۔ آبادی تقریباً سو گھروں پر مشتمل تھی۔ اس وقت وہاں کے رہائشی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے وہاں کے آوارہ کتے زور زور سے بھونکنے میں مصروف تھے۔

وہ عفریت اس آبادی کے نزدیک پہنچ کر رک گیا وہ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر آبادی میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کررہا تھا جہاں سے داخل ہوکر وہ اپنے شکار کو تلاش کرسکے۔ رات کے اس پہر اگر کوئی ذی روح اس کو اس وقت دیکھ لیتا تو شاید دہشت کے مارے مر ہی جاتا۔ کبھی کبھار دور کہیں سے گیدڑوں کی آوازیں بھی سنائی دے جاتیں جو اس وحشت زدہ ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہی تھیں۔ آبادی کے اندر جانے والی تین گلیاں تھیں جو دائیں بائیں اور ناک کی سیدھ میں جارہی تھیں۔

وہ عفریت دائیں طرف جانے والی ایک پتلی سی گلی میں داخل ہونے کے لئے مڑا۔ ابھی اس نے دو تین قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ کہیں سے تین چار کتے بھونکتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچ کر رک گئے اور زور زور سے بھونکنے لگے ایسا صرف چند لمحوں کے لئے ہوا پھر اس عفریت کی ایک خونخوار غراہٹ سنتے ہی دم دبا کر واپس بھاگ گئے۔ ان کے بھاگنے کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اگر انہیں وہاں کھڑے ایک لمحہ اور لگا تو وہ اس خونخوار عفریت کا شکار ہوجائیں گے۔ وہ خوفناک بلا ان کو واپس بھاگتے دیکھ کر دوبارہ گلی کے اندر گھس گئی۔

گلی میں تقریباً اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور دور دور تک کوئی انسان تو کیا کوئی کتا تک نظر نہیں آرہا تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ کتے اس کے خوف سے کہیں بہت دور بھاگ گئے تھے۔ گلی میں موجود ایک بجلی کے کھمبے پر لگا کم پاور کا بلب بمشکل اندھیرا کم کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ عفریت اپنے بھاری قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھتی جارہی تھی چلنے کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ کسی چرخی کی مانند چاروں طرف گھوم رہا تھا جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔ بڑی حیرت کی بات تھی کہ اس کا سر چاروں طرف یوں گھوم رہا تھا جیسے وہ پلاسٹک کا بنا ہو۔ اور اس میں کوئی ہڈی نام کی چیز نہ ہو۔ اس آبادی کا نام فتح پور تھا جس میں تقریباً سو گھر تھے جن کے زیادہ تر مرد حضرات روزگار کے سلسلے میں شہر میں جاکر اپنی محنت مزدوری سے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔

ہفتے میں ایک بار اپنے گھروں کا چکر لگاتے اور اس کے ساتھ ہی اپنے گھر کے افراد کو ان کی ضرورت کی چیزیں جو وہ شہر سے اپنے ساتھ لاتے دے جاتے اور اس کے ساتھ ہی ان کو ہفتہ بھر کا خرچ بھی دے جاتے۔ اس طرح ہنسی خوشی یہ سب اپنا وقت گزار رہے تھے۔ آبادی میں ایک

گورنمنٹ کا ایک چھوٹا سا اسکول بھی تھا جہاں بہت سے چھوٹے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اسکول کا ماسٹر ایک بی اے پاس بوڑھا شخص تھا جس کا نام قمر دین تھا وہ ایک پرائمری اسکول ٹیچر تھا جو اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہو چکا تھا اور اب گورنمنٹ سے پنشن لے کر اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ پالتا تھا۔

قدرت نے اسے کوئی اولاد نہیں دی تھی اس لئے جو پنشن اسے ملتی تھی وہ ان دونوں کی ضرورت کے لئے بہت تھی اس لئے اس نے بغیر تنخواہ کے اس اسکول میں کچھ وقت کے لیے اپنی خدمات مہیا کر رکھی تھیں جس کا وہ حکومت سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا۔ اس کے اس جذبے کو دیکھتے ہوئے حکومت کے کچھ کارندوں نے اسے اس کی اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنا کچھ وقت اس اسکول کو دے سکے۔

فتح پور کے رہائشی ماسٹر قمر دین کی بہت عزت کرتے تھے جو ان کے بچوں کو بڑے پیار سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ بہت سے گھروں کے افراد اپنے گھروں سے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی اشیاء بھی کبھی کبھار ماسٹر قمر دین کے گھر بھیج دیا کرتے تھے اور اس طرح ان دونوں میاں بیوی کو اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شریک کیا کرتے تھے۔ ماسٹر قمر دین ان کی اس مہربانیوں کا دل سے اعتراف کرتا تھا اور ان کے بچوں کو بڑے پیار سے اور شفقت سے پڑھاتا تھا۔ بچے بھی اسے بہت چاہتے تھے اور اس کا کہنا مانتے تھے۔ فتح پور کا ریلوے اسٹیشن وہاں سے تقریباً دو میل کی مسافت پر تھا لیکن جب بھی کوئی ٹرین اپنی پوری رفتار سے وہاں سے گزرتی تو فتح پور میں اس کی گونج ضرور سنائی دیتی۔ مسافر ٹرین بہت کم رکتی تھیں صرف تین بوگیوں پر مشتمل ایک پسنجر ٹرین دن میں دو بار وہاں سے گزرتی تھی اور وہی فتح پور کے باسیوں کا واحد سہارا تھی جو اس پر سفر کر کے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے شہر جاتے تھے اور پھر اسی پر واپس آتے تھے۔

ٹرین صبح سویرے شہر کی طرف روانہ ہوتی اور پھر شام کو مغرب کے وقت دوبارہ فتح پور کے اسٹیشن پر پہنچتی اور مسافروں کو وہاں اتار کر آگے بڑھ جاتی پھر دوسرے روز اپنی منزل سے روانہ ہو کر یہاں سے مسافروں کو لے کر شہر چلی جاتی۔ فتح پور کے زیادہ تر رہائشی اسی ٹرین پر سفر کرنا پسند کرتے کیوں کہ اس کا کرایہ بہت کم ہوتا تھا۔ شہر کی طرف دو بسیں بھی چلتی تھیں لیکن ان کا کرایہ بھی بہت تھا اور اس میں رش بھی بہت زیادہ ہوتا تھا کیونکہ وہ بسیں آبادی کے اندر سے روانہ ہوتی تھیں لیکن ٹرین میں سفر کرنے کے لئے لوگوں کو ریلوے اسٹیشن پہنچنا ہوتا تھا اور اس کے لئے دو میل کی مسافت الگ طے کرنا پڑتی تھی۔

لیکن اتنی تکلیف اٹھانے کا ان کو یہ فائدہ ضرور ہوتا تھا کہ ان کے پیسے بچ جاتے تھے اور خوشی خوشی ٹرین میں کم کرایہ دے کر شہر جا کر اپنی شاپنگ کرتے تھے۔

قیوم صبح سویرے اٹھا اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور اپنے چھوٹے بیٹے زاہد کو تیار کرنے کا کہہ کر خود گھر سے باہر نکل گیا۔ آج اس نے اپنے بیٹے زاہد کو شہر لے جا کر اس کے لئے اسکول کی نئی یونیفارم خریدنی تھی اور ناپ وغیرہ کے لئے اس کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ خود گھر سے باہر اس لئے نکل گیا تھا کہ رات کو اس کے ایک دوست نے اسے تاکید کی تھی کہ جب وہ شہر جائے تو واپسی میں اس کا بھی ایک کام کرتا آئے ورنہ اس کام کے لئے اسے خود شہر جانا پڑتا۔ گاؤں کے لوگوں میں چونکہ آپس میں محبت اور پیار بہت ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے کام کو اپنا کام ہی سمجھتے ہیں اس لئے انہیں ایک دوسرے کے کام آ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے قیوم شہر جانے سے پہلے اس دوست سے مل کر اس کے کام کی نوعیت کا پوچھنے گھر سے نکلا تھا اور ساتھ ہی اپنی بیوی کو تاکید کر گیا کہ اس کی واپسی تک وہ زاہد کو اچھی طرح ناشتہ وغیرہ کروا کر اور نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا کر تیار کر دے۔

جس دوست کے پاس وہ گیا تھا وہ گاؤں میں ایک درزی خیر دین تھا جس کی اچھی اور صاف ستھری سلائی وہاں کے لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ وہ رات دیر تک اپنی چھوٹی سی دوکان میں لوگوں سے لئے گئے کپڑے سلائی کرتا رہتا تھا۔ سادہ سلائی تو وہ خود ہی کر لیتا تھا لیکن جب کوئی ایسا

سوٹ آجاتا جس پر کوئی کڑھائی کا کام ہوتا تو اس کے لئے اسے شہر جانا پڑتا اور اس کے لئے وہ مالک سے کم از کم ایک ہفتہ ضرور لیتا تھا تا کہ اس دوران وہ سلائی کے کیساتھ کیساتھ کڑھائی کا کام بھی مکمل کروا سکے۔ایسے کام کی اسے مزدوری بھی بہت اچھی مل جاتی تھی اور مالک بھی کام کو دیکھ کر اسے داد دیئے بنا نہیں رہ سکتے تھے۔

گزشتہ چار پانچ دنوں سے اس کی طبیعت ناساز تھی جس کی وجہ سے وہ سلائی بھی بہت کم کر رہا تھا لیکن جو کام اس نے پہلے لے رکھا تھا اس کو واپس کرنے میں پہلے ہی بہت دیر ہو چکی تھی۔اگر صرف سادہ سلائی ہی ہوتی تو شاید وہ جیسے تیسے کر کے کام مکمل کر کے واپس کر چکا ہوتا لیکن کچھ سوٹ ایسے بھی تھے جن پر کچھ ڈیزائننگ اور کڑھائی وغیرہ کا بھی کام تھا اس لئے طبیعت کی ناسازگی کی وجہ سے اسے شہر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

رات اتفاق سے قیوم سے باتوں میں جب اسے پتہ چلا کہ وہ صبح اپنے بیٹے زاہد کو اسکول کی یونیفارم دلانے کے لئے شہر جا رہا ہے تو اسے یکدم یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنے وہ سوٹ جو صرف کڑھائی وغیرہ کے لیے پڑے ہوئے ہیں وہ قیوم کے ہاتھ شہر کے اس دوکاندار کے پاس بھیج دے جہاں سے وہ کڑھائی وغیرہ کرواتا تھا۔اسی لئے اس نے قیوم سے درخواست کی تھی کہ جب وہ صبح شہر کے لئے نکلے تو اس سے ملتا ہوا جائے تا کہ وہ اسے کام سمجھانے کے ساتھ ساتھ سوٹ بھی دے سکے۔قیوم اسی سلسلے میں اس وقت اس کے پاس بیٹھا کام سمجھ رہا تھا۔خیرو درزی اسے تمام سوٹ دے کر کہنے لگا۔۔۔"قیوم بھائی یہ چار سوٹ ہیں ان میں سے تین سوٹ تو آپ وہاں ہی چھوڑ آیئے گا کیونکہ ان میں کڑھائی اور ڈیزائننگ کا زیادہ کام ہے لیکن یہ کالا سوٹ اس پر صرف تھوڑی سی کڑھائی کا کام ہے اگر یہ آپ ساتھ ہی لے آئیں گے تو بہت اچھا ہو جائے گا اس کے لئے میری طرف سے اس دوکاندار کو بہت تاکید کر دیجئے گا تا کہ اس سوٹ کو میں اس کے مالک کو دے سکوں یہ سوٹ لئے مجھے بہت دن ہو گئے ہیں اس لئے اس سے پہلے کہ اس کا مالک مجھ پر ناراض ہو میں اس کی ناراضگی سے پہلے ہی اس کا یہ کام مکمل کر کے اسے دے دینا چاہتا ہوں۔" خیرو نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر قیوم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سوٹ والا شاپر پکڑا اور پھر اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہاں سے واپس گھر کی طرف چل دیا۔گھر میں زاہد تیار ہوا اس کا ہی انتظار کر رہا تھا اس سارے کام میں چونکہ دیر ہو چکی تھی اور ٹرین کا وقت بھی گزر گیا تھا اس لئے اب شہر جانے کے لئے ان کے پاس صرف بس سے سفر کرنے لازمی ہو گیا تھا۔اس نے زاہد کا ہاتھ پکڑا اور بیوی کو خدا حافظ کہتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔بس سٹاپ وہاں سے تھوڑی ہی دور ایک برگد کے ایک بڑے سے درخت کے نیچے بنا ہوا تھا جس کے آس پاس چند ٹھیلے بھی موجود تھے جن پر موسمی فروٹ اور گنے کا جوس بیچنے والوں نے اپنا دھندا شروع کیا ہوا تھا۔

گاؤں کے نمبردار نے بس کے مسافروں کے بیٹھنے کے لئے وہاں چند بنچ رکھوا دیئے تھے جن پر عورتیں اور بچے بس کا انتظار کرنے کے لئے بیٹھ جاتے تھے۔گاؤں کی دو بسیں اپنے مقررہ وقت پر نمودار ہوتی تھیں اور پھر مسافروں کو کھچا کھچ بھر کر شہر کی جانب فراٹے بھرتی یہ جا وہ جا ہو جاتیں۔

عورتوں اور بچوں کو کوشش کی جاتی کہ بس میں سیٹ دی جائے اس کے لئے وہاں کے نوجوان اور دیگر مسافر بہت تعاون کرتے تھے اور خود ہی اپنی سیٹوں سے اٹھ کر انہیں جگہ دے دیتے۔اس کی نسبت شہروں میں یہ احساس بہت کم ہوتا ہے کہ لوگ ایسے موقعوں پر عورتوں اور بچوں کو اپنی جگہ دیں۔لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں ایسے موقعوں پر عورتوں، بچوں اور بزرگوں کو بہت عزت دی جاتی ہے اور ممکن طریقے سے ان کے آرام و احترام کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ملک بہت جلدی سے ترقی کرتے ہیں کیونکہ ایسے لوگوں کو دعائیں بھی تو پھر ڈھیروں ملتی ہیں جس کی وجہ سے اس کا پھل بھی کھاتے ہیں۔

تقریباً بیس منٹ انتظار کرنے کے بعد دور سے ایک کھٹارا سی بس آتی نظر آئی اس کے پیچھے دھوئیں کا ایک

طوفان تھا جس رنگ سیاہ تھا دھوئیں کا رنگ بتا رہا تھا کہ نجانے کب سے اس میں گھٹیا معیار کا ڈیزل اور تیل استعمال کیا جارہا ہے۔ دیہاتی لوگوں کو ایسے مسائل سے آگاہی کم ہی ہوتی ہے اس لئے وہ اس پر غور کرنے کی بجائے صرف اس بات پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں کہ بس میں زیادہ رش تو نہیں ہے کیا انہیں سیٹ مل جائے گی یا بس میں کھڑے ہوکر شہر تک کا سفر کرنا پڑے گا۔ بس پر نظر پڑتے ہی بس سٹاپ پر کھلبلی سی مچ گئی اس وقت وہاں تقریباً دس بارہ مسافر ہی تھے جن میں چھ عورتیں اور تین بچے، ایک نوجوان اور دو بوڑھے شامل تھے ہر کسی کی کوشش تھی کہ بس میں پہلے سوار ہوکر اپنے لئے جگہ لے سکے۔ بس کسی دیو کی مانند چنگھاڑتی ہوئی بس سٹاپ کی طرف ہی فراٹے بھرتی آرہی تھی اور پھر چند منٹوں میں ان کے نزدیک آکر رک گئی۔

بس میں پہلے سے بہت سے افراد سوار تھے اور تقریباً تمام سیٹوں پر لوگ براجمان تھے۔ بس کے رکتے ہی وہ سب اس کی طرف لپکے اور قیوم نے بھی جلدی سے زاہد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پہلے اسے بس میں سوار کروانے کے لئے آگے بڑھا جس کا دروازہ لوگوں سے تقریباً بند ہی ہوگیا تھا لیکن پھر اس کے پیچھے سے دھکیلنے سے کچھ لوگ بس کے اندر چلے گئے جس سے دروازے میں داخل ہونے کے لئے کچھ جگہ بن گئی۔

قیوم نے جلدی سے زاہد کو اٹھا کر بس کے اندر دھکیل دیا اور پھر خود بھی اچھل کر اس کے دروازے سے ہوتا ہوا بس کے اندر گھس گیا۔ بس میں کافی لوگ کھڑے تھے اور کافی شور بھی ہورہا تھا۔ بس کا کنڈیکٹر لوگوں کو خاموش رہنے اور بس کے پچھلے حصے کی طرف جانے کا کہہ رہا تھا لیکن کوئی مسافر بھی اس کی کسی بات پر کان نہیں دھر رہا تھا۔

لیکن پھر قیوم کے کہنے پر کچھ لوگ ذرا پیچھے کی طرف ہوئے تو بس میں کچھ جگہ بن گئی۔ یہ دیکھ کر بس میں کھڑے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا اور قیوم کا شکریہ بھی ادا کیا۔ تمام مسافروں کے بس میں سوار ہوتے ہی بس ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور شہر جانے والے راستے پر دوڑتی چلی گئی۔ کرائے وغیرہ سے فارغ ہوکر قیوم نے زاہد کو اپنے ساتھ ہی کھڑا کیا ہوا تھا۔ زاہد کی عمر تقریباً سات آٹھ سال کے لگ بھگ تھی اور وہ گاؤں کے اسکول میں دوسری کلاس کا طالب علم تھا۔ نیا سال شروع ہونے کی وجہ سے اسکول کی نئی یونیفارم خریدنے کے لئے وہ اس وقت شہر جانے کے لئے بس میں سوار تھا۔ شہر کا فاصلہ گاؤں سے لگ بھگ سولہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لئے چالیس منٹ لگ جاتے تھے کیونکہ بس کھٹارہ ہونے کیساتھ کیساتھ جگہ جگہ رکتی بھی تھی اس لئے زیادہ دیر لگتی تھی۔

بس اپنا مقررہ فاصلہ طے کرکے شہر کی حدود میں داخل ہوگئی اور پھر شہر کے ایک چوراہے میں بس کے رکتے ہیں قیوم زاہد کا ہاتھ تھامے اور کپڑوں والا شاپر ہاتھ میں پکڑے بس سے اتر گیا۔ قمر دین کے سمجھانے کے مطابق اس دوکاندار کی دوکان چوراہے سے زیادہ دور نہیں تھی اس لئے وہ لوگوں سے پوچھتا ہوا اس دوکان پر پہنچ گیا۔

دوکان کے مالک کو قمر دین کا نام بتانے پر اس نے کپڑوں والا شاپر اس کے حوالے کردیا اور ساتھ اس کالے سوٹ کے متعلق جو کچھ قمر دین نے اسے تاکید کی تھی اس کا بھی کہہ دیا۔ دوکاندار نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے کہا کہ اگر اسے شہر میں کوئی اور کام ہے تو وہ کرکے آجائے اتنی دیر میں وہ اس سوٹ والے کام کو مکمل کرلے گا۔

قیوم یہ سنتے ہی زاہد کو لے کر اس دوکان کی طرف چل دیا جہاں اسکول کی یونیفارم دستیاب تھیں۔ اس دوکان کا پتہ اسے کے ایک دوست نے ہی اسے بتایا تھا جو خود اپنے بیٹے کے لئے اسی دوکان سے اس کے لئے یونیفارم لے کر گیا تھا۔

دوکان ڈھونڈنے میں اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی اور کچھ ہی دیر میں وہ اس دوکان کے اندر موجود تھا۔ دوکان میں مختلف قسم کی یونیفارم لگی ہوئی تھیں اس نے زاہد کے ناپ کی ایک یونیفارم جو قدرے زیادہ مہنگی بھی نہیں پسند کی۔ دوکاندار کو اس کی قیمت ادا کرنے کے بعد اس نے یونیفارم والا شاپر ہاتھ میں پکڑا اور زاہد کو لے کر دوکان سے باہر نکل آیا۔ زاہد کو وہ چونکہ بہت عرصہ بعد شہر لایا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ جتنی دیر میں وہ کڑھائی والا سوٹ تیار ہوگا اتنی

دیر میں وہ اسے تھوڑا شہر ہی گھما لے۔ یہ سوچ کر وہ اسے لئے ایک پارک میں چلا گیا جہاں بچوں کی تفریح کے لئے بہت سے جھولے اور سٹال لگے ہوئے تھے اس نے زاہد کو اس کی پسند کے جھولوں میں بیٹھایا اور اس کو خوش ہوتا دیکھ کر خود بھی خوشی کا اظہار کرتا رہا۔ چند ایک سٹال سے اس نے اسے کھانے پینے کی چیزیں بھی دلائیں۔ اور کچھ چیزیں اپنی بیوی کے لئے بھی خریدیں تاکہ واپسی میں اسے دے سکے۔ زاہد اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ ان دونوں کی آنکھ کا تارا تھا وہ دونوں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔

کافی دیر تک گھومنے پھرنے کے بعد وہ دونوں واپس اس دوکان پر آگئے جہاں سے وہ سوٹ لینا تھا لیکن دوکان پر پہنچ کر انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کہ ان کے دوکان سے نکلتے ہی بجلی جانے کی وجہ سے سوٹ جوں کا توں رکھا رہا ہے اور اب چونکہ بجلی کے آنے میں مزید پندرہ منٹ کا وقفہ ہے تو انہیں بہت دکھ ہوا۔ سہ پہر کے ساڑھے تین بج چکے تھے اور شہر سے گاؤں جانے کے لئے آخری بس شام پانچ بجے چلی جاتی تھی اور ٹرین شام چھ بجے نکلتی تھی اس وقت بھی ان کے پاس صرف دو یا تین گھنٹے ہی تھے جس میں وہ یا تو بس پکڑ سکتے تھے یا ٹرین کے ذریعے اپنے گاؤں جا سکتے تھے ورنہ دوسری صورت میں ان کو رات شہر میں ہی رکنا پڑتا اور یہ بات ان کو گوارا نہیں تھی کیونکہ زاہد نے صبح اسکول جانا تھا اور اس کے پاس کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا کہ اپنے گھر اطلاع کر سکتا۔ یہ سوچ کر وہ پریشان بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے کانوں میں دوکاندار کی آواز پڑی جو اسے بتا رہا تھا کہ اگر بجلی کے آگئے ہی وہ ایک گھنٹے کے اندر اندر اس کو کڑھائی والا کام مکمل کر کے دے دے گا اس لئے زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر قیوم کو کچھ حوصلہ ہوا اور پھر بے چینی سے بجلی کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

شہروں میں چونکہ بجلی کے آنے جانے کا ٹائم ٹیبل مقرر ہوتا ہے اس لئے بجلی اپنے مقررہ وقت کے مطابق آگئی اور اس کے ساتھ ہی دوکاندار نے اپنا کام شروع کر دیا۔ دوکان میں رش نہ ہونے کی وجہ سے اس نے جلدی سے اس کا کام ہی شروع کر دیا تھا تاکہ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں جانے والی بس یا ٹرین کو پکڑ سکے۔ بڑی کوشش کے باوجود اسے کڑھائی والا کام مکمل کرنے میں پونے دو گھنٹے لگ ہی گئے۔ لیکن اس سارے کام کی وجہ سے بس گاؤں کے لئے روانہ ہو چکی تھی اس لئے اب ان کے پاس سوائے ٹرین سے سفر کرنے کے کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ یہ سوچ کر اس نے سوٹ والا شاپر اٹھایا اور پیسوں کی رسید جیب میں ڈالتے ہوئے زاہد کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ریلوے اسٹیشن جانے والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیئے جو زیادہ دور نہ تھا۔ اسٹیشن پر اکا دکا مسافر ہی بیٹھے ہوئے تھے جو شام چھ بجے والی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔

غور سے دیکھنے میں قیوم کو ان میں کوئی بھی اپنے گاؤں کا مسافر نظر نہیں آیا جو اس کی جان پہچان کا ہو۔ غالباً وہاں جو مسافر نظر آ رہے تھے یا تو وہ خود کسی کو لینے آئے تھے یا کسی اور شہر کے تھے۔ قیوم زاہد کا ہاتھ تھامے ایک کونے میں رکھے بنچ کی طرف بڑھا اور زاہد کو وہاں بٹھا کر خود ایک سٹال والے سے پوچھنے لگا کہ فتح پور والی ٹرین کس وقت پہنچ رہی ہے پھر اس سٹال والے کے کہنے کے مطابق کہ ٹرین چھ بجے ہی روانہ ہوگی وہ مطمئن ہو کر زاہد کے ساتھ ہی بنچ پر بیٹھ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور سورج آہستہ آہستہ مغرب کی طرف ڈوبتا جا رہا تھا۔

اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے قیوم کو بھی فکر ہو رہی تھی کیونکہ اسٹیشن سے گاؤں کا فاصلہ دو کلومیٹر ہونے کی وجہ سے اسے باقی کا راستہ پیدل ہی طے کرنا تھا اور یہی سوچ سوچ کر اسے فکر کھائے جا رہی تھی کہ وہ یہ فاصلہ رات کے اندھیرے میں کیسے طے کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اس بات کی تسلی تھی کہ اس کے گاؤں کی طرف جانے والا یہ راستہ محفوظ راستہ ہے سوائے وہاں کے کتوں کے علاوہ کبھی بھی کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے وہ اس بات سے تقریباً مطمئن تھا۔

زاہد کو اس نے مونگ پھلی کا ایک پیکٹ لے دیا تھا جسے وہ خاموشی سے کھانے میں مصروف تھا۔ خود اس نے چائے کی طلب ہونے پر ایک کپ چائے وہاں موجود ایک ٹی سٹال سے لے لیا تھا اور اس وقت اسے پینے میں مصروف

تھا ٹھیک شام کے چھ بجے ٹرین کی وصل سنائی دی اور دور سے ٹرین آتی دکھائی دی۔ قیوم نے جلدی سے چائے کا کپ واپس کیا اور زاہد کا ہاتھ تھامے ٹرین کے پلیٹ فارم پر پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ ٹرین آہستہ آہستہ چلتی پلیٹ فارم پر رک گئی ٹرین میں زیادہ رش نہیں تھا قیوم ٹکٹ پہلے ہی خرید چکا تھا جو اس وقت اس کی جیب میں محفوظ تھے۔ قیوم زاہد کا ہاتھ پکڑے جلدی سے اپنے سامنے رکنے والی ٹرین کے ڈبے میں سوار ہو گیا ڈبے میں پندرہ سولہ مسافر سوار تھے اور انہیں بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں آئی۔ ٹرین دس منٹ تک رک کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔

ٹرین کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی زبردستی اسے آگے دھکیل رہا ہو۔ پسنجر ٹرینوں کی رفتار تقریباً ایسی ہی ہوتی ہے اس لئے وہ بے بسی سے اسے آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ شہر اور فتح پور گاؤں کے درمیان تقریباً تین دیہات اور بھی تھے جن کے چھوٹے اسٹیشنوں پر بھی ٹرین نے رکنا تھا اس لئے اس کی رفتار نہ ہونے کی برابر ہی تھی۔ دو اسٹیشنوں کو کراس کرنے کے بعد ٹرین تیسرے اسٹیشن کی جانب بڑھ رہی تھی۔

اچانک بریک لگنے سے ایک جھٹکے سے قیوم بے خیالی میں سیٹ سے نیچے گرتے گرتے بچا اور اس اچانک جھٹکا لگنے سے اس نے ساتھ ہی زاہد کو بھی سنبھالا جو اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ٹرین رک چکی تھی اور سب مسافر اپنی سیٹوں پر بیٹھے کھڑکیوں سے باہر رات کے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے لیکن باہر گھپ اندھیرا ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

غالباً ٹرین کسی جنگل یا ویرانے میں کھڑی ہوئی تھی اور کیوں کھڑی ہوئی تھی اس کے جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ قیوم کچھ دیر تک بیٹھا انتظار کرتا رہا پھر کھڑکی کا شیشہ اوپر اٹھا کر باہر جھانکنے لگا۔ اس نے جیسے ہی سر باہر نکالا اس کی کھڑکی کے نیچے سے گاڑی کا گارڈ گزرتا نظر آیا اس نے جلدی سے سلام کر کے اس گارڈ سے گاڑی کے رکنے کا سبب پوچھا تو گارڈ نے بتایا کہ سامنے سے ایک بڑی ٹرین آ رہی ہے جسے کراس دینے کے لئے گاڑی رکی ہے۔ اور اس کے گزرنے کے بعد ہی ٹرین دوبارہ روانہ ہو گی۔ یہ سن کر اس نے اپنا سر اندر کر لیا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد دور سے کسی ٹرین کی وصل سنائی دی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک ٹرین طوفان کی طرح نمودار ہوئی اور فراٹے بھرتی ان کی ٹرین کے نزدیک سے گزر گئی۔

ٹرین کی تقریباً اٹھارہ کے لگ بھگ بوگیاں ہوں گی جو شور مچاتی ان کے نزدیک سے گزرتی جا رہی تھیں۔ اس ٹرین گزرنے کے دس منٹ بعد ان کی ٹرین نے وصل دی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اس سارے کام میں رات کے آٹھ بج چکے تھے اور چار سو رات کا گھپ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ قیوم کو رہ رہ کر یہ فکر ستائے جا رہی تھی کہ جتنی دیر اسے گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچنے لگے گی اتنی ہی پریشانی اپنے گھر تک پہنچنے میں اٹھانی پڑے گی۔ لیکن وہ بے بس تھا کیا کر سکتا تھا اس لئے بے بسی سے گاڑی کے منزل پر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر آخری اسٹیشن پر پہنچ کر ٹرین اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی اور رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔

جب قیوم زاہد کا ہاتھ پکڑے ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ ریلوے اسٹیشن پر چونکہ روشنی کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا صرف کہیں کہیں پلیٹ فارم پر موجود چند اسٹینڈ پر لالٹین لٹکا کر ان میں روشنی کی گئی تھی۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے آفس میں گھسا اپنی کرسی پر اونگھ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر یہ دیکھنے کی بھی تکلیف نہیں کی تھی کہ کونسی گاڑی آن کر رکی ہے اور کونسی روانہ ہوئی ہے۔ عجیب طرح کا رویہ تھا اس اسٹیشن ماسٹر کا۔ اس وقت وہ دونوں مسافر ہی وہاں اترے تھے۔ کوئی اور بندہ بشر وہاں موجود نہیں تھا۔ قیوم نے زاہد کا ہاتھ پکڑا اور اسے لئے اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔

پورے چاند کی رات تھی چاند کی دودھیا روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی ہر چیز قدرت کی اس انمول نعمت سے نکھر کر سامنے آ گئی تھی۔ چاند کی روشنی میں گاؤں کی طرف جانے والا راستہ صاف نظر آ رہا تھا راستے کے دونوں طرف

کھیت تھے جن میں لگی فصلیں ہوا سے لہلاتی بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

قیوم نے راستے سے ایک درخت کی موٹی سی شاخ توڑ کر ہاتھ میں لے لی تھی تاکہ بوقت ضرورت کسی جنگلی جانور سے بچا جا سکے۔ آسمان پر چمکتے ستارے بہت بھلے لگ رہے تھے۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اور باتیں کرتے گاؤں کے راستے پر بڑھتے جا رہے تھے۔ دور کہیں سے گیدڑوں اور لگڑ بھگوں کا شور بھی سنائی دے رہا تھا لیکن ابھی تک کوئی جنگلی جانور ان کے سامنے نہیں آیا تھا جس کی وجہ سے انہیں کوئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس لئے وہ اطمینان سے ادھر ادھر دیکھتے اپنی راستے پر چل رہے تھے۔ دو میل کا فاصلہ انہوں نے تقریباً سوا گھنٹے میں طے کر لیا اور آخر کار گاؤں کے داخلی راستے پر پہنچ کر سکھ کا سانس لیا۔

قیوم کا گاؤں پہلی گلی کے درمیان میں واقع تھا اس لئے وہ ہاتھ میں تھامی لکڑی کو دور پھینک کر اس گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی میں چلتے ہوئے ابھی اسے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو گی کہ اس نے ایک بھیانک اور انتہائی دہشتناک منظر دیکھا۔

ایک انسانی بھیڑیا اس سے پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر کھڑا ان کی جانب ہی دیکھ رہا تھا اس کے جسم پر سیاہ بالوں نے اس کو مکمل طور پر ڈھانپ رکھا تھا۔

قیوم اور زاہد کے حلق میں جیسے ان کی چیخیں پھنس کر رہ گئی تھیں اور ان کے پاؤں نے جیسے زمین کو مضبوطی سے قابو کر لیا تھا اور وہ بھاگنے کے باوجود بھی بھاگ نہیں پا رہے تھے۔ وہ عفریب کچھ دیر تک کھڑی ان کو گھورتی رہی اس کی سرخ چمکدار آنکھیں بہت خوفناک لگ رہی تھیں اور پھر اپنے قدم اٹھاتے ان کی جانب بڑھی قیوم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا سارا جسم مفلوج ہو گیا ہو اور زاہد بے اپنی منجمد آنکھوں سے اس خوفناک بلا کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا۔

قیوم کے ہاتھ سے سوٹ والا شاپر زمین پر گر گیا تھا اور بے خیالی میں اس کے ہاتھ سے زاہد کا ہاتھ بھی چھوٹ گیا تھا۔ وہ بلا قدموں سے دھم دھم کی آواز نکالتی ان کی جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی اور پھر اتنی قریب آ گئی کہ ان دونوں کو اس کے گرم گرم سانس لینے کی آواز صاف سنائی دینے لگی اور پھر ایک جھٹکے سے اس بلا نے اپنا بڑے بڑے ناخنوں والا ہاتھ آگے بڑھایا اور ایک جھپٹے سے زاہد کو دبوچ کر وہاں سے جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔

قیوم بت بنا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جب اسے ہوش آیا تو وہ عفریت زاہد کو اٹھا کر بہت دور جا چکی تھی۔ اور تھوڑی ہی دیر میں گھنے جنگل میں گم ہو چکی تھی۔

قیوم کو ہوش آتے ہی ایک جھٹکا لگا اور پھر جب اس کے شعور نے اسے اصل حقیقت کا احساس دلایا تو وہ چیختا چلاتا اپنے گھر کی طرف بھاگا۔

رات کے اندھیرے میں اس کے چیخنے چلانے سے گاؤں میں ایک شور مچ گیا اور بہت سے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے اور پھر اس کے بتانے پر کہ کس طرح وہ خونی عفریت اس کے بیٹے کو اٹھا کر گھنے جنگل میں بھاگ گئی ہے۔

گاؤں کے لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے لیکن کسی میں بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ کوئی اس عفریت کے پاس جا کر اس کے بیٹے کو واپس لا سکے۔ اس لئے وہ صرف افسوس ہی کر رہے تھے۔ قیوم کی بیوی کا رو رو کر برا حال تھا اور اس پر بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ قیوم کی اپنی حالت بہت خراب ہو رہی تھی شور سے گاؤں کا حکیم بھی وہاں پہنچ گیا تھا اور اس نے بھی اپنی کوشش سے زاہد کی ماں کو ہوش دلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بار بار بیہوش ہو رہی تھی ظاہر ہے اس کا اکلوتا بیٹا اس سے جدا ہو گیا تھا اور نجانے وہ عفریت اس کے بیٹے کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی یہ سوچ سوچ کر بھی اسے بیہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

کچھ لوگ نمبردار کو بلانے اس کے ڈیرے کی طرف دوڑ گئے جو تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا لیکن جب اس نے یہ سنا کہ یہ سب کارستانی کسی خوفناک عفریت کی ہے تو وہ بھی کچھ پریشان ہو گیا۔ وہ قیوم کو دلاسہ دینے لگا کہ اس وقت رات کے اندھیرے میں جنگل میں جانا اور اس عفریت سے مقابلہ کرنا کسی طور پر مناسب نہیں ہے ہاں البتہ صبح کے وقت جنگل میں جا کر اسے ڈھونڈا جا سکتا ہے لیکن اس وقت تک وہ

عفریت اس بچے کے ساتھ کیا کرتی ہے اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔

مسجد کے مولوی نے اسے اللہ کی مرضی سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی اور صبر کرنے والوں کو کتنا اجر اور ثواب لکھا گیا ہے اس کے متعلق بتانے لگا۔ قدوم اپنے ہوش سے بیگانہ ہوگیا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ لوگ اسے کیا کہہ رہے ہیں اور کیا سمجھا رہے ہیں۔ اسے تو صرف اپنے پیارے لخت جگر کی فکر ہی ستائے جارہی تھی جو وہ عفریت اسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ لوگوں کا ہجوم کم ہونے لگا اور لوگ افسوس کرتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔

نمبردار نے بھی قدوم سے اجازت لی اور اپنے کارندوں کے ساتھ اپنے ڈیرے کی جانب چل دیا۔ اس نے دل ہی دل میں صبح شہر جا کر پولیس سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ دوبارہ کبھی اس قسم کا واقعہ رونما نہ ہوسکے۔ اس واقعہ سے گاؤں کے لوگوں میں خوف وہراس پھیل گیا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں کے لوگوں میں یہ خوف پختہ ہو جائے اور وہ کھیتوں میں جانے سے بھی گھبرانے لگیں۔ یہی سوچتا ہوا وہ اپنی حویلی کے اندر داخل ہوگیا۔

دو تین روز تو بخیر وخوبی گزر گئے اور اس دوران رشید کی بیوی کی طبیعت بحال رہی لیکن اس کے بعد ایک روز اچانک جب وہ گھر کے آنگن میں بیٹھی سبزی بنارہی تھی کہ ایک گوشت کا بڑا سا لوتھڑا اس کے سامنے آن گرا۔ گوشت سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے ابھی ابھی اسے کسی جانور کے جسم سے علیحدہ کیا ہو اور لا کر اس کے سامنے پھینک دیا ہو عجیب بات یہ تھی اس کے ساتھ اس جانور کے جسم کے بال تک کھال سمیت موجود تھے جن کی رنگت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی سرخ بالوں والے جانور کے جسم سے کاٹا گیا ہو۔

یوں اچانک اتنا بڑا گوشت کا لوتھڑا اپنے سامنے گرتے دیکھ کر چھری اس کے ہاتھ پر لگ گئی جس سے خون کی دھار نکل کر فرش پر گرنے لگی۔ اس وقت گھر میں اس کی ساس موجود نہیں تھی وہ اکیلی ہی گھر میں موجود تھی اس نے جلدی سے چھری ایک طرف پھینکی اور بھاگتی ہوئی ایک طرف کونے میں رکھی پرانی سی چادر کا کچھ حصہ پھاڑ کر اسے اپنے ہاتھ پر باندھ لیا لیکن خون مسلسل بہہ رہا تھا اور اب تو اسے ہاتھ میں تکلیف بھی ہونے لگی تھی یہ دیکھ کر اس نے گھر کے باہر کی جانب قدم بڑھائے تاکہ گلی میں کھیلتے کسی بچے کو حکیم کو بلانے کا کہہ سکے۔

وہ رشید کو بلا کر پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے اس نے سوچا کہ پہلے حکیم کو بلا کر کوئی دوا یا مرہم وغیرہ کروالے پھر شام کو رشید کو بتادے گی۔ یہ سوچ کر اس نے پہلے حکیم کو بلانے کا ہی ارادہ کیا۔ گلی میں جھانک کر دیکھا تو ایک بچہ کوئی سودا سلف لینے گھر سے نکلا تھا کہ جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچا اس نے اسے آواز دے کر جلدی سے حکیم کے مطب کی طرف دوڑا دیا اور تھوڑی ہی دیر میں حکیم اپنا تھیلا اٹھائے گھر کے دروازے پر موجود تھا۔

حکیم کی دستک سن کر اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور حکیم کو اندر آنے کا کہہ کر صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گئی حکیم بھی صحن سے ہوتا ہوا اس کے نزدیک پہنچا اور پھر اس کے بتانے پر اس نے ہاتھ پر بندھے کپڑے کو اتارنا چاہا خون جمنے کی وجہ سے کپڑا ابھی کھال کے ساتھ چپک گیا تھا یہ دیکھ کر حکیم نے تھوڑا سا پانی ہاتھ میں لیکر پہلے کپڑے کو گیلا کیا پھر آہستہ آہستہ کپڑے کو اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ سے جدا کرنے لگا۔ گیلا ہونے کی وجہ سے کپڑا اب آسانی سے اتر گیا تھا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا پھر نجانے کیوں اتنا خون نکلا۔

حکیم نے پہلے ایک صاف کپڑے سے اس کے زخم کو اچھی طرح صاف کیا پھر تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک مرہم کی ڈبی نکالی جس میں سبزی مائل رنگ کی کوئی مرہم نظر آرہی تھی اس نے اس مرہم کو اپنی انگلی کی مدد سے اس کے زخم پر لیپ کرنا شروع کردیا۔ جب زخم اچھی طرح ڈھک گیا تو اس نے اسے یوں ہی کھلا چھوڑ کر رشید کی بیوی کو کچھ بتایا اور ایک دو پڑیا پانی کے ساتھ کھانے کا کہہ کر واپس مطب کے لئے گھر سے نکل گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی فیس یا دوا کے پیسے رشید اسے ضرور دے دے گا اس لئے اس نے رشید کی بیوی سے پیسوں کا تقاضہ بھی نہیں کیا تھا۔

رشید کی بیوی اس دوران وہ گوشت کا لوتھڑا گھر کے

کوڑے دان کی نظر کر چکی تھی اور بے چینی سے رشید کے گھر آنے کا انتظار کرنے لگی۔اس کی ساس پڑوس میں کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی اور شام کو دیر سے لوٹنے کا کہہ کر صبح ہی گھر سے نکل گئی تھی۔اس لئے اب اسے رشید کے گھر آنے کا شدت سے انتظار تھا تا کہ اسے وہ گوشت کا لوتھڑا بھی دکھا سکے اور اپنے ہاتھ کا زخم بھی۔

شام کے سائے پھیلتے ہی رشید حسب معمول گھر میں داخل ہوا اور دوڑ کر اس کی جانب لپکی۔رشید اس کو اس طرح اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر چونک گیا اور ہاتھ میں تھاما فروٹ کا شاپر ایک طرف رکھ کر اپنی بیوی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا اور جیسے ہی اس کی نظر اس کے زخمی ہاتھ پر پڑی تو اس نے فوراً اس سے اس کا سبب پوچھا اور پھر اس کے بتلانے پر پہلے تو اسے یقین نہیں آیا لیکن جب اس نے کوڑے دان میں پڑا وہ گوشت کا ٹکڑا اسے دکھایا تب جا کے اسے یقین کرنا ہی پڑا۔

رشید اب کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی کے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔اس کا بار بار شک اپنی ماں کی طرف ہی جاتا تھا جسے وہ کئی بار گھر سے غائب پا چکا تھا لیکن چونکہ وہ اس کی ماں تھی اس لئے وہ ایسا سوچتا اور سر جھٹک دیتا لیکن اب جس طرح کے یہ واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے اس سے وہ کچھ سوچنے لگا تھا کہ ہو نہ ہو اس سارے واقعات کے پیچھے اس کی ماں کا ہاتھ ضرور ہے۔وقت گزرتا گیا اور اب وہ محتاط ہو گیا تھا خاص طور پر رات کو اکثر صحن کا چکر ضرور لگاتا تا کہ دیکھ سکے کہ اس کی ماں وہاں موجود ہے یا نہیں لیکن ایسا کرنے پر ہر بار وہ اسے صحن میں سویا ہی پاتا اس لئے اب اس کا شک ختم ہو گیا تھا اور وہ اسے اتفاق سمجھ کر خاموش ہو گیا۔

یہ رات کے تقریباً ایک بجے کا وقت ہو گا رشید اور اس کی بیوی اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔رشید کی ماں صحن میں سوئی ہوئی تھی۔کمرے کا اکلوتا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔جب سے رشید کی بیوی کے ساتھ اس قسم کے واقعات ہونے لگے تھے اس وقت سے رشید نے اس کے کہنے پر کمرے میں بلب جلتا رہنے دیا تھا تا کہ رات کے وقت اگر وہ کسی حاجت سے اٹھتی ہے تو اندھیرے میں خوف محسوس نہ کرے۔

کمرے میں ان دونوں کے خراٹے گونج رہے تھے اور اس وقت وہ دونوں گہری نیند کے مزے لوٹ رہے تھے۔کہ اچانک کمرے کا بلب ایک جھٹکے سے بجھ گیا اور کمرے میں گھپ اندھیرا پھیل گیا۔اس کے ساتھ ہی رشید کی بیوی کی چارپائی کے پاس ایک سایہ سا نمودار ہوا جس کی جسامت چھ سات فٹ کے قریب ضرور ہو گی اس کا ہلکا سا ہیولہ اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہا تھا وہ ہیولہ آہستہ سے رشید کی بیوی کے جسم پر جھکا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلہ دبوچ لیا اس کے ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

اس اچانک افتاد پر رشید کی بیوی نے مزاحمت کرنا چاہی لیکن لگتا تھا جیسے کسی شکنجے میں اس کی گردن پھنس گئی ہو اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اپنا دفاع نہیں کر پائی اور اس کے گلے سے یوں خرخراہٹ کی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی بکرے کو ذبح کرتے وقت نکلتی ہیں۔اس نے تھوڑی دیر تک ہاتھ پاؤں چلائے پھر ایکدم اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

یہ کام ہوتے ہی وہ ہیولہ اچانک کمرے سے غائب ہو گیا اور بلب بھی دوبارہ جل اٹھا۔اس ساری کارروائی میں رشید بدستور سویا ہوا تھا اور اسے اس بات کا احساس تک نہیں ہوا کہ اس کی دنیا لٹ چکی ہے اور اس کی پیاری بیوی اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

صبح حسب معمول اٹھتے ہی جیسے رشید نے اپنی بیوی کو اٹھنے کے لئے آواز دی تو اس کے بار بار بلانے پر بھی جب اس کی بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا تو اسے تشویش ہونے لگی اور وہ فوراً اٹھ کر جیسے ہی اس کی چارپائی کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ اس کی بیوی کی اکڑی ہوئی لاش بستر پر موجود تھی اور اس کا جسم اکڑا ہوا تھا بجانے کس وقت وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ چیختا ہوا صحن میں سوئی اپنی ماں کے پاس پہنچا اور جلدی سے اسے جھنجھوڑنے لگا پہلے تو اس کی ماں کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔

لیکن جب حقیقت کا اسے پتہ چلا تو وہ بھی دوڑتی

ہوئی اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور پھر ساری بات اس کی سمجھ میں خود بخود آ گئی وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی اور شاہ بابا کا شکریہ ادا کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے موکلوں نے اس کی بہو سے اس کا پیچھا چھڑا دیا تھا۔ وہ بہو کی حالت دیکھ کر بین کرنے لگی اور ان لوگوں کے شور اور رونے کی وجہ سے آس پڑوس سے بھی لوگ گھر میں آ گئے اور پھر حقیقت جان کر انگشت بدنداں رہ گئے کہ رشید کی بیوی بظاہر کسی تکلیف میں بھی نہیں تھی اور ابھی کل ہی وہ بھلی چنگی بھی تھی لیکن اس کی اس طرح اچانک موت نے سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس کی لاش اکڑ ضرور گئی تھی۔

لیکن سب سے حیرت والی یہ بات تھی کہ اس کی گردن پر کسی قسم کے نشان نہیں تھے لگتا ہی نہیں تھا کہ کسی نے بڑے زور سے اس کا گلہ دبوچا ہو۔ اس لئے سب اس کی موت کو دل کا دورہ ہی سمجھ رہے تھے۔ رشید اپنی بیوی کے غم میں نڈھال ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی موت کا ذمہ دار ان واقعات کو قرار دے رہا تھا جو کچھ روز پہلے اس کے ساتھ رونما ہو رہے تھے۔ دیگر رسومات سے فارغ ہو کر اس کی بیوی کو دفنا دیا گیا۔ اور دوسری طرف رشید کی ماں اپنی بہو سے پیچھا چھوٹ جانے پر بہت خوش تھی لیکن اپنی اس خوشی کا اظہار کر کے وہ کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی اس لئے خاموشی سے ادھر ادھر کام کرتی پھر رہی تھی۔

لیکن اللہ تعالیٰ بھی کسی بے گناہ کا خون رائیگاں نہیں جانے دیتا ایک روز گھر سے باہر کسی کام کے سلسلے میں وہ نکلی تو شام کا اندھیرا ہونے کی وجہ سے گلی میں موجود کسی زہریلے سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ ایک منٹ میں وہیں تڑپ تڑپ کر موت کا شکار ہو گئی۔ قدرت نے اس سے اس کی بہو کے قتل کا بدلہ لے لیا تھا۔

دلجیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کا کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد قافلے میں کچھ بوڑھے لوگوں نے مشورہ کر کے دیگر افراد کو جلد از جلد گاؤں کی جانب بڑھنے کی تاکید کی وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ لوگ مزید وہاں رک کر کسی اور مصیبت کا شکار ہو جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں دلجیت سنگھ اور اس کے ساتھ گئے چند نوجوانوں کی طاقت پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ اس بچے کو ضرور واپس لے کر آئیں گے۔ لیکن اس بچے کی ماں اپنے بچے کو لئے بغیر گاؤں جانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی لیکن پھر لوگوں کے سمجھانے کے باوجود کہ صرف بچے کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں کی زندگی داؤ پر نہ لگائے اس لئے وہ جمع خاطر رکھے دلجیت ضرور اس کے بچے کو اس خوفناک بلا کے پنجے سے چھڑا لائے گا۔ یہ سن کر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ سفر کرنے پر مجبور ہو گئی۔

یہ فیصلہ کرتے ہی قافلہ ایک بار پھر اپنی منزل پر چل پڑا اس دوران پریت کور کی بگھی میں کچھ نوجوان آ کر بیٹھ گئے تھے تا کہ اس کو تحفظ دے سکیں۔ پریت کور بھی دلجیت سنگھ کے لئے پریشان تھی کہ وہ انہوں نے اتنی دیر نجانے کیوں لگا دی تھی۔ لیکن اسے دلجیت سنگھ کی صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ تھا اس لئے وہ مطمئن تھی۔

صبح ہونے سے پہلے پہلے وہ سب اپنے گاؤں پہنچ گئے اور وہاں پہنچ کر سب نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گاؤں کے لوگوں کو جب ان کی زبانی سب حقیقت کا پتہ چلا تو وہ سب بھی بہت پریشان ہو گئے۔ بچے کی ماں کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی لیکن وہ پریشان ضرور تھی۔

گاؤں کے دیگر افراد اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے اور پریت کور کو اس کے سسرال والوں نے لے جا کر حویلی کے ایک کمرے میں بیٹھا دیا۔ حجلہ عروسی والے کمرے کو بڑی نفاست اور خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ جس سے اس گھر کے مکینوں کے ذوق کا اظہار ہوتا تھا۔ گھر کی عورتیں اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔ پریت کور ان میں سمٹی بیٹھی تھی۔

عورتیں وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ کسی قسم کا مذاق وغیرہ نہیں کر رہی تھیں کیونکہ انہیں تمام واقعات کا علم ہو چکا تھا اور یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس وقت پریت کور کا شوہر چند نوجوانوں کے ساتھ اس خوفناک ویران مندر میں موجود تھا اور اب تک ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ سب کس حال میں ہیں۔

☆......☆......☆

ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں دھونی جمائے ایک سادھو آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اس کے سامنے نرگس

کے پھولوں کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا جس میں رکھے دو ناریل اور کالے بکرے کا کٹا ہوا سر رکھا تھا سر سے لگتا جیسے کسی نے تازہ تازہ اسے کسی بکرے کے دھڑ سے علیحدہ کیا ہو۔ سادھو وقفے وقفے سے اپنے سامنے رکھے مٹی رنگ کے ایک پاؤڈر کو چٹکی سے اٹھاتا اور اپنے سامنے جلنے والے الاؤ میں پھینک دیتا جس سے آگ ایکدم بھڑکتی اور پھر معمول پر آجاتی یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی پاؤڈر نہ بلکہ کوئی پیٹرول ہو ۔کونے کے بائیں جانب چٹائی پر ایک بچہ جس کے ہاتھ اور دونوں پاؤں کو مضبوطی کے ساتھ ایک بان کی رسی سے باندھ دیا گیا تھا لیٹا ہوا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں یہ زاہد جسے اس عفریت نے بھینٹ کی غرض سے اس خوفناک سادھو کے حوالے کردیا تھا۔

اس عفریت کے اس کام کے عوض اس سادھو نے اسے ویران مندر کے تہہ خانے میں رکھے ہوئے صندوق میں موجود کٹے ہوئے انسانی سروں میں سے دو سر تحفے میں دیئے تھے جسے وہ عفریت اس کے سامنے ہی کھڑے کھڑے چٹ کر گیا تھا اس طرح کے کٹے ہوئے سر اس کے مرغوب غذا تھے۔

سادھو اس سے جب بھی اپنی مرضی کا کام لیتا تو اس کام کو ٹھیک طرح سے سرانجام دینے پر وہ خوش ہوکر اس کو انسانی سر دیتا تھا۔ سادھو اپنے ایک جاپ کے لئے انسانی جسموں کا استعمال کررہا تھا جن کے دھڑ وہ ایک مخصوص جگہ دفنا دیتا تھا اور ان کے دھڑ سے الگ کئے ہوئے سر تہہ خانے کے اندر رکھے لوہے کے صندوق میں رکھ دیتا جو اس نے اس انسانی بھیڑیئے سے کام لے کر اسے معاوضے کے طور پر دینے ہوتے تھے۔

گزشتہ کچھ دنوں سے سادھو ایک خاص قسم کا جاپ "لونا چماری" کے نام کا کررہا تھا جس میں اسے منتر کے دوران ایک چھوٹے انسانی بچے کی بھینٹ دینے کے لئے کہا گیا تھا اور اس کام کے لئے اس نے اپنے ایک بیر کو یہ کام سونپا جو انسانی بھیڑیئے کے روپ میں اس کے سامنے تھا۔

سادھو نے اسے یہ ذمہ داری سونپی اور خود جاپ مکمل کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ ایک دوبار ناکامیوں کے بعد وہ عفریت اپنے مقصد میں کام ہوگیا اور ایک انسانی بچہ لاکر گزشتہ روز اس کے حوالے کردیا۔ اور اسی سلسلے میں وہ آج اس ویران مندر کے ایک ہال میں موجود تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھ رہا تھا اور پھر اچانک اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں لیکن بند آنکھوں کے باوجود وہ مٹی والا سفوف برابر اپنے سامنے رکھی آگ میں پھینکتا جارہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اسے سب دکھائی دے رہا ہو۔

ابھی اسے جاپ کرتے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اس کے سامنے والی دیوار میں درمیان سے پھٹی اور اس کے اندر سے ایک چھچھوندر کی شکل کا جانور اچھل کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اس کا انداز ایسے تھا جیسے کوئی کینگرو اپنی پچھلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو لیکن کے اس ہاتھ سرے سے ہی نہیں تھے بلکہ اس کی صرف دو ٹانگیں ہی تھیں اور اس کا پتلی تھوتھنی جیسا منہ کچھ زیادہ ہی لمبوترا تھا اس کے جسم پر بھورے رنگ کے بال تھے جو میل کچیل سے اٹے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ صدیوں سے کبھی نہایا تک نہ ہو غرض اس کو ایک نظر دیکھنے سے گھن آتی تھی۔

وہ سادھو کے سامنے کھڑا یوں جھول رہا تھا جیسے کسی بھی وقت زمین پر گر جائے گا۔ سادھو اس دوران اپنی آنکھیں کھول چکا تھا اور اس وقت اسے عجیب وغریب جانور کو ہی گھور رہا تھا جو نشہ پئے شخص کی طرح کھڑا ڈانواں ڈول ہورہا تھا۔

سادھو نے اپنے سامنے زمین پر رکھا ایک ترشول اٹھایا اور چلتا ہوا سیدھا اس عجیب الخلقت جانور کے پاس پہنچ کر ترشول اس کے پھولتے پچکتے پیٹ میں گھسیڑ دیا۔ ترشول اس کے پیٹ میں گھس گیا اور خون کا ایک فوارہ اس کے پیٹ سے ابل پڑا یہ دیکھ کر سادھو نے جلدی سے اس کے ابلتے خون کو ایک بڑے سے پیالے میں اکٹھا کیا اور لے جاکر اس چٹائی پر سوئے ہوئے بچے کے قریب لاکر رکھ دیا۔ وہ عجیب الخلقت جانور زمین پر ٹیڑھے میڑھے انداز میں گرا ہوا تھا زیادہ خون بہہ جانے سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی لیکن سادھو نے اس کی طرف

دھیان دینا بھی گوارہ نہ کیا اور دوبارہ اپنی پہلی والی جگہ پر آکر دوبارہ جاپ شروع کردیا۔

کچھ دیر تک کچھ پڑھنے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر دوبارہ اس بچے کے پاس گیا اور اس کے نزدیک رکھے خون کے پیالے میں اپنا ہاتھ ڈال کر خون سے تر کرتا اور اس بچے کی پیشانی پر ملنے لگتا اور پھر تھوڑی دیر میں اس بچے کا تمام جسم اس خون سے تربتر ہوگیا یہ دیکھ کر سادھو نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ پیالے میں ابھی بھی کچھ خون بچ گیا تھا لیکن اس کی رنگت سیاہی مائل ہونا شروع ہوگئی تھی اور پر ایک پتلی سے تہہ جمتی جارہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہوکر سادھو نے دوبارہ آگ کے قریب جاکر اسے بجھایا اور پھر بچے کو اپنے کندھے پر اٹھا کر اس ہال سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

دلجیت سنگھ اور اس کے ساتھی زمین پر بیہوشی کی کیفیت میں پڑے تھے۔ جب سے سادھو نے انہیں یہاں لاکر پٹخا تھا اس وقت سے وہ سب بیہوش ہی تھے۔ ان کی تعداد پانچ تھی۔ بہت دیر ہوگئی تھی یوں لگتا تھا جیسے سادھو انہیں وہاں پھینک کر بھول گیا ہو۔ جس جگہ انہیں پھینکا گیا تھا یہ وہ تہہ خانہ نہیں تھا جہاں یہ پہلی بار گئے تھے۔ بلکہ یہ اس ویران مندر کا کوئی دوسرا تہہ خانہ تھا جہاں اس وقت یہ سب اپنے انجام سے بے خبر بیہوشی کی کیفیت میں لیٹے تھے۔

کافی وقت گزر گیا اور پھر دلجیت سنگھ کو آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا۔ اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو قریب ہی اپنے دوسرے چار ساتھیوں کو بھی موجود پایا۔ اور پھر آہستہ آہستہ اسے پوری طرح ہوش آگیا اور اس کے لاشعور نے اسے تمام واقعات یاد دلا دیئے کہ کس طرح وہ ایک بچے کو ڈھونڈتے ہوئے اس ویران مندر میں داخل ہوئے تھے اور کس طرح ایک تہہ خانے سے نکلتے ہوئے وہ ایک سادھو سے ٹکرائے تھے جس نے اپنے ہاتھ میں اسی بچے کی گردن پکڑ رکھی تھی۔

یہ سوچتے ہی اس نے یکدم اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیونکہ اس کے ہاتھ اور دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ پوری طرح اٹھ نہیں سکا۔ اس کے دیگر ابھی تک بیہوش ہی پڑے ہوئے تھے وہ خود چونکہ ایک مضبوط اعصاب کا مالک تھا اس لئے اپنے ساتھیوں کی نسبت جلد ہوش میں آگیا۔ اس کی طرح اس کے دوسرے ساتھیوں کے بھی ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر اس نے سرگوشی کے انداز میں اپنے ساتھیوں کو آوازیں دینا شروع کردیں۔ پھر اس کی تھوڑی سے کوشش سے اس کے چاروں ساتھی بھی ہوش میں آگئے اور اندر کے ماحول کو دیکھ کر کانپنے لگے لیکن دلجیت کو دیکھ کر انہیں کچھ حوصلہ ہوا۔

دلجیت کچھ دیر تک سوچنے کے بعد اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہوا اور اسے کچھ سمجھا کر اپنی پیٹھ کو اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی طرف کردیا۔ دوسری طرف کے ساتھی نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ اس کی پیٹھ کے ساتھ ملا دیئے۔ اس طرح دونوں کے ہاتھ آپس میں ٹکرانے لگے اور پھر دلجیت کے سمجھانے پر اس کے ساتھی نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کی مدد سے دلجیت سنگھ کے بندھے ہاتھوں پر لگی گرہ کھولنے کی کوشش کی۔ گرہ بہت مضبوطی سے باندھی گئی تھی۔ تھوڑی سی کوشش سے دلجیت سنگھ کے بندھے ہاتھ آزاد ہوگئے اس نے جلدی سے رسیاں ایک طرف پھینک کر اپنے دیگر ساتھیوں کو بھی جلدی جلدی آزاد کرانا شروع کردیا۔

کچھ دیر میں وہ سب اس مصیبت سے پیچھا چھڑا چکے تھے اور اب لائحہ عمل سوچنے لگے۔ اس کارروائی میں کوئی بھی بندہ اس طرف نہیں آیا تھا غالباً کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہوا ہوگا کہ اس طرح بندھے ہونے کے باوجود وہ خود کو آزاد کروالیں گے۔ دلجیت اپنے ساتھیوں کو اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر تہہ خانے کی اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

وہ اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے بات کی بہت فکر تھی کہ وہ اس بچے کی ماں کو کیا جواب دے گا جس کا کٹا ہوا سر اب بھی اس کے خیالوں میں گھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنی دلہن پریت کور اور ان لوگوں کی بھی فکر تھی جنہیں وہ مندر کے باہر چھوڑ آیا تھا اور شاید وہ کب سے مندر کے باہر کھڑے ان

لوگوں کی واپسی کا انتظار کررہے ہوں گے۔ جس مقصد کے لئے وہ اس خوفناک مندر میں داخل ہوئے وہ مقصد اب فوت ہو چکا تھا اس لئے بے معنی اس ویران مندر میں گھومنے کی بجائے اس نے واپسی کا سوچا اور اسی سلسلے میں اب اسے مندر سے نکلنے کی فکر تھی۔

لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی کیونکہ جیسے ہی ان لوگوں نے تہہ خانے سے باہر قدم نکالا ایک بڑا سا سیاہ بلا خوفناک آواز نکالتا ایک توپ کے گولے کی مانند ان لوگوں سے ٹکرایا وہ سب شاید اس بات کے لئے ہرگز تیار نہ تھے اس لئے اس اچانک افتاد پر گھبرا کے پیچھے ہٹے۔

بلا ان سے ٹکرا کر زمین پر گرا اور پھر دوبارہ یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے وہ کوئی فٹبال ہو جو زمین سے ٹکرانے کے بعد دوبارہ ہوا میں اچھلتی ہے۔

بلا تیر کی طرح دوبارہ ان کی طرف بڑھا لیکن اس بار وہ سب سنبھل گئے تھے اور جیسے ہی بلا دلجیت سنگھ کے قریب پہنچا دلجیت نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن بلا ایک چھلاوے کی طرح اچھل کر دور ہٹ گیا۔

"تم لوگوں نے مندر میں آکر بہت بڑی غلطی کی ہے اور اب تم سب بچ نہیں پاؤ گے۔"۔۔۔۔ بلے کے منہ سے ایک انسانی آواز نکلی اور اسے اس طرح انسانی آواز میں بولتے دیکھ کر وہ سب یوں کھڑے رہ گئے جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما کر انہیں بت بنا دیا ہو۔ یہ کیفیت صرف کچھ لمحوں تک ہی رہی اور پھر جیسے دلجیت کو کسی نے زور سے ہلا دیا ہو۔

ہوش سنبھلتے ہی دلجیت سنگھ کو دوبارہ وہ بلا اپنی جانب بڑھتا نظر لیکن جیسے ہی وہ اس کے نزدیک پہنچتا دلجیت زمین پر پڑا اینٹ کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ میں اٹھا چکا تھا۔ جیسے ہی بلا اس کے نزدیک پہنچا اس نے گھما کر وہ اینٹ کا ٹکڑا اس بلے کو دے مارا۔ ٹکڑا ایک تیر کی طرح اڑتا ہوا اس بلے کی جانب گیا۔ اور سیدھا اس کی کنپٹی کو چھوتا ہوا سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا۔

نجانے وہ بلا تھا یا کوئی شیطانی روح کہ اس کے زمین پر گرنے سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بہت بڑا پتھر کسی جستی دیگ سے ٹکرایا ہو۔ اس سے اس شیطانی بلے کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔

بلا کوئی ڈھیٹ نسل کا تھا کہ زمین سے ٹکراتے ہی دوبارہ اوپر اٹھا اور ایک بار پھر سامنے آجانے والے ایک نوجوان کے سینے سے توپ کے گولے کی مانند ٹکرا گیا۔ نوجوان چیختا ہوا زمین پر گرا اس کے سینے سے چیخ کی آواز سنائی دی یوں لگا جیسے کسی نے کسی خشک لکڑی کو زور سے درمیان سے توڑ دیا ہو۔

دلجیت سنگھ کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ زمین پر گرنے والا بلا بہت جلد دوبارہ واپس آکر اتنا بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ لیکن جو بھی ہوا وہ ان کے لئے کوئی اچھا شگون نہ تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے دیگر ساتھیوں کو پیچھے کی طرف دھکیل کر بلے کے وار سے خود کو بچایا ورنہ اس بار وہ اس شیطانی بلے کا شکار بن جاتا۔

بلے کی پھرتی دیکھنے والی تھی وہ تیر کی اڑتا ہوا آیا اور اپنا وار نا کام بنتے دیکھ کر سیدھا تہہ خانے کی سیڑھیوں پر جا کر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے تہہ خانے میں گرتا چلا گیا۔ دور تک انہیں اس کے لڑھکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ وہاں رک کر اس کا انجام دیکھنے کی بجائے اپنے بچاؤ کے لئے بھاگے۔ وہ آگے پیچھے بھاگتے ہوئے راہداری کراس کرتے ہوئے ایک بڑے سے ہال میں داخل ہو گئے جس کے سامنے کے رخ ایک بڑا سا دروازہ تھا جو آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہ بھاگتے ہوئے سیدھے اس کی طرف بڑھے دروازے کے دوسری طرف ایک اور برآمدہ تھا جو اس وقت خالی تھا۔

کچھ لمحوں تک وہاں رک انہوں نے کوئی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن ہر طرف خاموشی تھی یہ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ قدموں سے آگے بڑھنے لگے وہ اس ویران مندر میں چونکہ پہلے کبھی نہیں آئے تھے اس لئے انہیں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ باہر جانے کا راستہ ان بھول بھلیوں سے ہو کر کہاں نکلتا ہے ہوش میں آنے کے بعد وہ اب تک اس ویران مندر میں ہی بھٹک رہے تھے۔ برآمدہ خالی پا کر انہوں نے اپنی رفتار ذرا تیز کر لی تھوڑے فاصلے پر انہیں ایک اور تہہ خانہ

دکھائی دیا جس کی سیڑھیوں میں قدرے روشنی دکھائی دی انہوں نے اپنی رفتار سست کی اور خاموشی سے وہاں سے گزرنے لگے۔

☆......☆......☆

ایک بڑی اور تیز دھار والی چھری ہاتھ میں تھامے سادھو اس وقت مندر کے تہہ خانے میں موجود تھا وہ انسانی بھیڑیا بھی اس وقت تہہ خانے میں موجود تھا سادھو نے اسے دیوار کے ساتھ نصب زنجیروں سے جکڑا ہوا تھا اس کے خوفناک دانت اس کے جبڑوں سے باہر جھانک رہے تھے جن کے کونوں سے لہو ٹپک رہا تھا یوں لگتا جیسے وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آیا ہو اس کا انداز بہت جارحانہ تھا یوں لگتا تھا کہ اگر اس کو زنجیروں سے آزاد کر دیا جائے تو وہ ایک لمحہ میں سب کو تہس نہس کر دے گا۔

تہہ خانے کے درمیان ایک لکڑی کا بنچ رکھا تھا جس پر سرخ رنگ کی ایک پلاسٹک کی شیٹ بچھی ہوئی تھی جس پر وہی معصوم بچہ بیہوشی کی کیفیت میں لیٹا ہوا تھا اس کے ماتھے پر خون کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی اس کے ہاتھ پاؤں آزاد تھے لیکن بے جان تھے۔

سادھو اپنا جاپ مکمل کر چکا تھا اور اس کے عوض بہت سی شکتیاں اسے شیطان نے دان کر دی تھیں۔ اپنے آقا شیطان کے حکم کے مطابق اس نے تقریباً پچیس کے قریب انسانوں کا گلا کاٹ کر ان کے دھڑوں کو اپنے مذموم شیطانی عمل میں استعمال کیا تھا۔ اس سارے عمل میں اس نے وہی کیا تھا جو اس جاپ کو مکمل کرنے میں مصروف تھا لیکن اس جاپ کا آخری عمل یہی تھا جو اس وقت وہ کرنے جا رہا تھا اس کے شیطان آقا کے مطابق اگر وہ یہ آخری عمل بھی کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کو ایک ایسی شکتی حاصل ہو جائے گی جس سے اس کی جوانی اور کھوئی ہوئی طاقت واپس آ جائے گی اور بہت سے بیر اس کے قبضے میں آ جائیں گے جن کی طاقت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ وہ اس کے ہر حکم کو چند سیکنڈوں میں کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

یہ بیر شیطان کے مطابق اس کے خاص بیر ہیں جو وہ صرف اپنے خاص چیلوں کے سپرد کرتا ہے وہ چیلے جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوں۔ اور اس کا ہر حکم بجالانے کی ہمت رکھتے ہوں۔ اپنے جاپ کی آخری تکمیل کے لئے اسے شیطان نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ ایک ایسے بچے کو اس کی بھینٹ چڑھائے جس کی عمر دس سال سے کم ہو اور اس کے اس حکم کے بعد ہی اس نے اس انسانی بھیڑیے کو جسے اس نے شلماک کا نام دے رکھا تھا ایسے بچے کی تلاش میں بھیجنا شروع کر دیا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی شیطان نے اس بات کا بھی سختی سے حکم دیا تھا کہ جس وقت بھی وہ ایسے بچے کی تلاش کرے تو اس بات کا دھیان ضرور رکھے کہ وہ پورے چاند کی رات ہو اور بہت عرصہ انتظار کرنے کے بعد ہی اسے اب اپنے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آ رہی تھی۔

چونکہ وہ جاپ کے مختلف حصوں کو کامیابی سے مکمل کر کے شیطان کا آشیرباد حاصل کر چکا تھا اور اس کے عوض اسے کچھ شکتیوں سے بھی نواز دیا گیا تھا لیکن جو شکتی اسے اس مذموم کام کو سرانجام دینے کے بعد ملنے والی تھی اس کا نشہ ہی کچھ اور تھا اور اب کہ منزل اسے کے سامنے تھی تو وہ اس موقعہ کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا اس لئے اسے اس کو مکمل کرنے کی جلدی تھی۔ شلماک زنجیروں سے بندھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

تہہ خانے میں رکھے لوہے کے صندوق میں جس قدر انسانی سر رکھے تھے وہ ایک ایک کر کے اس کے معدے میں اتر چکے تھے اور بہت دن گزر گئے تھے جب کہ اب تک اس کو غذا کے طور پر کوئی اور دوسرا انسانی سر نہیں ملا تھا اور اس بات کی اسے اس قدر لت لگ گئی تھی کہ اس سے رہا نہیں جا رہا تھا اور اب جبکہ اس نے اپنے آقا سادھو کو اس کی ضرورت کی مطابق ایک بچہ فراہم کر دیا تھا تو اسے اس بات کی بہت جلدی تھی کہ اس کا آقا اپنا کام سرانجام دینے کے بعد اس معصوم بچے کا سر اسے کھانے کے لئے دے لیکن سادھو اس کی اس بے چینی کی پرواہ کئے بغیر اپنے منہ میں بڑی عجیب و غریب زبان میں کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔

شلماک خونی نظروں سے اسی کی طرف دیکھ کر پھنکار رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اپنے

جسم کی زنجیریں توڑ کر دوڑتا ہوا جائے اور سامنے بنچ پر لیٹے اس معصوم بچے کو کچا چبا جائے۔ لیکن اسے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی ڈر تھا کہ اس کا آقا چاہے تو اس کی ذرا سی غلطی سے اسے جلا کر بھسم کرسکتا تھا وہ اس کی شکتیوں سے بخوبی واقف تھا اس لئے سوائے پیچ وتاب کھانے کے وہ بے بس تھا۔

تہہ خانے کے نزدیک پہنچ کر دلجیت سنگھ نے اپنے پیچھے آنے والے ساتھیوں کی طرف رکنے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے کان لگا کر نیچے تہہ خانے سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے اس انداز سے اس کے ساتھی بھی چونک کر تہہ خانے سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے اور پھر جلد ہی انہیں یوں لگا جیسے کوئی انسان کچھ نامانوس زبان میں کچھ پڑھنے میں مصروف ہو اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے پڑھنے کی بازگشت لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جارہی تھی وہ کیا پڑھ رہا تھا ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

کچھ دیر وہاں رک کر انہوں نے آپس میں کوئی بات چیت کی ابھی وہ اس بات کا تہیہ کرہی رہے تھے کہ آیا نیچے تہہ خانے میں جاکر دیکھا جائے کہ وہ کون شخص ہے اور اس وقت وہاں کیا کررہا ہے کہ نیچے سے ایک بچے کے چیخنے کی آواز سنائی دی یوں لگا جیسے کوئی بے درد انسان کسی معصوم بچے کے جسم کے اعضاء کو کسی کند چھری سے کاٹنے کی کوشش کررہا ہو۔

بچے کے چیخنے کی آواز سنتے ہی وہ یکدم واپس پلٹے کیونکہ انہوں نے آپس میں مشورہ کرتے ہوئے یہی فیصلہ کیا تھا کہ انہیں تہہ خانے میں جاکر دیکھنے کی بجائے یہاں سے باہر نکلنے کی بارے میں سوچنا چاہئے کیونکہ وہ اپنی جانوں کو کسی اور مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔

لیکن پھر اچانک تہہ خانے سے آتی کسی معصوم بچے کی دردناک چیخ نے ان کے قدم روک لئے اور انہوں نے رک کر ایکدوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے نیچے تہہ خانے میں جانے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن اس کے پر عمل کرنے سے پہلے انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کوئی ایسی چیز ساتھ لے جانے کے لئے اس کی تلاش کرنا چاہی جسے وہ اپنے بچاؤ کے لئے استعمال کرسکیں۔ اور جلد ہی انہیں قریب ہی ایک لوہے کی تقریباً دوانچ موٹی سلاخ کونے میں پڑی دکھائی دی۔

سلاخ کا ایک سرا چھینی کی مانند چپٹا تھا جیسے اس سے کوئی مٹی وغیرہ کھودنے کے لئے کام میں لاتے ہوں اس وقت انہیں یہی غنیمت لگا اور دلجیت سنگھ نے اسے جلدی سے اپنے ہاتھ میں اٹھالیا اور پھر ایک دوسرے کے پیچھے چلتے ہوئے نیچے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر قدم رکھ دیئے۔

تقریباً سات آٹھ سیڑھیاں اترنے کے بعد ان کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ ان کے ہوش اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ ان کے سامنے ایک بچہ جس کا ایک بازو ایک ایسے انسان کے ہاتھ میں تھا جس کی پیٹھ ان کی طرف تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والی چھری تھی جس سے تازہ تازہ لہو ٹپک رہا تھا۔

سامنے بنچ پر لیٹا ہوا ایک بچہ تڑپ رہا تھا اور اس کے منہ سے تکلیف کی شدت سے چیخیں نکل رہی تھیں جو تہہ خانے کے اندر گونج رہی تھیں۔ اس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر انہوں نے واپس بھاگنے میں ہی عافیت سمجھی لیکن پھر اس کو بزدلی سمجھتے ہوئے اپنا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے دلجیت انہیں وہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ہوا تیزی سے آخری سیڑھی اترتا ہوا تیر کی طرح گیا اور سامنے کھڑے شخص کی پیٹھ میں اپنی پوری طاقت سے ہاتھ میں پکڑی لوہے کی سلاخ گھسیڑ دی۔

سادھو جو بے خیالی میں کھڑا بچے کے دوسرے بازو پر چھری سے وار کرنے ہی والا تھا کہ ایک دم جھٹکا کھا کر زمین پر گرا اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس ویران مندر میں کوئی یوں اچانک آکر اس کی پیٹھ میں کوئی چیز گھسیڑ دے گا لیکن اب ایسا ہو چکا تھا۔ اور وہ زمین پر گرا تڑپ رہا تھا۔

اور زمین پر گرتے ہی دلجیت نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور پے درپے وار کرکے اس کا قصہ تمام کردیا۔

اس ساری کارروائی میں تہہ خانے میں بندھا انسانی بھیڑیا برابر شور مچاتا رہا وہ شاید اسے تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتے دیکھ چکا تھا لیکن سادھو جو پہلے ہی اس کے شور مچانے

کو نظر انداز کر چکا تھا اس لئے وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اتنا شور کیوں کر رہا ہے۔ شاید وہ انسانی بھیڑیا سادھو کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اس وقت تہہ خانے میں ان کے علاوہ کوئی اور بھی آچکا ہے لیکن سادھو اپنی طاقت کے نشے میں پاگل ہو چکا تھا اور یہی پاگل پن اس کی موت کی وجہ بن گیا۔

سادھو کے مرتے ہی دلجیت کے دیگر ساتھی بھی جلدی سے سیڑھیاں اترتے نیچے پہنچ گئے۔ سادھو کو دوبارہ چھری لہراتے دیکھ کر بچہ خوف سے بیہوش ہو چکا تھا لیکن اس کے کٹے ہوئے بازو سے ابھی بھی خون رس رہا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور نیچے زمین پر خون یوں پھیلا ہوا تھا جیسے کسی نے وہاں ابھی تازہ تازہ کوئی بکرا کاٹا ہو۔

خوفناک اور ویران مندر کے تہہ خانے میں ایک انسان کے خون کا تالاب بہت ڈراؤنا منظر پیش کر رہا تھا جو اچھے اچھوں کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ لیکن اس ویران مندر میں داخل ہونے اور مختلف قسم کے عجیب وغریب واقعات سے نبرد آزما ہونے کی وجہ سے اس وقت وہ لوگ بے خوف ہو گئے تھے۔ انہوں نے بچے کی سانسیں چیک کیں تو وہ چل رہی تھیں اور اس کی حالت سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی بھی لمحے موت کو گلے لگا لے گا۔

لیکن اس کے باوجود انہوں نے جلدی سے اسے اٹھا کر تہہ خانے سے باہر لا کر لٹایا اور پھر ایک کمرے میں جا کر ایک کھڑکی پر لگے پردے کو کھینچ کر اتارا اور جلدی سے اسے اس بچے کے کٹے ہوئے بازو والے حصے پر اچھی طرح لپیٹ دیا۔ ان کے تہہ خانے سے نکلنے تک وہ انسانی بھیڑیا چیختا چلاتا رہا لیکن انہوں نے اسے ختم کرنے کی بجائے اس بچے کو بچانے کو زیادہ ترجیح دی اس لئے انہوں نے اس انسانی بھیڑیے کو اسی کے حال پر چھوڑا اور اس بچے کو لے کر تہہ خانے سے نکل آئے تھے۔

بچے کو ایک نوجوان نے اپنے کندھے پر اٹھایا ہوا تھا اور پھر وہ جلدی سے کمرے سے نکل کر باہر جانے کا راستہ ڈھونڈنے لگے۔ دو تین کمروں اور برآمدوں سے ہو کر انہیں وہی دالان دکھائی دیا جہاں وہ پہلی بار مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر آئے تھے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے سکھ کا سانس لیا اور تیزی سے بھاگتے ہوئے باہر نکل آئے اس وقت شام کے سائے پھیل چکے تھے۔ مندر میں وہ جس قسم کے حالات سے دوچار رہے ان حالات نے انہیں اس بات تک سے عاری کر دیا تھا کہ انہیں یہ پتہ نہیں چلا کہ وہ دن کے کونسے حصے میں اس وقت موجود ہیں اور اس بات کا اندازہ انہیں مندر سے باہر نکلنے کے بعد ہی ہوا کہ چاروں طرف اندھیرا پھیلنے لگا تھا انہوں نے مندر سے باہر نکلتے ہی سب سے پہلے بچے کو زمین پر لٹا کر دوبارہ اس کی سانسیں چیک کیں تو یہ دیکھ کر انہیں تشویش ہونے لگی کہ اس کی سانسیں پہلے سے بھی کہیں زیادہ کم ہونے لگ گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر ان پر مایوسی طاری ہو گئی اور وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگے کیونکہ انہیں نہیں لگ رہا تھا کہ وہ رات کے اس اندھیرے میں کس طرح اس معصوم بچے کو کسی حکیم وغیرہ کے پاس لے جا کر اس کا علاج کروا سکیں گے۔ ابھی وہ لوگ بے بسی سے کھڑے یہی سوچ رہے تھے کہ بچے نے زور زور سے جھٹکے لینے شروع کر دیئے اور پھر دو تین منٹ اسی کیفیت رہنے کے بعد ایک زوردار جھٹکے سے اس کا جسم زمین سے تھوڑا اوپر اٹھا اور پھر ایک جھٹکے سے دوبارہ زمین پر گرتے ہی اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

دلجیت سنگھ اور اس کے ساتھی اس کی اس دردناک موت کو اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ چباتے رہے۔ لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس معصوم بچے نے موت کو گلے لگا لیا۔ انہوں نے رات کا اندھیرا پھیلنے کی وجہ سے بچے کو وہیں دفن کرنے کی بجائے اپنے ساتھ ہی لے جانے میں بہتری سمجھی اور بجھے دل کے ساتھ اسے ایک نوجوان نے دوبارہ اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور اندازے سے ایک طرف چلنے لگے۔

آہستہ آہستہ اس خوفناک اور منحوس مندر کی عمارت ان سے دور ہوتی گئی اور وہ کافی دیر تک چلتے رہے اس دوران انہوں نے تھوڑا سا جنگل کے اندر سے بھی فاصلہ طے کیا اور یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس دوران ان کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا اور نہ راستے میں کوئی جنگلی جانور نظر

آیا جس سے انہیں کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو۔ نجانے وہ کتنی دیر تک یونہی پیدل چلتے رہے اور پھر کافی دیر تک پیدل چلنے کے بعد صبح کا سپیدہ نمودار ہوا تو ہر چیز واضح ہوگئی۔

جنگل بہت پیچھے رہ گیا تھا اور دور بہت دور ایک راستہ جاتا دکھائی دیا اور غور سے دیکھنے پر ان کے چہروں پر اطمینان پھیل گیا کہ یہ وہی راستہ تھا جس پر وہ پریت کور کے گاؤں سے واپس لوٹتے ہوئے سفر کرتے آئے تھے اور اس ویران مندر کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے تھے۔

پھر ایک جگہ جھاڑیوں کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے آہستہ سے اس بچے کی لاش کو زمین پر رکھا اور اپنے ہاتھوں سے ہی ایک گڑھا کھودنے کی کوشش کرنے لگے زمین نرم ہونے کی وجہ سے انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی پھر بچے کی لاش کو اسی کپڑے میں لپیٹ کر اس گڑھے میں لٹا دیا اور پھر اوپر سے مٹی ڈال دی۔ گڑھا زیادہ گہرا نہ کھودنے کی وجہ سے انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے دوبارہ سفر شروع کردیا۔

تقریباً ڈیڑھ میل تک چلنے کے بعد اب انہیں دور آبادی کے آثار نظر آنے لگے یہ دیکھ کر انہوں نے اپنی رفتار تیز کردی اور کچھ ہی دیر میں وہ وہاں پہنچ گئے جہاں بہت سے مکان بنے ہوئے تھے ایک راہگیر سے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ فتح پور گاؤں ہے۔ اسی راہگیر سے رام گڑھ گاؤں جانے کے لئے سیدھا راستہ معلوم کرنے کے بعد وہ اسی طرف روانہ ہوگئے۔

مندر سے نکلنے کے بعد انہیں اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ باراتیوں نے ان کا انتظار کرنے کے بعد وہاں سے پڑاؤ اٹھالیا ہوگا اور سیدھے گاؤں ہی گئے ہوں گے۔ اس لئے انہیں ان کی طرف سے کوئی فکر نہیں تھی۔

مسلسل پیدل چلنے اور رات بھر آرام نہ کرنے کی وجہ سے اب ان پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے گھروں کو پہنچنے اور دلجیت سنگھ کو اپنی دلہن پریت کور سے ملنے کی خوشی تھی۔ جو نجانے اس وقت کس حال میں ہوگی۔ اپنے ایک ساتھی کی موت کا بھی انہیں بے انتہا افسوس تھا جو اس کالے بلے کا شکار ہوگیا تھا۔

تقریباً دو میل تک پیدل چلنے کے بعد آخر کار اپنے گاؤں کی سرحد پر پہنچ گئے۔ دن نکل آیا تھا اور گاؤں کے لوگوں کی آمدورفت شروع ہوگئی تھی جیسے ہی انہوں نے گاؤں میں قدم رکھا وہاں کھیلتے بچوں نے انہیں دیکھتے ہی شور مچانا شروع کردیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں لوگ اکٹھے ہوگئے اور اڑتے اڑتے یہ خبر کہ دلجیت اور اس کے ساتھی گاؤں پہنچ گئے ہیں یہ سن کر دلجیت سنگھ کے گھر والے بھی دوڑتے گھروں سے نکلے اور راستے میں انہیں گھیر لیا۔ وہ لوگ ایک ہجوم میں اپنے اپنے گھروں میں پہنچ گئے۔ گھر والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پریت کور خوشی دیکھنے والی تھی وہ دلجیت سنگھ کی خیریت کے لئے رات دن دعائیں مانگ رہی تھی اور آج اس کی دعائیں اثر لے آئی تھیں اور اس کا دلجیت آج زندہ سلامت اس کے سامنے موجود تھا۔

تھکان اتارنے کے بعد شام کے وقت دلجیت سنگھ کی حویلی میں گاؤں کے لوگوں کو ان لوگوں کے زندہ سلامت واپس آجانے کی وجہ سے ایک شاندار دعوت پر مدعو کیا گیا تھا جس میں تقریباً گاؤں کے تمام افراد شامل تھے۔ پرتکلف دعوت کے بعد دلجیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے انہیں ویران مندر میں پہنچنے اور اس بچے کی دردناک موت کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو ہر شخص خوف سے کانپنے لگا۔

بچے کی ماں اپنے بچے کی دردناک موت کا سن کر برداشت نہ کرسکی اور بیہوش ہوگئی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اور بچے کی موت کا سن کر وہاں موجود شخص اشکبار تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان لوگوں کے زندہ سلامت بچ کر آجانے پر کسی قدر خوش بھی تھے اور برملا ان کی بہادری کی تعریف بھی کررہے تھے۔

دلجیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے گاؤں کے افراد کو اس انسانی بھیڑیے کے متعلق اس لئے نہیں بتایا کہ کہیں وہ لوگ خوفزدہ ہوکر اپنے کھیتوں میں جانا نہ چھوڑ دیں لیکن ان سب کو سختی سے یہ تاکید ضرور کردی تھی کہ بھول کر بھی کبھی کوئی اس ویران مندر کی طرف جانے کی کوشش نہ کریں۔